علمائے کرام کی خوبیوں کے تذکرے مجھے بہت سی فقہ سے مرغوب ہیں۔
(امام اعظم ابو حنیفہ)
اسلامی تاریخ
کے دلچسپ اور ایمان افروز واقعات
ابو مسعود عبد الجبار
الهادی

اسلامی تاریخ کے دلچسپ اور ایمان افروز واقعات

ابو مسعود عبد الجبار

الهادی
للنشر والتوزیع
۳۸۔ غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور

نام کتاب	———	اسلامی تاریخ کے دلچسپ اور ایمان آفریں واقعات
تالیف و تصنیف	———	ابو مسعود عبدالجبار، ایم اے، ایم او ایل
باہتمام	———	حافظ محمد شفیق
سال اشاعت	———	2009ء
ناشر	———	الهادی للنشر والتوزیع

۳۸۔ غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور
Ph: 0423-7361473
Mob: 0345-7492334, 0300-6609226

فہرست

......☆......

عرض مؤلف

الحمد لله رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی افضل الانبیاء والمرسلین وَعَلیٰ آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اجمعین وَعلیٰ من تبعهم باحسان الی یوم الدین امّا بعد :

اللہ تعالیٰ شیخ الاسلام والمسلمین امام ابن تیمیہ پر کروڑوں رحمتیں برسائے، انہوں نے کیا خوب فرمایا کہ:

''حضرت رسول مقبول ﷺ کی اُمت محمدیہ ہر طرح کے فضائل وکمالات میں تمام اُمتوں سے افضل ہے کیونکہ جب اس کے علم وفضل کا مقابلہ دیگر اُمتوں کے علم وفضل سے کیا جائے گا تو اس کے علم وفضل کی برتری آفتاب نصف النہار کی طرح روشن نظر آئے گی اور جب اس کی عبادت و ریاضت اور دین داری کا موازنہ دیگر اُمتوں کی عبادت و ریاضت اور دین داری سے کیا جائے گا تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح صاف نظر آئے گی کہ اُمت محمدیہ دیگر تمام اُمتوں سے زیادہ عبادت گذار اور دین دار ہے اور جب اس کی شجاعت و بسالت اور اللہ کی خاطر جہاد کرنے اور اس کی راہ میں تکالیف برداشت کرنے کا موازنہ دیگر اُمتوں سے کیا جائے گا تو پتا چل جائے گا کہ اُمت محمدیہ سب اُمتوں سے زیادہ شجاع

اور بہادر ہے، اور جب اس کی جود وسخا اور قلبی طہارت کا مقابلہ دوسری اُمتوں سے کیا جائے گا تو اُمت محمدیہ کی نسبت زیادہ فیاض اور کریم النفس نظر آئے گی۔"

(الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح)

یہ محض دعویٰ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ آج تک کسی اُمت میں سیّدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ جیسا شجاع القلب، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسا عادل، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ جیسا نرم خو، سیدنا علی رضی اللہ عنہ جیسا قوی اور امین اور حضرت معاویہ جیسا ہر دلعزیز اور حلیم حکمران پیدا نہیں ہوا، اور نہ ہی کسی ملت میں حضرت عمر بن عبدالعزیز اُموی جیسا زاہد اور سیدنا علی بن حسین ہاشمی جیسا عابد پیدا ہوا۔

بھلا کوئی اُمت خالد بن ولید اور براء بن مالک انصاری جیسے جانباز اور قتیبہ بن مسلم باہلی، محمد بن قاسم ثقفی اور طارق بن زیاد جیسے فاتحین اور عبدالرحمٰن الداخل اور صلاح الدین ایوبی جیسے شاہین دکھا سکتی ہے؟

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ کسی مذہب کے ماننے والوں میں ولید بن عبدالملک اور عبدالرحمٰن الناصر جیسے رحم دل کشور کشا اور بایزید ایلدرم عثمانی، یوسف بن تاشفین اور عبدالمومن مغربی جیسے جری حکمران پیدا نہیں ہوئے اور پھر کسی ملت کو ابن خلدون اور طبری جیسے مؤرخین۔ابن العربی، ابن کثیر جیسے مفسرین اور امام اسحاق بن ابراہیم و امام بخاری جیسے محدثین اور امام جعفر بن محمد ہاشمی، امام ابوحنیفہ، امام شافعی جیسے فقہا اور امام مالک و احمد بن حنبل جیسے خود دار علماء دکھانے کی ہمت نہیں ہوسکی۔لیکن اس اُمت پر ظلم یہ ہوا کہ متعصب مؤرخین نے آتش حسد میں جل بھن کر اس کی قابل فخر ہستیوں پر بے سروپا بہتانات لگائے اور ستاروں سے بڑھ کر ان کے روشن کارناموں اور پہاڑوں جیسی نیکیوں کو اپنی نسلی عداوت اور اندھی عصبیت کی بھینٹ چڑھا دیا۔

حَسَدُوْهُمْ اِذَا لَمْ يَنَالُوْا سَعْيَهُمْ
فَالْقَوْمُ اَعْدَاءٌ لَهُمْ وَ خُصُوْمُ(۱)

ان کی اندھی عصبیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی نئی نسل اپنے بے مثال اسلاف کرام سے بدظن ہوگئی اور ان کی روشن تاریخ کو اپنے ہی منہ سے سیاہ قرار دینے لگی۔

خاک بدہن دشمنان اگر ان کے بہتانات میں ذرّہ برابر بھی صداقت ہوتی تو مسلمانوں کو جزیرۃ العرب میں ہی دفن ہو جانا تھا اور انہیں براعظم ایشیا، افریقہ، یورپ کے کثیر حصے پر اسلام کا پھریرا لہرانے اور وہاں صدیوں تک عدل و انصاف کے جھنڈے گاڑنے کی کب توفیق ملنی تھی! آخر ان میں کوئی تو خوبیاں تھیں جو اللہ کو پسند آ گئی تھیں اور اس نے ان کو دنیا کی قیادت کا منصب عطا فرما دیا تھا۔

چنانچہ ہم نے اپنی اس کتاب میں اسلاف کرام کی شجاعت و بسالت، رأفت و رحمت، فہم و فراست، جود وسخا، بدل و عطا، عفو و حلم، حق گوئی و بیباکی، ہمدردی و غمگساری کے بے نظیر واقعات کو ایسے دل کش ادبی اسلوب میں بیان کیا ہے کہ آپ انہیں اطمینان سے پڑھے بغیر سونا پسند نہ کریں گے اور مان لیں گے کہ ان کے اندر یہی وہ خوبیاں موجود تھیں جنہیں سن کر قیصر روم اور اس کا فوجی دربار جھوم اُٹھا تھا اور مان گیا تھا کہ یقیناً ان کی فتوحات کا سبب ان کی یہی خوبیاں ہیں۔

وَمَلِيْحَةٌ مَا شَهِدَتْ لَهَا ضَرَّاتُهَا
وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ(۲)

(۱)......ترجمہ: "جب وہ اپنے کردار و عمل سے ان کے مرتبہ و مقام کو نہ پہنچ سکے تو حسد سے جلنے لگے، چنانچہ لوگ ان کے دشمن بن گئے اور ان کی کردار کشی کرنے لگے۔"

(۲)......ترجمہ: "حسینہ وشکیلہ تو وہ ہوتی ہے جس کی خوبصورتی کا اعتراف کیے بغیر سوکنیں بھی نہ رہ سکیں اور خوبی تو وہ ہوتی ہے جس کا دشمنوں کو بھی اعتراف ہو۔"

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے سینوں کو اسلاف کرام کے متعلق پھیلائی گئی بدگمانیوں سے پاک کر دے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

آخر میں، میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے شکر کے بعد مولانا خوشی محمد آف کلھر کلاں منڈی احمد آباد، مولانا ابویحییٰ محمد زکریا زاہد اور محمد صدیق ثاقب کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب پر نظر ثانی فرمائی اور ادبی تسامحات کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی۔ برادرم سجاد احمد، عبدالقدوس، عبدالرؤف صاحبان کا بھی کہ انہوں نے اس کتاب کی آرائش کے لیے مفید مشورے دیے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کی محنت قبول فرمائے اور ہمیں اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین

ابومسعود عبدالجبار

ایم اے۔ ایم او ایل

ڈاہر ضلع اوکاڑا

۱۹۔۵۔۰۶

تصدیر[1]

ہم کون ہیں؟

ہمارے متعلق ملک شام اور اس کے باغات سے پوچھو......عراق اور اس کے نخلستانوں سے پوچھو، مصر اور اس کی وادیوں سے پوچھو، الجزائر اور اس کے جنگلات سے پوچھو......افریقہ کے ریگستانوں اور ایران کے سبزہ زاروں سے پوچھو......

پوچھو روس کی برفانی چوٹیوں سے......پوچھو فرانس کے دریاؤں سے......پوچھو یوگوسلاویہ اور رومانیہ کے پانیوں سے......بلکہ ربع مسکون کے ہر ٹکڑے سے پوچھو......! آسمان کے نیچے بسنے والی ہر مخلوق سے پوچھو......

ان سب کے پاس ہماری شجاعت و بسالت، ایثار و قربانی، علوم وفنون اور عدالت و شرافت کی خبریں ہیں۔

ہم مسلمان ہیں!

ہمارے سوا اور کون تھا جس نے شرافت کے باغوں کو اپنے خون سے سینچا ہو۔ بتاؤ ہمارے علاوہ کس نے شجاعت و بسالت کے گلستان کو مزین کیا ہے۔ بھلا دنیا نے ہم سے زیادہ کوئی شریف، نبیل، مہربان اور شفیق، اعلیٰ اور افضل کہیں دیکھا ہے؟ ہم نے جہالت کے اندھیروں میں ہدایت کی شمع روشن کر کے لوگوں کو بتایا کہ راہ ہدایت یہ ہے......

ہم مسلمان ہیں!

ہم نے اس دور میں عدل کیا جب دنیا ظلم وستم سے بھری ہوئی تھی! ہم نے اُس دور میں علم پھیلایا جب دُنیا جہالت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہم نے اُس دور میں لوگوں کو مساوات کا درس دیا جب لوگ شاہوں کو پوجتے تھے۔ ہم نے ایمان سے دلوں کو، علم سے عقلوں کو اور آزادی سے غلاموں کو معمور کر دیا......

ہم مسلمان ہیں!

ہم نے کوفہ، بصرہ اور بغداد بنایا۔ ہم نے سپین اور شام، عراق اور مصر کو تہذیب سکھائی۔ ہم نے نظامیہ، قرطبہ اور ازہر جیسی یونیورسٹیاں بنائیں۔ ہم نے جامع اموی اور صخرہ جیسی عبادت گاہیں، سامراء، زہراء اور حمراء جیسے محلات بنائے۔ ہم نے اہل دنیا کو تعلیم دی۔ ہم استاذ ہوئے اور باقی تمام قومیں شاگرد......

ہم مسلمان ہیں!

ہم میں ابوبکرؓ اور عمر فاروقؓ، نور الدینؒ اور صلاح الدینؒ، عمر بن عبدالعزیزؒ اور اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسے حکمران پیدا ہوئے۔ ہم میں خالدؓ اور طارقؒ، قتیبہؒ بن مسلم اور محمد بن قاسمؒ، ظاہر بیبرسؒ اور الپ ارسلانؒ جیسے جرنیل پیدا ہوئے۔ ہم میں امام بخاریؒ اور طبریؒ، ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ، ابن حزمؒ اور ابن خلدونؒ جیسے عالم پیدا ہوئے۔ ہم میں امام غزالیؒ اور ابن رشد، ابن سینا اور رازیؒ جیسے فلسفی پیدا ہوئے۔ ہم میں ابوتمام اور متنبّی، جریر اور فرزدق، ابوعتاہیہ اور معینی جیسے شاعر پیدا ہوئے۔ ہم میں معبد اور اسحاق، زریاب اور مالک جیسے خوش گلو پیدا ہوئے۔

ہمارے اکثر حکمران خلافت انسانیت کی اعلیٰ مثال تھے

ہمارے تمام قائدین اور سپہ سالار، اللہ کی تلوار تھے

ہم میں ہزاروں نہیں، لاکھوں نابغۂ روزگار ہستیاں پیدا ہوئیں......

ہم مسلمان ہیں!

ہماری قوت، ایمان سے ہے۔ ہماری عزت، دین سے ہے۔ ہمارا توکل ،رب پر ہے۔ ہمارا قانون، قرآن ہے۔ ہمارے امام سید الانبیا ﷺ ہیں۔

ہمارا امیر المومنین ہمارا خادم ہے۔ ہمارا کمزور حق دار طاقتور ہے اور ہمارا طاقتور غریبوں کا معاون ہے۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں اور اسلام کی رو سے سب برابر ہیں۔

ہم مسلمان ہیں!

ہم حکمران بنے تو عدل کیا، فاتح بنے تو ملک بسائے، ہم طاقتور انصاف پسند تھے۔ ہم نے جنگ میں شفقت و مہربانی کے قانون بنائے اور امن میں عدل اپنایا۔ ہم بہترین حکمران تھے اور فاتحین کے سردار ہماری تہذیب سراپا رحمت تھی، وہ بدن اور روح کی پاکیزگی تھی، فضیلت اور کرامت تھی، اس سے لوگوں کو نفع ملا، اہل زمین کو سایہ ملا، ہم نے اسے خون پلایا اور شہداء کی قربانیوں پر اس کی بنیاد رکھی۔ بتاؤ زمین کا کون سا خطہ ہے جہاں اسلام اور سلامتی، ایمان اور امن کی خاطر ہمارے شہداء دفن نہ ہوں......

ہم مسلمان ہیں!

بھلا ہمارے سوا کہیں انسانیت کی اعلیٰ مثال قائم ہوئی؟ بھلا ہمارے علاوہ کوئی معاشرہ عمدہ اخلاق اور ایثار پر قائم ہوا؟ بھلا صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام کے بعد کسی خطہ ارضی میں فلاسفروں اور ریفارمروں کے خواب ہائے امن و امان شرمندہ تعبیر ہوئے؟

آہ! وہ دن کتنا ایثار آفرین تھا...... جس دن خاک وخون میں تڑپتا ہوا ایک زخمی مسلمان پانی کی خواہش رکھتا تھا، جب پانی اس کے منہ کے قریب لایا گیا تو اسے دوسرے زخمی مسلمان کے کراہنے اور پانی طلب کرنے کی آواز سنائی دی، تو اس نے بغیر گھونٹ بھرے پیالہ اپنے بھائی کی طرف بھیج دیا اور خود پیاسا شہید ہوا۔[2]

آہ...... جب ایک مسلمان عورت کا باپ، بیٹا اور خاوند جنگ احد میں شہید ہوئے تو اس نے جگر پاش پاش کر دینے والی خبر پر صبر کر کے رسول اللہ ﷺ کی خیریت دریافت کی اور جب آپ ﷺ کی سلامتی کی خبر ملی تو کہنے لگی، اب ساری مصیبتیں آسان ہو گئیں۔[3]

آہ...... جس دن بائیس لاکھ مربع میل کا حکمران فاروق اعظمؓ خطبہ میں اپنا کوئی، آرڈیننس نافذ کر رہا تھا تو ایک عورت نے کلمہ حق کہہ کر اسے واپس لینے کو کہا...... تو اُس نے اپنی غلطی تسلیم کر کے آرڈیننس واپس لے لیا۔

ہم مسلمان ہیں!

جب ہم میں سے ہر ایک، دوسرے کو اپنے پر ترجیح دیتا تھا اور جب ہم بدن اور روح، مادی اور معنوی طور پر پاکیزہ تھے۔ جب ہم صرف اللہ کے لیے چلتے تھے، رکتے تھے، کھڑے ہوتے تھے، بیٹھتے تھے، جاتے تھے، آتے تھے۔ جب ہم نے اپنی خواہشات پامال کیں اور اپنے آپ کو قرآن کے تابع کیا تو ہم انسانیت کا جوہر بنے۔ اور ہم نے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کیا جسے دانا اور صالحین ناممکن خیال کرتے تھے......

ہم مسلمان ہیں!

ہمارے کارناموں پر شاہ نامے تصنیف ہوئے لیکن ہماری رفعتیں شمار نہ ہو

سکیں۔ بھلا کسی میں ہمت ہے کہ ان معرکوں کو لکھے جن میں ہم گھس گئے؟ کون ہے جو علوم و فنون کے سلسلے میں ہماری خدمات کا احاطہ کرے؟ بھلا کوئی ایسا حساب دان ہے جو ہمارے شیروں اور دلیروں کا شمار کر سکے؟

ہاں وہی ہے جو آسمان کے تارے گن لے اور صحراؤں کی کنکریاں شمار کر سکے

ہم مسلمان ہیں!

ہم وہ نہیں جو زبان کی بنا پر قومیت کے قائل ہوں۔ ہم وہ بھی نہیں جو نسل کی بنا پر قومیت کی بنیاد استوار کریں۔ ہر قوم میں اچھے اور برے، عادل اور ظالم موجود ہوتے ہیں جبکہ ہم مسلمان تو سراپا خیر ہیں۔ ہمارا رکن ہر وہ انسان ہے جو متقی و پرہیز گار ہو۔ خواہ کوئی ہو، کہیں رہتا ہو، کوئی زبان بولتا ہو، کسی بھی رنگ کا ہو

ہم مسلمان ہیں!

ہم تقوی کی سلک میں پروئے ہوئے ہیں، اگرچہ خون جدا جدا ہے۔ ہم عقیدہ کی وجہ سے اکٹھے ہیں اگرچہ زبان جدا جدا ہے۔ ہم کعبہ کی وجہ سے ہم قبلہ ہونے پر ایک ہیں اگرچہ ملک جدا جدا ہیں۔

کیا ہم ہر روز پانچ مرتبہ کعبہ کی طرف منہ نہیں کرتے؟ کیا ہم ہر سال عرفات میں اکٹھے نہیں ہوتے؟ کیا یہ اس بات کی علامت نہیں کہ اسلام ایک جامع قومیت ہے۔ اس کا مرکز حجاز ہے۔ اللہ کا رسول ﷺ ہمارا امام ہے اور قرآن ہماری کتاب ہے......

ہم مسلمان ہیں!

ہمارے دین کے اصول سنہری ہیں، وہ خالص، حق اور سچ ہے۔ اس میں کوئی طریقت، حقیقت، تصوف، حجاب اور سلوک نہیں۔ ہمارا دین قرآن و

حدیث میں چمک رہا ہے۔ بتاؤ اس دنیا میں کوئی مذہب ہے جو اپنے اصولوں کو روزانہ دس مرتبہ دہراتا ہو؟ جس طرح ہمارے اصولوں کو ہمارے موذن روزانہ دہراتے ہیں۔ أشهد أن لا إله إلا الله ،وأشهد أن محمد رسول الله.

ہم مسلمان ہیں!

ہم کمزور اور ذلیل نہیں، ہمارے ساتھ اللہ ہے۔ہم ہر روز دل آویز ترانہ (اذان) پانچ مرتبہ سنتے ہیں۔ شجاعت ہماری خصوصیت ہے، ایثار کا خون ہماری رگوں میں ہے۔حوادثات دنیا اسے بدل نہیں سکتے اور ہمارے دلوں سے محو نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے، ہمارے پاس ایسا جزیرہ ہے جس کی ریت میں طاغوت جل بھن جائیں...... لیکن ہمارے مسلمان اس جہنم نما علاقے کو جنت سمجھ کر آباد کئے ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس عراق ہے، فرات ہے ہمارے پاس مصر ہے جو دارالعلوم اور دارالاسلام ہے۔ ہمارے پاس مراکش ہے جو شجاعتوں اور بسالتوں کا گہوارہ ہے۔ ہمارے پاس استنبول ہے جو یورپ کا دل ہے۔ ہمارے پاس سب سے زیادہ مملکتیں ہیں۔

وہ زمین ہماری ہی ہے جہاں قرآن پڑھا جاتا ہے اور مناروں سے اذان آتی ہے کہ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ کاش کہ ہم صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں تو فتح وکامرانی اور جہاں بانی ہمارا مقدر بن جائے......

ہم مسلمان ہیں!

---

[1] مستفاد از قصص من التاریخ للطنطاوی

[2] جنگ یرموک کے شہدائے کرام کی طرف اشارہ ہے۔

[3] جنگ احد کے موقع پر یہ انصاری خاتون کے جذبات کی طرف اشارہ ہے۔

مسلمانانِ عالم کا قومی ترانہ

مُسْلِمُوْنَ مُسْلِمُوْنَ مُسْلِمُوْنَ حَیْثُ کَانَ الْحَقُّ وَالْعَدْلُ نَکُوْن
نَرْتَضِی الْمَوْتَ وَنَأْبٰی اَنْ نَّهُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَا اَحْلیٰ الْمَنُوْنَ
نَحْنُ بِالْاِسْلَامِ کُنَّا خَیْرَ مَعْشَرْ وَ حَکَمْنَا بِاسْمِهٖ کِسْرٰی وَقَیْصَرْ
وَ زَرَعْنَا الْعَدْلَ فِی الدُّنْیَا فَاثْمَر وَ نَشَرْنَا فِی الْوَرٰی اَللّٰهُ اَکْبَرْ

فَاسْئَلُوْا، اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ
مُسْلِمُوْنَ مُسْلِمُوْنَ مُسْلِمُوْنَ

سَائِلُوْا التَّارِیْخَ عَنَّا مَا وَعٰی مَنْ حَمٰی حَقَّ فَقِیْرٍ ضُیِّعَا؟
مَنْ بَنٰی لِلْعِلْمِ صَرْحًا اَرْفَعَا؟ مَنْ اَقَامَ الدِّیْنَ وَ الدُّنْیَا مَعًا؟

سَائِلُوْهُ سَیُجِیْبُ ، اَلْمُسْلِمُوْنَ
مُسْلِمُوْنَ مُسْلِمُوْنَ مُسْلِمُوْنَ

---

[1] ”ہم مسلمان ہیں، ہم مسلمان ہیں، مسلمان ہیں۔ جہاں حق اور عدل ہوگا وہاں ہم ہی ہوں گے۔ ہم موت قبول کر لیتے ہیں لیکن بے عزتی قبول نہیں کرتے۔ اللہ کی راہ میں مرنا کس قدر شیریں موت ہے۔“

[2] ”ہم اسلام کی برکت سے بہترین اُمت بنے۔ اور ہم نے اس کے نام سے ہی کسریٰ و قیصر پر حکومت کی۔ اور ہم نے دنیا میں عدل و انصاف کا پودا لگایا جو ثمر بار ہوا۔ اور ہم نے کائنات میں اللہ اکبر کو فروغ دیا۔ اگر تم لاعلم ہو تو اہل دنیا سے پوچھ لو۔ ہم مسلمان ہیں، مسلمان ہیں، مسلمان ہیں۔“

[3] ”تاریخ کے صفحات سے ہمارے متعلق پوچھو۔ کہ گرے پڑے بے کسوں کے حقوق کا تحفظ کس نے کیا؟ اور علم کا بلند و بالا محل کس نے تعمیر کیا؟ اور دنیا و دین کو کس نے یکساں سنبھالا دیا۔ اس سے پوچھو وہ جواب دے گی کہ! مسلمانوں نے۔ ہم مسلمان ہیں، مسلمان ہیں، مسلمان ہیں۔“

نَحْنُ بِالْإِيْمَانِ اَحْيَيْنَا الْقُلُوْب نَحْنُ بِالْاِسْلَامِ حَرَّرْنَا الشُّعُوْب
نَحْنُ بِالْقُرآنِ قَوَّمْنَا الْعُيُوْب وَ انْطَلَقْنَا فِي شمال وَجَنُوْب
نَنشُرُ النُور وَ نَمْحُوا كُلَّ هُوْن
مُسْلِمُوْن مُسْلِمُوْن مُسْلِمُوْنَ
يا أَخِيْ فِي الْهِنْدِ أَوفِي الْمَغْرِب اَنَا مِنْکَ اَنْتَ مِنّي ، اَنْتَ بِيْ
لَا تَسْئَلْ عَنْ عُنصُرِىْ او نَسَبِيْ اِنّ الْإِسْلَامَ اُمِّيْ وَاَبِيْ
نَحْنُ بِالْإِيْمَانِ مُوتَلِفُوْن
مُسْلِمُوْن مُسْلِمُوْن مُسْلِمُوْنَ
قُمْ نُعِدْ عَدْلَ الْهُدَاةِ الرَّاشِدِيْن قُمْ نَصِلْ مَجْدَ الْاُبَاةَ الْفَاتِحِيْن
شَقِيَ النَّاسُ بِدُنْيَا دُوْنَ دِيْن فَلِنُعِدْهَا رَحْمَةً لِلْعَالَمِيْن
لَا تَقُلْ كَيْفَ؟ فَاِنَّا مُسْلِمُوْن
مُسْلِمُوْن مُسْلِمُوْن مُسْلِمُوْنَ

(قرضاوی)

[4] ''ہم نے ایمان سے دلوں کو زندگی بخشی۔ ہم نے اسلام کے ذریعے قبیلوں کو آزادی بخشی۔ ہم نے قرآن سے اپنے نقائص کو درست کیا۔ اور ہم نے اسے لے کر شمال وجنوب کی طرف سفر کیا۔ ہم نور بکھیرتے ہیں اور اندھیرے ختم کرتے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں، مسلمان ہیں، مسلمان ہیں۔''

[5] ''اے میرے ایشین یا یورپین برادر! میں تجھ سے ہوں اور تو مجھ سے اور میرے ساتھ ہے۔ تو میری رنگت اور نسل کے متعلق نہ پوچھ۔ کیونکہ اسلام ہی میرا باپ اور میری ماں ہے۔ ہم ایمان کی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں، مسلمان ہیں، مسلمان ہیں۔''

[6] ''اُٹھو! ہم خلفائے راشدین کا عدل وانصاف عام کر دیں۔ اُٹھو! ہم اپنے فاتحین آباؤ اجداد کے مرتبہ و مقام کی طرف گامزن ہوں۔ لوگ دین کے بغیر دنیا کو گلے لگا کر ذلیل ہو گئے۔ اُٹھو! ہم اس دین کو جہاں کے لیے رحمت بنا دیں۔ یہ نہ کہو کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم مسلمان ہیں، مسلمان ہیں، مسلمان ہیں۔''

جہالت کی تاریکیوں سے نورِ اسلام تک[1]

سمرقند تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ آسمان پر سیاہ بادلوں کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ آسمان پر کوئی تارا نظر آتا تھا نہ زمین پر کوئی چراغ۔ تمام لوگ سو چکے تھے۔ اس عالم میں صرف ایک شخص جاگ رہا تھا۔ رات کی تاریکی میں یہ شخص اپنے گھر سے نکلا اور دائیں بائیں جھانکے بغیر سیدھا قصر امارت کے پاس چلا گیا۔ اس نے محل پر ایسی قاہرانہ نگاہ ڈالی کہ اگر اس میں انگارے ہوتے تو یہ محل خاکستر ہو جاتا۔ معاً اس نے قدم تیز کیے اور اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ شہر سے نکل کر درختوں کے ایسے جھنڈ میں داخل ہو گیا جہاں وحشی درندوں اور خونخوار جانوروں کی دہشت ناک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جنگل خوفناک تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ درختوں کے جھنڈ اور رات کی گھٹا ٹوپ اندھیروں کی وجہ سے آنکھوں پڑی چیزیں بھی پوری طرح دیکھائی نہ دیتی تھیں

مگر یہ آدمی اس خطرناک منظر سے بے پروا ہو کر منزل مقصود کی طرف گامزن رہا۔ اگلا مقام اس سے بھی زیادہ خوفناک اور دل دہلا دینے والا تھا۔ چلتے چلتے جب وہ اس پتھر کے پاس پہنچا جو مندر کے پہلو میں تھا تو ہیبت کی وجہ سے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس پر اتنا خوف طاری ہوا جو عام لوگوں پر خوف ناک درندے دیکھ کر بھی نہیں ہوتا۔

اس کا سبب یہ نہ تھا کہ یہ شخص کوئی بزدل انسان یا نوعمر لڑکا تھا۔ بلکہ اس جری اور دلیر شخص کے دل میں بچپن سے ہی مندر کے ہیبت ناک توہمات بٹھا دیئے گئے

تھے اور یہ انھی توہمات میں پروان چڑھا تھا۔ چنانچہ یہ مندر کی مخفی قوتوں اور اسرار و رموز سے اتنا خائف تھا کہ میدان جنگ کی سنسناتی ہوئی تلواروں کا خوف اس کے مقابلے میں ہیچ تھا۔

وجہ یہ تھی کہ اس مندر میں ہر کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ اس میں تو صرف وہی کاہن (پروہت) داخل ہوسکتا تھا جو نفس کش ریاضتیں کر کے اور زبردست قسم کی مشقتیں اٹھا اٹھا کر رشی بن چکا ہو اور جو شخص رشی بن کر اس میں داخل ہو جاتا وہ دنیا کی رونق اور اس کی لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر لیتا۔

مندر کا خوفناک منظر

چنانچہ یہ جری اور شجاع شخص پروہتوں کے خوف سے قدم آگے نہ بڑھا سکا۔ کچھ عرصہ کھڑا رہنے کے بعد اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے دروازہ کھٹکھٹانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اندھیرے میں بڑے سر والی ڈراؤنی شکل دکھائی دی۔ جس کی ڈاڑھی وسیع و عریض اور بال لمبے لمبے تھے۔ یہ اسے دیکھ کر مزید خوف زدہ ہو گیا۔ قریب تھا کہ وہ بھاگ کھڑا ہوتا، لیکن جب اُس نے اِس کا نام لے کر انسانی آواز میں اسے پکارا تو یہ سمجھ گیا کہ یہ مندر کا دربان ہے اور مجھے لینے آیا ہے۔ یہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا، لیکن اس کا دل آنے والے منظر سے دھڑک رہا تھا۔ دربان اسے اپنے ہمراہ ایک طویل ترین سرنگ میں لے گیا جس کی دونوں اطراف میں تانبے کے منقش چراغ روشن تھے اور ان سے نیلی رنگت کی روشنی نکل نکل کر دیواروں کے پتھروں پر رقص کر رہی تھی۔ اس سرنگ میں ان دیوتاؤں کی ہیبت ناک تصویریں رکھی ہوئی تھیں جن کی آنکھوں سے سرخ شعلے نکل رہے تھے اور یہ آنکھیں بڑے بڑے نڈر لوگوں کے دل دہلا دیتی تھیں۔

سرنگ کی دونوں جوانب چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے جن میں جب کبھی ہوا

پورے زور سے داخل ہوتی تو ایسی ایسی آوازیں نکلتیں کہ سننے والوں کو بہرا کر دیتی تھیں۔ یہ دونوں چلتےچلتے ان رشیوں کے پاس پہنچے جنھیں کبھی کبھار بادشاہ ہی دیکھ سکتا تھا اور سارے حکمران ان کی بات رد نہیں کر سکتے تھے، مبادا ان کی بات نہ ماننے کی وجہ سے کوئی مصیبت نہ آن پڑے۔

یہ آدمی ہیبت اور دہشت کی وجہ سے ارد گرد دیکھتا نہ نظر بھر کر پروہتوں کو دیکھتا۔ البتہ ان کی باتیں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ اور یہ انھیں ایسے سن رہا تھا جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔

اس نے نظریں جھکائے ہی اندازہ لگایا کہ ان میں سے ایک پروہت سمرقند کا ماضی یاد کر رہا ہے اور اہل وطن کی بد اعمالیوں پر آنسو بہا رہا ہے۔ اور بڑے دکھ کے ساتھ بیان کر رہا ہے کہ مسلمان کس طرح ناگہانی آفت کی طرح آئے اور انہوں نے سمرقند کا تاج وتخت الٹ دیا۔ اب ان کے نکلنے کی تمام امیدیں ختم ہو گئی ہیں اور سوائے ترکش دان کے آخری تیر چلانے کے کوئی چارہ نہیں اور وہ یہ ہے کہ ہم نے سنا ہے کہ اس قوم کا حکمران بڑا عادل اور منصف مزاج ہے۔ ہمارا پروگرام ہے کہ ہم اس کی خدمت میں اپنا قاصد بھیجیں جو اسے ہماری شکایت سے آگاہ کرے پھر جو ہو سو ہو۔

اور ہم نے تجھے تیری جرات وشجاعت اور عربی زبان میں مہارت کی وجہ سے منتخب کیا ہے، کیا تو راضی ہے؟

اس نے کہا، ہاں!

پروہت نے کہا:

دیوتاؤں کی توفیق سے روانہ ہو جا۔

یہ آدمی مندر سے نکلا۔ فخر کی وجہ سے اس کا سر بلند تھا۔ اب اس کے پاؤں زمین پر اور دماغ آسمانوں پر پرواز کر رہا تھا۔ وہ اتنی خوشی محسوس کر رہا تھا کہ اڑ کر دمشق چلا

جائے۔ اسے رات کا اندھیرا، روشنی نظر آنے لگا کیونکہ اس کے لیے یہ بڑی خوشی کی بات تھی کہ وہ بڑے پروہت سے ہم کلام ہوا ہے اور یہ ایسا اعزاز تھا جو شاید ہی کسی کو نصیب ہوتا ہو۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب سمرقند کی آزادی اس کے بائیں ہاتھ میں ہے وہ فرط شجاعت میں تمنا کرنے لگا: کاش وہ مجھے اسلامی افواج سے ٹکرا جانے کا حکم دیتے۔

لیکن یہ اس کی خیام خیالی تھی۔ سمرقند کی حیثیت اسلامی سلطنت کے مقابلے میں اس خاشاک کی جڑ کی سی تھی جو سمندر کی تہ پر پنجہ جمانا چاہے تو سمندر کی ایک موج اسے بہا کر کہیں سے کہیں لے جائے۔

حیران کن مسافت

چنانچہ یہ آدمی زادِ سفر لے کر چل پڑا۔ دن اور رات، ہفتے اور مہینے مسلسل سفر کرتا رہا۔ سمرقند سے بخارا، بخارا سے بلخ، بلخ سے ہرات، ہرات سے قزوین، قزوین سے موصل، موصل سے حلب، حلب سے دمشق۔ سفر ختم ہونے کو آتا ہی نہ تھا۔ سب ریاستیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ سرسبز و شاداب زمینیں، تہذیب و تمدن کے عجیب و غریب نمونے، چاروں طرف رونق ہی رونق، پرشکوہ عمارتیں، بلند و بالا محلات، وسیع و عریض شاہراہیں، حسین و جمیل انسان، باپردہ اور حیادار خواتین، مختلف رنگوں کے پہاڑ، ہزاروں باغات، مختلف اقسام کے میوہ جات۔ وہ دیکھتا چلا جا رہا تھا مگر یہ عجائبات ختم ہونے کو نہ آتے تھے۔ انھیں دیکھ کر اسے سمرقند کی عظمت ہیچ نظر آنے لگی۔ سمرقند کی حیثیت چین و ایران کے مقابلے میں کیا تھی جنھیں پہاڑوں کے درمیان آباد، مدینۃ الرسول ﷺ نے نیچا دکھا دیا تھا۔

مدینہ منورہ وہ سرزمین ہے کہ جسے محمد رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے داہنے ہاتھ سے حرکت دی تو اس نے خالد بن ولید، مثنّٰی بن حارثہ، سعد بن ابی وقاص (رضوان اللہ علیہم اجمعین) اور محمد بن قاسم، قتیبہ بن مسلم، طارق بن زیاد، عبدالرحمٰن الداخل

اموی جیسے بے مثال جرنیل پیدا کیے (رحمہم اللہ جمیعا) جنھوں نے سرکش حکومتوں کے تخت الٹ دیئے۔ پھر اسی صحرائی زمین نے شام، عراق، ایران اور خراسان کو پسماندگی سے نکال کر بام عروج پر پہنچا دیا۔ بے دین حکمرانوں کی فتوحات سے ملک اجڑتے رہے تھے جبکہ اسلامی حکومتوں کی فتوحات سے دنیا آباد ہوتی چلی گئی۔

دمشق میں داخلہ

بالآخر وہ دمشق پہنچا اور اسے پہلی نظر سے دیکھ کر یوں چونک پڑا جیسے نیند سے بیدار ہوا ہو۔ بڑے بڑے ترقی یافتہ ملکوں کے بادشاہوں کی ملاقات کے تصور سے اس کا دل دھڑکنے لگا......

یہ دمشق ہے...... مسلمانوں کا دارالحکومت...... جلال و جمال کا دلفریب دارالسلطنت، دولت و ثروت کی کان، تقویٰ اور شرافت کا گہوارہ۔ یہیں سے ایسا فرمان جاری ہوتا ہے کہ جس کے سامنے دمشق سے سمرقند اور سمرقند سے سپین تک کے امراء کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔ اور یہیں وہ مرد حکمران بستا ہے جس کے سامنے قیصر روم، کسریٰ ایران، سکندر یونان، خاقان چین کی عظمتیں نقش برآب ہو گئیں اور جس کی بات کو چین کے کہساروں سے لے کر بحر ظلمات تک ٹالنے والا کوئی نہیں۔

دل میں خیال آیا کہ اس حکمران تک رسائی کیسے حاصل ہوگی؟ مسافر ہوں، پہلے کبھی یہاں آیا بھی نہیں۔ ناامیدی پیدا ہوئی...... رات گزارنے کے لیے ایک سرائے میں ٹھہرا۔ صبح ہوئی تو خوبصورت جوڑا زیب تن کیا اور خلیفہ کی ملاقات کو نکلا تو کسی آدمی سے خلیفہ کے متعلق پوچھتے ہوئے دہل گیا۔ اسے خیال آیا کہ نصف خطہ ارض کے حکمران سے ملنا جوئے شیر لانا ہے۔ اسے یاد آیا کہ دنیا کے بادشاہ کس طرح کسریٰ ایران کے سامنے لرزاں و ترساں کھڑے ہوتے تھے۔ وہ محض شبہے اور

ناپسندیدہ جملے کی بنا پر ان کو درندوں کے حوالے کر دیتا تھا۔

اس نے اپنی جان کے خطرے کے پیش نظر خلیفہ سے ملاقات کا خیال دل سے نکال دیا اور سوچنے لگا کہ جان گنوا کر ملک کی آزادی میرے کس کام۔ انہی سوچوں اور گھبراہٹوں میں گم ادھر ادھر گھومتا رہا۔ جب کبھی کسی پرشکوہ محل کے سامنے سے گزرتا تو رونق اور ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر اسے خلیفہ کا گھر خیال کر کے ششدر و حیران رہ جاتا اور ملاقات کے تصور سے دل بیٹھ جاتا۔ چلتے چلتے اس کے سامنے ایک وسیع و عریض اور عالی شان عمارت آ گئی، جس کا دروازہ بلند و بالا اور بہت چوڑا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو لمبے لمبے مرمریں ستون تھے، جن کے نقش و نگار اور بیل بوٹوں کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ بے شمار لوگ اس میں آ جا رہے ہیں اور کوئی روکتا ٹوکتا نہیں۔ چنانچہ یہ بھی اس میں داخل ہو گیا۔ اندر جا کر خوبصورت وسیع و عریض صحن اور جھیل کو دیکھ کر پہلے سے زیادہ حیران ہو گیا۔ اس جھیل میں پانی کے فوارے پھوٹ رہے تھے اور سورج کی کرنوں نے اسے وہ حسن بخش دیا تھا جو بیان سے باہر ہے۔ آگے جا کر دیکھتا ہے کہ ہزاروں افراد مختلف کاموں میں مصروف ہیں۔ کہیں کوئی اٹھتا ہے، کوئی بیٹھتا ہے اور کہیں علمی حلقے قائم ہیں۔ بحث و مباحثہ ہو رہا ہے۔ کہیں درس و تدریس اور کہیں فتاویٰ لکھے جا رہے ہیں۔ اتنی مخلوق جمع ہے کہ ایک سرے پر کھڑے ہو کر دوسرے سرے تک نظر نہیں دوڑائی جا سکتی تھی۔ فرش ایسا خوشنما کہ شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ دیواروں کے رنگ و روغن نے آنکھیں چندھیا دیں۔ چھت کی طرف دیکھا تو چاندی کی زنجیروں سے لٹکتی ہوئی قندیلوں اور شمع دانوں کی خوش نمائی نے سب کچھ بھلا دیا۔ اس بقعہ نور میں چلتے چلتے ایک نمازی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس نے سلام پھیر کر اس مسافر کا حال پوچھا۔ اسے معلوم ہوا کہ خلیفہ سے ملنا چاہتا ہے۔

نمازی: تو کیا آپ امیر المومنین کے گھر کا پتہ پوچھنا چاہتے ہیں؟

سمرقندی: کیا یہ امیر المومنین کا گھر نہیں؟

نمازی: (ہنستے ہوئے) نہیں یہ اللہ کا گھر ہے۔ کیا تو نے نماز پڑھ لی ہے؟

اس بیچارے کو نماز کا کیا پتہ۔ یہ تو اس دین کا پابند تھا جس کی معرفت صرف ڈراؤنی صورتوں والے دیوتاؤں ہی کو حاصل تھی۔ کہاں مندروں کا اندھیرا اور کہاں اسلام کا نور و جمال۔ یہ خاموش رہا تو نمازی نے پھر پوچھا کیا تم نے نماز ادا کر لی ہے؟

سمرقندی: نہیں جناب میں نے نماز نہیں پڑھی اور میں جانتا ہی نہیں کہ نماز کیا ہے؟

نمازی: تیرا دین کون سا ہے؟

سمرقندی: میں سمرقند والوں کے دین کا پابند ہوں۔

نمازی: ان کا دین کیا ہے؟

سمرقندی: مقدس مورتیوں کی پرستش۔

نمازی: تیرا رب کون ہے؟

سمرقندی: مندر کے مرعوب کن دیوتا۔

نمازی: کیا جب تو بیمار ہوتا ہے تو وہ تجھے شفا دیتے ہیں یا تو حاجت طلب کرے تو پوری کرتے ہیں؟

سمرقندی: میں نہیں جانتا۔

قبول اسلام

اس نمازی نے سمجھ لیا کہ یہ بیچارہ جاہل ہے۔ اس نے اس کے خالی دل میں اسلام کے سیدھے سادھے اصول اور اس کا جمال ڈالنا شروع کر دیا۔ تھوڑی سی دیر میں یہ اس دین کا پابند ہو گیا، جس نے عربوں کو پوری دنیا کا حکمران بنا دیا تھا۔

نمازی نے کہا آؤ میں تمہیں خلیفہ کا گھر بتاؤں۔ (اور اس وقت امیر المومنین

گھر کا کام کر رہے تھے) یہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا اور اس کا چہرہ، اسلام کے جمال و کمال سے آ گہی کی بنا پر تمتما رہا تھا۔ یہ داخل ہونے والے دروازے کی بجائے دوسرے دروازے سے نکلا اور اس وقت حیران و ششدر رہ گیا جب نمازی لکڑی کے دروازے والے تنگ مکان کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا کہ یہ امیر المومنین کا گھر ہے۔

خلیفۃ المسلمین کے گھر کی حالت

اس نے نمازی کی طرف دیکھا کہ شاید مذاق کر رہا ہو لیکن اسے سنجیدہ پا کر دروازے سے آگے بڑھ گیا۔ اسے دروازے کی دراڑ سے نظر آیا کہ ایک بزرگ گارے سے دیوار لیپ رہا ہے اور ایک بی بی آٹا گوندھ رہی ہے۔ اس نے دروازہ چھوڑ دیا اور غصے سے اس نمازی کو پکڑ لیا اور کہا ''تو نے مجھ سے جھوٹ بول کر کیا لینا تھا؟ میں نے تجھ سے خلیفہ کا گھر پوچھا تھا لیکن تو نے معمار کا گھر بتا دیا!''

نمازی: کون سا معمار؟

سمرقندی: ''گھر والا اور کون؟'' پھر اسے گھر والے کا حلیہ بتایا۔

نمازی: افسوس تجھ پر! وہی تو امیر المومنین عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں۔ کہ اس وقت اللہ کے بعد روئے زمین پر اس سے بڑا حکمران کوئی نہیں ہے۔ اور وہ عورت؟

وہ امیر المومنین کی بیوی، خلیفہ عبدالملک کی بیٹی اور دو خلفاء ولید بن عبدالملک اور سلیمان کی بہن بعد میں بننے والے دو خلفاء کی ہمشیرہ، عرب کی معزز ترین عورت ہے۔ امیر المومنین بذات خود بڑے مالدار، خوش پوش اور خوش خوراک انسان تھے۔ لیکن ان میں دنیا کے مشہور ترین عادل حکمران عمر فاروقؓ کی رگ تھی جو اسے اس ت میں لے آئی۔

واپس جا اور دروازہ کھٹکھٹا کر انھیں اپنا قصہ سنا اور خوف نہ کھا۔ اللہ کی قسم! یہ

کوئی متکبر اور ظالم و جابر حکمران نہیں ہے۔ یہ تو متواضع اور منکسر المزاج امیر المومنین ہیں انھیں حق بات نافذ کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی۔ جب یہ اللہ کی خاطر غصہ میں آتے ہیں تو ہواؤں کے جھکڑ اور بادلوں کی بجلیاں اس کی قوت بن جاتی ہیں۔

سمرقندی پر رعب و کپکپی

سمرقندی رجعت قَہقَری [2] میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بہادری جوش مارتی ہے تو قدم اٹھا لیتا ہے۔ رعب و دبدبہ کا تصور آتا ہے تو دل بجھ جاتا ہے۔ وہ اپنے ملک کے حکمرانوں کے مسلح باڈی گارڈز کا تصور کرتا ہے تو تذبذب میں پڑ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ تو وہ ہوتے ہیں جو تلوار کے زور پر حکمرانی کریں اور رعیت ڈر کر ان کی اطاعت کرے۔ عدل کی حکمرانی اور محبت کی اطاعت تو وہ جانتا ہی نہ تھا۔ یہ بات دل میں جاگزیں ہوئی کہ ضرور یہ شخص مذاق کر رہا ہے۔ دوڑ کر اس نمازی کو پیچھے سے جا لیا اور کہا

سمرقندی: میرے بھائی تجھے اللہ کی قسم! سچ بتا؛ واقعی یہ امیر المومنین کا گھر ہے؟

نمازی: جی ہاں! واقعی!

یہ اس انسان کا گھر ہے جسے قرآن کی برکت نے قیصر و کسریٰ، فرعون و خاقان کے ممالک اور ان کے تاج کا وارث بنایا۔ چونکہ اس کا سر بلند تھا اور یہ تاج چھوٹے تھے۔ تاج وہاں تک نہ پہنچ پاتے تھے، اس لیے اس نے عرب کے تاج (عمامے) پسند کر لیے۔

خلیفۃ المسلمین کا انداز حکمرانی

...... یہ اس آدمی کا گھر ہے جس کے سامنے دنیا کے ثمرات اور مال غنیمت کے

اموال کشاں کشاں چلے آ رہے ہیں اور یہ سونا تول تول کر مستحقین کو دے رہا ہے۔ فقیروں کو جواہرات اور محتاجوں کو گھر دے رہا ہے لیکن خود ان چیزوں سے بے نیاز ہے۔ اپنے خاندان کو اس کے قریب نہیں پھٹکنے دیتا...... کیونکہ اس نے سونے، چاندی اور جواہرات کے بدلے اپنے رب سے جنت کا سودا کر رکھا ہے۔

اس نے دنیا کو عاجزی اور لاچاری کی بنا پر ترک نہیں کیا بلکہ شاہی میں فقیری اختیار کی ہے۔ حکمران بننے سے پہلے وہ اپنی صلاحیت کا لوہا منوا چکا تھا۔ اس کی رہبانیت بھی عجیب ہے۔ نہ غار میں بیٹھ کر ترک دنیا پر مائل، نہ مسجد میں یاد الٰہی کے بہانے حقوق العباد سے غافل بلکہ دولت و ثروت اور حکومت و سلطنت کا مالک ہو کر زاہد بن گیا ہے۔

یہ آگ میں داخل ہوا تو ہے مگر جل نہیں رہا۔ پانی میں چل تو رہا ہے مگر بھیگ نہیں رہا۔ اس کے منہ میں ادیب کی زبان اور سر میں دانائی کے خزانے ہیں۔ سینے میں جرنیل کا دل ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کو اپنی فراست مومنانہ سے چلا رہا ہے۔ داخلہ اور خارجہ، عدلیہ اور انتظامیہ جیسے محکمے اس کے اشاروں پر چل رہے ہیں۔

یہ قائد بھی ہے اور مفتی بھی، عالم بھی ہے اور معلم بھی۔ اس کے حسن انتظام سے دنیا کی وسیع و عریض سلطنت میں امن و امان قائم ہو گیا۔ پوری مملکت میں دشمنیاں ختم ہو گئیں۔ مقابلہ کرنے والوں نے ہتھیار پھینک دیئے۔ شیعہ اور خارجی بھائی بھائی بن گئے۔ مضری اور یمنی، کالے اور گورے نے صلح کر لی ہے۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پینے لگے ہیں۔ حوادثات زمانہ جب اسے دیکھتے ہیں تو ساحل سمندر سے ٹکرا کر واپس مڑنے والی موج کی طرح پیچھے پلٹ جاتے ہیں۔

یہ امیر المومنین سلیمان کو دفنا کر واپس آ رہے تھے کہ باد نسیم کی طرح یہ خبر پھیل گئی؛ عمر بن عبدالعزیز اموی کو خلیفہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ خبر پھیلتے ہی فضا مسرت کے

نعروں سے گونجنے لگی گویا عید الفطر کا چاند طلوع ہو گیا ہو۔ سرکاری ملازم سونے اور جوہرات سے مرصع سواریاں لے کر حاضر ہوئے۔ اس نے پوچھا یہ کس لیے؟ انہوں نے عرض کی: یہ امیر المومنین کے پروٹوکول کے لیے ہیں۔ فرمایا: مجھے ان سے کیا سروکار؟ لے جاؤ اور میرا خچر لے آو۔ خچر لایا گیا تو ایک سیکورٹی افسر مسلح ہو کر دستور کے مطابق آگے آگے چلنے گا۔ فرمایا پیچھے ہٹ جاؤ، مجھے ایسی کوئی ضرورت نہیں، میں بھی ایک عام مسلمان ہوں۔

چنانچہ بغیر کسی حفاظتی دستے اور شاہی جھنڈے کے خچر پر سوار ہو کر وہ شخص جا رہا ہے جو شام، اندلس، مراکش، الجزائر، تیونس، طرابلس، مصر، حجاز، نجد، یمن، فلسطین، اردن، لبنان، عراق، ایران، آذر بائیجان، آرمیبیا، کابل، بخارا اور سندھ جیسے بیس (۲۰) بڑے بڑے صوبوں (اور موجودہ ملکوں) کا واحد حکمران ہے۔ جاتے ہی مسجد میں داخل ہو گیا۔ تمام لوگ صفوں پر بیٹھ گئے۔ یہ منبر پر کھڑا ہو کر حمد وثنا کے بعد یوں گویا ہوا:

لوگو! مجھے مسلمانوں کے مشورے اور میری مرضی کے بغیر حکمران بنا دیا گیا ہے۔ میں تمھاری گردنوں سے اپنی بیعت واپس لیتا ہوں۔ جسے چاہو خلیفہ بنا لو۔ یہ سنتے ہی تمام حاضرین بے ساختہ چیخ پڑے اور سب کے سب بیک آواز بولے: ہم آپ کے علاوہ کسی کو نہیں چاہتے۔

پھر یہ قصر خلافت کی طرف روانہ ہو گیا۔ جاتے ہی حکم دیا کہ اس محل کے ریشمی پردے اتار دیئے جائیں۔ غالیچے اور قالین لپیٹ دیئے جائیں۔ سامان آرائش اکٹھا کر دیا جائے۔ جب فرمانِ خلافت کی تعمیل ہو گئی تو آپ نے ان سب چیزوں کو نیلام کر کے رقم بیت المال میں داخل کرا دی۔

لوگوں نے سوچا یہ نیک آدمی ہے لیکن حکومت شاید اس کے بس کا روگ نہ ہو۔

انہوں نے سوچا کہ تسبیح ہاتھ میں لیے گوشے میں بیٹھ جائے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ تسبیح کی جگہ قلم چل رہا ہے۔ سالہا سال کے مظالم لوٹائے جا رہے ہیں، ظالموں سے مظلوموں کے حقوق لیے جا رہے ہیں۔ دن اور رات ایک کر کے ملکی نظم و نسق قرآنی اصولوں پر استوار کیا جا رہا ہے۔ احکامات پر فوری تعمیل کرائی جا رہی ہے۔

دنیا کو پتا چل گیا کہ یہ شخص دنیا سے لاتعلق ہونے کے باوجود رموز مملکت سے آشنا ہے۔ صرف آشنا ہی نہیں بلکہ بدعنوانیوں کے کس بل نکالنے کا فن بھی جانتا ہے۔ صبح سے دوپہر تک فرائض سرانجام دینے کے بعد قیلولہ کرنے کے لیے لیٹنا ہی چاہتا تھا کہ نوجوان فرزند عبدالملک آ گیا اور عرض کی: آپ سو گئے تو مظلوموں کی دادرسی کون کرے گا؟ فرمایا: بیٹا! تیرے چچا سلیمان کے کفنانے، دفنانے میں مشغولیت کی بنا پر کل کا تھکا ہوا ہوں۔ سو کر ظہر کے بعد یہ کام کروں گا۔ اس نے کہا ابو جان! اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آپ ظہر تک زندہ بھی رہیں گے؟ یہ فوراً اٹھے اور اعلان کرا دیا جس کسی کو شکایت ہو آئے۔ میں اپنے گھر اور خاندان سے شروع ہوتا ہوں۔

اللہ کی قسم جتنا کہا اس سے کہیں زیادہ کر کے دکھایا۔

ہاں اے مسافر! یہ امیر المومنین کا گھر ہے۔ اسے چھوٹا اور خام سمجھ کر حقیر نہ جان۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے دروازے رنگ و روغن سے کورے اور مسلح دربان سے خالی ہیں لیکن یہ دنیا کے تمام گھروں سے معزز ہے۔ جا اور خوف نہ کھا۔

سمرقندی کی امیر المومنین سے ملاقات

سمرقندی لوٹ پڑا۔ جب دروازے کے پاس پہنچا تو کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ ایک بچے نے دوسرے کا سر پھوڑ دیا ہے۔ خلیفہ بذات خود گھر سے نکلا اور بچے کو پکڑا۔ سمرقندی کو دیکھ کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں سمرقند سے ظلم کی شکایت لے کر آیا ہوں۔ فرمایا ٹھہر میں ابھی آتا ہوں۔ اس کے بعد ایک

عورت لرزتی ہوئی آئی اور کہنے لگی یہ سر پھوڑنے والا بچہ میرا بیٹا ہے۔ اور یہ یتیم ہے، اس پر رحم فرمائیں امیر المومنین پوچھتے ہیں؛ اس کا وظیفہ لگ گیا ہے یا نہیں؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا ہم اس کا نام دیوان میں لکھ لیں گے۔ وہ عورت دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ ادھر امیر المومنین کے زخمی بیٹے کی ماں غصے سے بولی؛ اب اگر وہ بچہ دوبارہ ایسا نہ کرے تو مجھے کہنا۔ امیر المومنین نے فرمایا؛ تم نے اسے ڈرایا ہوگا؟ اس کے بعد امیر المومنین باہر آئے تو سمرقندی نے عساکر اسلامیہ کے جرنیل قتیبہ بن مسلم کی شکایت کی، کہ وہ بغیر دعوت اسلام دیئے، بغیر جزیہ طلب کئے اور بغیر اعلان جنگ کئے سمرقند پر قابض ہو گیا تھا۔

امیر المومنین نے فرمایا: واللہ! ہمارے نبی کریم ﷺ نے ظلم سے روکا ہے۔ اپنوں اور غیروں سے انصاف کا حکم دیا ہے۔ فرمایا: اے غلام قلم اور کاغذ لاؤ۔ وہ دو انگلی کاغذ اور قلم لے آیا۔ آپ نے چند سطریں لکھ کر مہر لگا دی اور فرمایا؛ وہاں کے گورنر کے پاس لے جاؤ۔

یہ وہاں سے نکلا اور سفر طے کرنے لگا۔ جب کسی شہر میں داخل ہوتا تو مسجد میں چلا جاتا۔ نماز کے وقت مسلمانوں سے کندھا ملا کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کے دل میں ایمان اور زبان پر تکبیر و تحمید تھی۔ وہ اپنے آپ کو اسلامی تنظیم کا رکن سمجھتا اور دیکھتا تھا کہ:

اسلامی مساوات کا دلکش منظر

ایک امامت کراتا ہے، دوسرے اقتداء کرتے ہیں۔ نہ ان میں کوئی پروہت ہے، نہ رشی۔ ان کے سامنے کوئی بت ہے نہ مجسمہ۔ امیر اور غریب، شاہ اور گدا، کالے اور گورے، حاکم اور محکوم سب کے سب ایک ہی صف میں کھڑے ہیں اور کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے ایک ذات رب العالمین کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔

اب نہ کوئی مشقت تھی نہ تکلیف۔ جب کسی شہر کی مسجد میں جاتا وہ مسافر سمجھ کر

مہمانی کرتے۔ اب یہ سوچتا ہے کہ میری آمد اور واپسی کے درمیان کتنا فرق ہے۔ آیا تھا تو غریب پردیسی تھا، جا رہا ہوں تو نعمتوں سے لدا ہوا واپس مندر پر پہنچا۔ لیکن اس مرتبہ نہ ڈراؤنے مجسموں کا خوف، نہ نیلے چراغوں کا ڈر۔ نہ پروہت کی ہیبت تھی نہ اس کا خوف۔ کیونکہ نور اسلام سے اس پر واضح ہو گیا کہ یہ بے جان بت نہ نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان۔ البتہ اس نے اپنے قبول اسلام کو مخفی رکھا۔ اس نے مندر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھول دیا گیا۔ اندر والے اسے زندہ و سلامت دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

اس نے اپنی روداد سفر بیان کر کے ان کو اور بھی حیران کر دیا۔ انہوں نے اسے جلد از جلد گورنر کے پاس بھیجا۔ گورنر نے رقعہ کھول کر پڑھا تو اس میں حکم تھا کہ موجودہ کور کمانڈر اور کاہنوں کا جھگڑا نمٹانے کے لیے خصوصی عدالت مقرر کی جائے اور جج جو فیصلہ کرے، اسے نافذ کر دیا جائے۔

گورنر نے سر اطاعت خم کرتے ہوئے عدالت تشکیل دی اور جمیع بن حاضر باجی کو جج مقرر کر دیا۔ عدالت کی تشکیل کی خبر سن کر پروہت خوشی سے تمتما اٹھے لیکن لمحے بھر کی خوشی کے بعد ان کے چہرے ایسے سیاہ ہو گئے جیسے صاف آسمان پر کالا بادل چھا گیا ہو۔ انہوں نے یقین کر لیا کہ یہ عدالت بھی مسلمانوں کی دھوکا بازی کا نیا باب ہو گی۔

مقررہ تاریخ آ پہنچی۔ تمام لوگ مسجد میں جمع ہو گئے۔ ایک طرف سمرقند کے پروہت بیٹھ گئے اور دوسری طرف عرب کا اسکندر (یعنی عساکر اسلامیہ کا جرنیل) جس کے برابر مشرق میں کوئی فتوحات حاصل نہ کر سکا تھا۔ لوگوں کی آنکھیں مسجد کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک دبلا پتلا اور نحیف و نزار شخص چھوٹی سی ٹوپی سر پر رکھے مسجد میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ اس کا غلام تھا۔ وہ آتے

ہی دو نفل ادا کر کے مسجد کے ستون سے لگ کر بیٹھ گیا اور اس کا غلام پاس کھڑا ہو گیا۔ یہ خصوصی عدالت کا جج جمیع بن حاضر باجی تھا۔

جج کو دیکھ کر پروہتوں کی آخری امید بھی ختم ہو گئی۔ یہ کیسے ہوگا کہ یہ شخص فاتح اعظم کے خلاف اور مغلوب پروہتوں کے حق میں فیصلہ سنائے؟

جج کے غلام نے بغیر کسی لقب اور کنیت کے سپہ سالار کو پکارا۔ وہ آ کر دائیں جانب بیٹھ گیا۔ پھر پروہتوں کے سربراہ کو بلایا اور وہ بائیں جانب بیٹھ گیا۔ مقدمہ کی سماعت شروع ہو گئی۔ خصوصی عدالت کے جج نے کمزور اور نحیف آواز میں پروہتوں کے پروہت سے کہا کہ اپنا دعوی پیش کرو۔

اس نے کہا عساکر اسلامیہ کے سپہ سالار نے بغیر دعوت اسلام اور بغیر جزیہ طلب کیے اور بغیر اعلان جنگ کیے دھوکے سے ہمارے ملک پر قبضہ کر لیا ہے۔

جج نے جرنیل سے جواب دعویٰ طلب کیا تو اس نے کہا:

اللہ آپ کو حق و انصاف پر گامزن رکھے، اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذریعے اس ملک کو کفر سے نجات دی اور مسلمانوں کو اس کا وارث بنایا۔

جج نے پوچھا کیا تم نے دعوت اسلام دی تھی اور ان کے انکار پر ان سے جزیہ طلب کیا تھا؟ اور پھر اعلان جنگ کیا تھا؟

جرنیل: نہیں جناب!

جج: گویا تم نے اقرار کر لیا ہے۔ سنو اللہ نے اس دین کی نصرت اس وجہ سے کی ہے کہ یہ حق و انصاف کا داعی ہے۔ اس لیے نہیں کہ ہم ملکوں پر بغیر حق کے قبضے کرتے پھریں۔ میرا فیصلہ یہ ہے کہ مسلمان اس ملک سے نکل جائیں اور سرحد پر جا کر اسلامی دستور کے مطابق دعوت اسلام پیش کریں پھر جزیہ طلب کریں۔ اگر یہ ان کے لیے بھی ناقابل قبول ہو تو پھر اعلان جنگ کریں''۔

اس کے بعد عدالت برخاست ہوگئی۔ایک طرف سے جج نکل گیا اور دوسری طرف سے عساکر اسلامیہ کا سپہ سالار۔مندر والے بھی سن کر چل دیئے۔مگر باقی لوگ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

ہمارے سمرقندی بھائی نے بڑے پروہت کے چہرے کی طرف دیکھا تو جانچ گیا کہ اس ناقابل یقین فیصلے کے بعد اس کے چہرے پر نور اسلام کی کرنیں چمکنے لگی ہیں۔اور اسے اسلام کی سرسبز و شاداب اور جلال و جمال سے منور دنیا نظر آ گئی ہے۔اسے اندازہ ہوگیا کہ اس نے اپنے دین کو خیر باد کہنے کا ارادہ کرلیا ہے، کیونکہ کسی سعید روح کا نور اسلام دیکھ کر اسلام قبول نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے بچے کا ماں کے پیٹ کی تاریک دنیا سے نکل کر دوبارہ اسی اندھیرے میں واپس جانا ہے۔

پروہتوں کا قبول اسلام

چند گھنٹے گزرنے کے بعد فضا بگل کی آواز سے گونجنے لگی۔چاروں طرف جھنڈے بلند ہونے لگے اور افواج اسلامیہ سمرقند سے نکلنے لگیں۔

پروہتوں نے حیرت سے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ فیصلہ نافذ ہوگیا اور لشکر جا رہا ہے۔

......یہ وہ لشکرِ ہے جو مدینہ منورہ سے چلا تو سمرقند تک کوئی طاقت اس کے سامنے ٹھہر نہ سکی تھی۔اور اس نے قیصر و کسریٰ کے ٹڈی دل لشکروں کو کچل دیا تھا۔ آج اسے دبلے پتلے نحیف و نزار اور پست آواز والے بوڑھے کی آواز نے نکال باہر کیا ہے۔اب یہ لشکر سرحد پر جا کر دستور کیمطابق دشمن کو دعوت اسلام دے گا۔ قبول نہ ہونے کی صورت میں جزیہ طلب کرے گا، اور پھر جزیہ سے انکار کی صورت میں دشمنانِ دین سے اعلان جنگ کرے گا۔

......تو کیا اب سمرقند اس لشکر کو روک سکے گا جسے روم وایران اور چین کی افواج نہ روک سکیں اور کیا مندر کے پتھر اس سیل رواں کو روک سکیں گے؟ ہرگز نہیں!

بڑا پروہت اپنے ساتھیوں سے پوچھنے لگا تمھارا کیا خیال ہے؟

سمرقندی بھائی نے کہا سنو! أشهد ان لا إله إلا الله وأن محمدا عبده ورسوله

یہ سن کر مندر کا سب سے بڑا پروہت بولا :أشهد ان لا إله إلا الله وأن محمدا عبده ورسوله .

پروہت (مندر کے سجادہ نشین) کی شہادۃ الحق دینی ہی تھی کہ پورا سمرقند نعرہ تکبیر سے گونج اُٹھا۔

مسلمان فوجیں، سمرقند میں داخل ہوگئیں۔ نہ کوئی حاکم رہا نہ محکوم۔ نہ غالب نہ مغلوب، سب کے سب بھائی بھائی بن گئے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہ رہی مگر تقویٰ کی بنا پر!

سمرقند اس وقت سے اسلام میں داخل ہوا اور ان شاء اللہ داخل رہے گا۔

......☆......

[1] اس قصے کا اصل فتوح البلدان میں ہے لیکن ہمارا ماخذ قصص من التاریخ مؤلفہ علامہ علی الطنطاوی ہے۔

[2] رجعت قَهْقَرىٰ: کبھی دو قدم آگے بڑھنا کبھی دو قدم پیچھے ہٹنا۔

دیانت داری کا صلہ [1]

یہ ۲۴۰ھ کا واقعہ ہے کہ رمضان المبارک کے پہلے دن کو فجر کی اذان حرم کے میناروں سے بلند ہو کر جبل ابوقبیس اور قعیقعان کی چوٹیوں کو چھوتی ہوئی بادنسیم کے جھونکوں کے ساتھ کعبۃ اللہ کے پردوں سے لپٹ رہی تھی اور اللہ کے مخلص بندوں کے دلوں پر تجلیات کی بارش برسا رہی تھی۔ کعبۃ اللہ کے گرد مومنوں کی صفیں نماز کے لیے درست ہو رہی تھیں۔ ان خوش نصیبوں کی آنکھیں براہ راست بیت اللہ کے جمال سے منور ہو رہی تھیں۔ جبکہ دیگر نمازیوں کی صفیں بیت اللہ شریف کی طرف متوجہ تو تھیں لیکن دور دراز مسافت کی وجہ سے صرف دلوں کی آنکھوں سے اس کا دیدار کر رہی تھیں، دور کے ان نمازیوں کی یہ صفیں بلند و بالا پہاڑوں اور سمندری جزیروں، شہروں اور بستیوں، صحراؤں اور وادیوں، کہساروں کی چوٹیوں اور محلات اور جھونپڑیوں، قید خانوں اور مرغزاروں، لق و دق ریگستانوں اور برفانی پہاڑوں کے پیچھے کھڑی تھیں وہ اس وقت تک مسلسل کھڑی ہوتی رہیں گی جب تک اس خطہ ارضی پر مسلمان آباد رہیں گے۔

اہل مکہ یہ اذان سن کر بیت اللہ کی طرف چل پڑے اور ایک چھیاسی سالہ بزرگ کے سوا شاید ہی کوئی نمازی ہو جو گھر میں بیٹھا رہ گیا ہو۔ انہوں نے شیریں اور ترش، سرد اور گرم، خشک اور تر، انواع واقسام کے عمدہ کھانوں سے پیٹ بھر کر نماز شروع کر دی۔

لیکن یہ بزرگ بھوک کی وجہ سے نماز میں کھڑا ہونے سے قاصر بھی تھا۔ اس بیچارے نے کچھ کھائے پیئے بغیر روزہ رکھ لیا تھا۔ اس کی گزشتہ رات بھی فاقہ سے گزری اور دن بھی بھوک پیاس سے گزرا تھا۔ جب اس نے نماز مکمل کر لی تو ایک کونے میں شکستہ دل اور غمگین ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے بذات خود اس فاقہ کشی کا اتنا دکھ نہ تھا کیونکہ عرصہ دراز کی تنگدستی نے اسے مصائب برداشت کرنے کا خوگر بنا دیا تھا۔ اسے کوئی غم کھائے جا رہا تھا، تو وہ بھوکی ننگی چار بیٹیوں، دو بہنوں، ایک بوڑھی ساس اور مسکین بیوی کا غم تھا۔ جن کا یہ واحد کفیل اور ذمہ دار تھا۔

اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو مالداروں کی شاہ خرچیوں کو دیکھ کر دنیا پہ للچاتا اور لوگوں سے حسد کرتا......

لیکن یہ بوڑھا بزرگ ایک مثالی مومن تھا۔ اس بات پر پختہ یقین رکھتا تھا کہ اللہ رب کائنات نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے رزق تقسیم کر رکھا ہے۔ کسی کا اس میں کچھ اختیار نہیں۔ لوگ نہ رزق دے سکتے ہیں اور نہ روک سکتے ہیں اور جو کچھ میرے مقدر میں ہے وہ مل کر ہی رہے گا۔ اگرچہ میں کمزور ہی سہی اور جو کچھ دوسروں کے مقدر میں ہے وہ مجھے ہرگز نہیں مل سکتا۔ اگرچہ لاکھ جتن کرلوں کیونکہ وہ تقدیر کا قلم لکھ کر فارغ ہو چکا اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔ الحمد للہ علی کل حال

کھڑا ہوا اور قمیص اتار کر پکارنے لگا۔ لبابہ......لبابہ!

یہ سن کر ایک عورت آئی جس کا تن پیوند لگے ہوئے میلے کچیلے کپڑوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے قمیص اتار کر اسے دے دی اور پھٹا پرانا کپڑا اپنے اوپر لپیٹ لیا۔

عورت نے کہا: ابوغیاث آج تیسرا دن ہے ہم نے کھانا تک نہیں دیکھا اور یہ دن گرمی اور روزے کا ہے۔ تو اور میں تو صبر کرلیں گے مگر یہ بچیاں اور بوڑھی عورت

تو صبر سے قاصر ہے۔ انھیں بھوک نے نڈھال کر رکھا ہے۔ اللہ کا نام لے کر نکلو۔ شاید اللہ کچھ درہم یا روٹی کے چند ٹکڑے دے دے جس سے ہم روزہ افطار کر سکیں۔

ابو غیاث نے کہا ان شاء اللہ ضرور جاؤں گا۔

......☆......

آفتاب طلوع ہو کر ذرا بلند ہوا تو بوڑھا بزرگ گھر سے نکلا اور مکے کی گلیوں میں گھومنے پھرنے لگا کہ شاید کہیں مزدوری مل جائے۔ تمام لوگ گرمی کی وجہ سے گھروں کو لوٹ چکے تھے۔ مزدوری تلاش کرتے کرتے گرمی شدید تر ہوتی چلی گئی۔ اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں اور آنکھیں پتھرا گئیں۔ گزشتہ رات اور دن کے فاقے، نیز بغیر کھائے پیئے روزے کی وجہ سے پیٹ میں بھوک کی آگ لگی ہوئی تھی۔ یہ مکہ کی نشیبی وادی میں جا کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی بڑی تمنا یہ تھی کہ اسے ایمان کی حالت میں موت آئے تا کہ وہ اس قید حیات سے رہائی پا جائے اور ہمیشہ کی زندگانی سے فائدہ اٹھائے۔ وہ انھی سوچوں میں گم سم مٹی کرید رہا تھا کہ اچانک اس کا ہاتھ ایک نرم و ملائم چیز سے چھو گیا اسے کچھ یوں محسوس ہوا کہ جیسے سانپ کی دم ہے۔ اس نے تعوذ پڑھا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ پھر دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش یہ سانپ مجھے ڈس لے اور میں مصائب سے آزاد ہو جاؤں لیکن معاً خیال آیا کہ مومن کے لیے کہاں جائز ہے کہ موت کی تمنا کرے۔ خودکشی تو اسلام میں حرام ہے بلکہ مومن کو چاہیے کہ یوں کہا کرے: ((اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ اِنْ كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّيْ وَتَوَفَّنِيْ اِنْ كَانَتِ الْمَوْتُ خَيْرًا لِّيْ)) چنانچہ اس نے اللہ سے معافی مانگی اور دوبارہ اس چیز کو غور سے دیکھنے لگا۔ اسے بڑا تعجب ہوا کہ یہ بے حس و حرکت پڑی ہے۔ اسے پاؤں کی ٹھوکر بھی لگائی لیکن وہ چیز جوں کی توں پڑی رہی۔ اس نے ہاتھ سے مٹی ہٹا کر اسے پکڑا تو ہمیانی[2] نکلی جو سونے کے دینار سے

بھری ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر بھوک اور پیاس ختم ہوگئی اور اعصاب میں نئی قوت پیدا ہوگئی، بلکہ جوانی لوٹ آئی۔ سوچنے لگا کہ میں کتنا خوش نصیب ہوں؟ یہ مال اپنے گھر والوں کے ہاتھوں میں تھماؤں گا تو وہ کس قدر خوش ہوں گے؟ وہ اس وقت حسین اور روشن مستقبل کی امید میں خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔

اچانک ایمانی حس بیدار ہوئی۔ دل میں القاء ہوا کہ یہ مال تیرا نہیں بلکہ لقطہ (گمشدہ) ہے۔ سال بھر اعلان کرنے کے بعد اس صورت میں حلال ہوگا جب اصل مالک نہ ملے۔ جب سال کی مدت اور اپنے رات کے کھانے کا تصور کیا تو قویٰ جواب دے گئے" کہ کیا خبر سال بھر زندہ بھی رہوں گا یا نہیں؟ اور یہ بھوکی، ننگی بیٹیاں کیا کھائیں گی، کیا پہنیں گی؟" خواہش پیدا ہوئی کہ تھیلی کو واپس اسی جگہ رکھ آئے اور آزمائش میں نہ پڑے لیکن بذات خود دانا عالم مومن تھا، جانتا تھا کہ اگر گمشدہ مال کو دیکھ کر ہاتھ نہ لگایا جائے تو کوئی ذمہ داری نہیں۔ اگر اسے پکڑ کر دوبارہ رکھ دیا جائے تو ذمہ داری رکھنے والے پر ہوگی۔ اس قسم کے تفکرات دماغ میں ٹکرانے لگے۔ اسے محسوس ہوا کہ کنپٹی کی ہڈیاں چور ہو رہی ہیں۔ ایک طرف یہ خیال اٹھتا کہ دبا رکھو، اللہ کا دیا ہوا رزق ہے اس کے ذریعے بھوکی ننگی بیوی اور بیٹیوں کا پیٹ بھرو اور ان کا تن ڈھانکو۔ اگر طاقت ہوئی تو پھر دے دینا ورنہ چند دینار کم بھی واپس کیے تو کیا فرق پڑے گا۔

دوسری طرف یہ خیال پیدا ہوا کہ صبر کر! اے بھلے آدمی! امانت میں خیانت کا ارتکاب نہ کر، قبر کے کنارے بیٹھ کر، مالک کی نافرمانی کا سوچتا ہے۔ چنانچہ پھر وہ اصل مالک کے ملنے تک ہمسائی گھر رکھنے چلا گیا۔ چوروں کی طرح گھر میں داخل ہوا تو اس کی بیوی نے دیکھ لیا اور پوچھا:

ابوغیاث کیسے آئے ہو اور کیا لائے ہو؟

جواب دیا: کچھ نہیں!

بوڑھا بزرگ ہمیانی کی خبر چھپانا چاہتا تھا جبکہ اس نے آج تک اپنی بیوی سے کوئی خبر چھپائی نہ تھی۔ بیوی نے کہا: واللہ آپ کے پاس کچھ ضرور ہے لیکن ہے کیا؟ بتادو نا۔

بوڑھا بزرگ ڈرا کہ لبابہ کہیں کسی وہم میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اسے سارا قصہ سنا دیا۔ وہ عورت دین دار ضرور تھی لیکن ابو غیاث کی طرح صبر اور حوصلے والی نہ تھی۔ کہنے لگی:

جاؤ اور کچھ خرید لاؤ کیونکہ ہم لاچار ہیں اور لاچار مسلمان پر مردار بھی حلال ہے!

ابو غیاث نے کہا: نہیں ہرگز نہیں۔ اگر تو نے اسے ہاتھ لگایا یا کسی کو خبر دی تو تجھے طلاق ہے۔

لبابہ خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہوگئی اور یہ اصل مالک کی تلاش میں گھر سے نکل پڑا تاکہ اصل مالک سے مل کر حلال طریقے سے کوئی درہم حاصل کر سکے۔ وہ حرم کی طرف چل دیا۔ حرم میں ایک نوجوان محمد بن جعفر طبری زیر تعلیم تھا۔ طبری بیان کرتا ہے کہ میں نے ایک خراسانی کو یہ اعلان کرتے ہوئے سنا:

''اے حاجیوں کی جماعت میری ہزار دینار سے بھری ہوئی تھیلی کہیں گم ہوگئی ہے جو کوئی اسے واپس کرے اللہ اسے دگنا ثواب دے گا۔''

ایک بوڑھا بزرگ اٹھا جو محمد بن جعفر کے موالی میں سے تھا، کہنے لگا:

اے خراسان کے رہنے والے نوجوان! ہمارا ملک پسماندہ ہے، حالات ابتر ہیں۔ شاید آپ کی ہمیانی کسی خوف خدا رکھنے والے انسان کو مل گئی ہو؟ آپ اس کے لیے انعام کا اعلان کر دیں۔ جسے لے کر وہ باقی واپس کر دے۔

نوجوان خراسانی نے پوچھا ہاں بھئی کتنا انعام؟

ابوغیاث نے کہا سو دینار یعنی دسواں حصہ!

نہ بھئی نہ۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں معاملہ اللہ پر چھوڑتا ہوں۔ دونوں جدا ہوکر اپنی اپنی منزل پر چلے گئے۔

طبری کہتے ہیں: میرے دل میں آیا کہ وہ ہمیانی ضرور اسی شیخ کو ملی ہوگی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے گا۔ وہ بوڑھا ایک خستہ حال مکان میں داخل ہوا اور یوں گویا ہوا:

لبابہ کہاں ہے؟

حاضر ہوں ابوغیاث! لبابہ بولی

میں نے ایک شخص کو اس ہمیانی کی تلاش میں پھرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ تو اس کے واپس کرنے والے کے لیے سو (۱۰۰) دینار انعام کا اعلان کردے لیکن وہ نہیں مانتا۔ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ میرا ارادہ تو ہمیانی واپس کرنے کا ہے۔

لبابہ نے کہا ابوغیاث! ہمیں تیرے ساتھ پچاس سال فقر و فاقہ میں گزارنے پڑے ہیں۔ تیری چار بیٹیاں، دو بہنیں، ایک ساس اور آٹھویں میں ہوں۔ ابو غیاث! اللہ بڑا مہربان ہے۔ اس کی شان اس امر سے بلند ہے کہ ایسے آدمی کو عذاب کرے جو ان کا واحد کفیل ہو۔ تو نے نہ تو چوری کی ہے نہ ڈاکہ ڈالا ہے۔ یہ مال تو اللہ نے تیرے سامنے رکھا ہے تو اسے کیوں ٹھکرا رہا ہے۔ کیا اللہ تجھ سے ان عورتوں کے متعلق سوال نہ کرے گا؟

طبری کہتے ہیں کہ میں نے بوڑھے کے چہرے کو بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کا دل ان بھوکی ننگی بیٹیوں اور مسکین ام لبابہ پر آنسو بہا رہا ہے، کیونکہ فاقوں کی بدولت ان کا چمڑا ہڈیوں پر خشک ہو رہا تھا اور وہ دیمک خوردہ لکڑی کی طرح کھوکھلے

بدن میں سانس لے رہی تھیں۔

اسکے دل میں آیا کہ کچھ دینار خرچ کرلوں، لیکن فوراً یاد آیا کہ پچاس سال صبر سے گزار دیئے اور آج جبکہ ٹانگیں قبر میں لٹکی ہوئی ہیں تو پچاس سال کے صبر کو ایک دن کی لذت پر کیوں قربان کروں اور پھر اللہ تعالیٰ میرے اہل عیال پر رحم کرے گا، دل کو حوصلہ دے کر بولا:

میں ایسا نہیں کروں گا، چھیاسی سال بعد اپنی لاش کو قبر میں نہیں جلاؤں گا۔

طبری کہتے ہیں کہ اسکے بعد میاں بیوی خاموش ہوگئے اور میں واپس چلا گیا۔

مغرب کی اذان ہوئی تو بوڑھا بزرگ دن بھر کے کمائے ہوئے چند ٹکڑوں پر اہل و عیال سمیت افطار کرنے بیٹھ گیا۔ باقی لوگ انواع و اقسام کے عمدہ عمدہ کھانوں سے مزے لے رہے تھے اور اس بات کا ذرا احساس نہ تھا کہ رمضان المبارک ایثار اور سخاوت کا مہینہ ہے اور اللہ نے بھوکا پیاسا رکھنے کے لیے روزے فرض نہیں کئے تھے بلکہ اس لیے کہ مسلمان وقتی اور اختیاری بھوک کے ذریعے محسوس کریں کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو بھوک پر مجبور ہیں۔ ان کی حالت پر غور کرکے، اپنے اوپر اللہ کے بے پایاں احسان یاد کریں۔ جو لوگ عمدہ عمدہ کھانوں سے پیٹ بھر کر مست ہو جاتے ہیں اور ان کے ہمسائے بھوک سے سیدھے کھڑے بھی نہ ہوسکیں تو ایسے لوگوں کا کوئی ایمان اور کوئی روزہ قبول نہیں اور نہ یہ لوگ روزے کی حقیقت ہی سمجھ سکتے ہیں۔ فرمان رسول ﷺ ہے:

((مَا آمَنَ بِیْ مَنْ بَاتَ شَبْعَانٌ وَجَارُهٗ جَائِعٌ اِلٰی جَنْبِ وَهُوَ یَعْلَمُ))

"وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا جس نے سیر ہوکر رات گزاری اور اس کا پڑوسی اس کے پڑوس میں بھوکا لیٹا رہا اور وہ اس کے فاقہ سے خبردار بھی تھا۔"

عادت احساس کو کمزور کر دیتی ہے۔ جب انسان حیوانوں کی طرح بلا ناغہ نعمتیں کھاتا رہے تو اسے نعمتوں کی قدر نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر روزے اس لیے فرض کیے ہیں کہ وہ محدود وقت کی محرومی کی کڑواہٹ سے امیری کی مٹھاس کی قدر کریں اور دن کی بھوک اور پیاس سے روٹی کے لقمے اور پانی کے گھونٹ کی قیمت معلوم کریں اور تمام عمر اللہ تعالیٰ کے احسان کو نہ بھولیں۔ اگرچہ وہ عام ہی کیوں نہ ہوں۔ حضرت ابراہیم حربیؒ ہر روز روٹی کا ایک لقمہ بچا کر رکھتے اور ہفتے بعد وہ ٹکڑے خود کھا لیتے اور روٹی صدقہ کر دیتے تھے۔

بوڑھا بزرگ یہی سوچتا رہا اور مسلمانوں کی حالت پر کڑھتا رہا پھر کہتا اللہ تعالیٰ ہی نیکی کا الہام کرنے والا اور روزی تقسیم کرنے والا ہے۔ اس نے رات بھی فاقہ میں گزاری اور کھجوریں اور ٹکڑے بوڑھی ساس اور بچیوں میں تقسیم کر دیئے۔

......☆......

طبری کہتے ہیں کہ اگلے دن خراسانی حرم میں پھر وہی صدا لگا رہا تھا کہ کوئی میری ہزار دینار والی ہمیانی واپس کر دے تو اللہ تعالیٰ اسے دگنا اجر دے گا!

بوڑھا بزرگ اس کی خدمت میں عرض کرنے لگا: اے نوجوان! میں نے تجھے کہا تھا کہ ہمارا ملک بے آب و گیاہ ہے، وسائل زندگی کم ہیں۔ شاید وہ ہمیانی کسی خوف خدا رکھنے والے کو مل جائے، تو انعام کے لالچ میں واپس کر دے۔ چلو سو دینار نہ سہی تو دس دینار ہی کا اعلان کر دے۔

اس نے کہا ہرگز نہیں بلکہ میرا اور ہمیانی اٹھانے والے کا فیصلہ قیامت کو اللہ تعالیٰ کے سامنے ہوگا۔ اس کے بعد دونوں پھر جدا ہو گئے۔

......☆......

تیسرا دن ہوا تو خراسانی نوجوان پھر حرم میں وہی صدا لگا رہا تھا اور وہی بوڑھا

بزرگ کھڑا ہوا اور کہنے لگا! اے نوجوان! تو نے سو دینار دینے کا اعلان کرنے سے انکار کر دیا، پھر دس دینار انعام سے بھی انکار کر دیا، تو آج ایک دینار کا ہی اعلان کر دے۔ شاید کہ ہمیانی اٹھانے والا، اس حلال دینار کے لالچ میں واپس کر دے اور نصف دینار سے کھانا خرید لے اور نصف دینار سے مشک خرید کر اس سے حاجیوں کو اجرت پر پانی پلایا کرے۔

خراسانی نے کہا نہیں بلکہ میں اس قضیے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑتا ہوں۔

بوڑھے بزرگ کی امید کا آخری سہارا بھی ختم ہو گیا اور سوچنے لگا کہ ابھی تو ہزار دینار ہاتھ میں ہیں۔ سارا نہ سہی تو ایک دینار ہی رکھ لوں کہ بھوکے ننگے پیٹوں کا سامان کر لوں لیکن دینی جذبہ موجزن ہوا اور وہ یوم الحساب کے خیال سے ڈر گیا۔ سوچا کہ پچاس سال کے صبر کو ایک دن کی لذت پر قربان کر دینا سراسر گھاٹا نہیں تو اور کیا ہے؟ کیونکہ تمام عمر کی لذتیں آخر کار جہنم کے ایک جھونکے سے بھول جائیں گی اور ساری عمر کی محرومیاں جنت کے ایک دیدار سے کافور ہو جائیں گی۔ حدیث میں آیا ہے کہ ((مَنْ تَرَکَ شَيْئًا عَوَّضَهُ اللّٰهُ خَيْرًا مِنْهُ)) یعنی جس نے اللہ کے ڈر سے کوئی ناجائز کام چھوڑ دیا ہو، اللہ تعالیٰ اس کے بدلے حلال چیز کئی گنا زیادہ عطا کرے گا۔

اب ابوالغیاث نے خراسانی نوجوان سے کہا: ”آؤ اور اپنی ہمیانی لے جاؤ۔“

طبری کہتے ہیں کہ میں نے ان کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ جب دونوں گھر کے دروازے پر پہنچے تو شیخ اندر داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد باہر آیا اور خراسانی نوجوان کو اندر لے گیا۔ میں بھی ان کے ساتھ اندر چلا گیا۔ شیخ نے اندر جا کر محفوظ جگہ سے ہمیانی نکالی اور نوجوان سے کہا کیا تیری ہمیانی یہی ہے؟

نوجوان نے کہا: ”ہاں۔“

پھر بوڑھے بزرگ نے ہمیانی کا سر کھول کر دینار دامن میں پلٹے اور گنے تو پورے ہزار نکلے پھر کہا یہ تیرے ہیں۔

لبابہ اور اس کی بیٹیاں یہ منظر دروازے کے سوراخ سے دیکھ رہی تھیں جیسے بھوکا دیگ کی طرف دیکھتا ہے اور صرف چند لقموں کی تمنا کرتا ہے۔

خراسانی نے دیناروں والی تھیلی کندھے پر رکھ لی اور اسکے اوپر چادر اوڑھ کر چل دیا۔

لبابہ نے یہ منظر دیکھا تو یوں چکرائی جیسے کسی عورت کا اکلوتا بیٹا گم ہو گیا ہو۔ اس کی بیٹیوں کی باچھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

چند لمحوں بعد شیخ نے آہٹ سنی تو نظر اٹھا کر دیکھا کہ نوجوان واپس لوٹ آیا ہے۔ اگر یہ بوڑھا بزرگ اس سے روگردانی کر لیتا تو یہ بڑی بات نہ تھی کیونکہ اس نے ان بھوکے ننگے مسکینوں کو دیکھ کر ایک دینار تک نہ دیا کہ وہ اپنی بھوک دور کر سکیں۔ لیکن یہ بوڑھا بڑا بردبار اور حوصلے والا شخص تھا فوراً بولا بیٹے کیسے آنا ہوا؟

خراسانی نوجوان نے جواب دیا:

اے میرے بزرگ! میرا باپ جب فوت ہوا تو اس کے پاس تین ہزار دینار تھے۔ اس نے مجھے وصیت کی تھی کہ میری سواری بیچ کر حج کا خرچ بنا لینا اور ہزار دینار اس شخص کو دے دینا جو بہت زیادہ غریب ہو۔ چنانچہ میں نے اپنے وطن خراسان سے مکہ تک کسی کو تجھ سے زیادہ غریب نہ پایا۔ لو یہ دینار اللہ ان میں تمھارے لیے برکت کرے۔

طبری کہتے ہیں کہ وہ نوجوان ہمیانی رکھ کر واپس چلا گیا۔ یہ منظر دیکھنے کے بعد میں بھی واپس جا رہا تھا کہ مجھے کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہی بزرگ میرے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اس نے مجھے اپنی طرف بلا کر کہا: تجھے

ہمارے معاملے کی خبر ہوگئی ہے اور میں نے احمد بن یونس یربوعی سے سنا اور انہوں نے نافع سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سنا کہ رسول مقبول ﷺ نے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے فرمایا تھا: ”جب کوئی ہدیہ بن مانگے اور بلا طمع آئے تو اسے واپس نہ لوٹاؤ ورنہ اللہ کے ناشکرے بن جاؤ گے۔“ آؤ ہدیہ میں سب حاضرین شریک ہوتے ہیں۔ چلو میرے ساتھ چلو۔

......☆......

طبری کہتے ہیں کہ میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔ اس بزرگ نے مجھے راستے میں کہا۔ بھئی تو بڑا مبارک ہے۔ میں نے عمر بھر ایسا مال نہیں دیکھا تھا اور نہ دیکھنے کی امید تھی۔ تم میری یہ قمیص دیکھ رہے ہو۔ میں اس میں قیام اللیل کرتا ہوں، پھر فجر کی نماز ادا کر کے اتار دیتا ہوں، تاکہ میری بیوی اور بچیاں اور بہنیں باری باری اس میں نماز ادا کر سکیں۔ پھر میں پہن کر ظہر اور عصر کے درمیان مزدوری کر کے چند کھجوریں اور روٹی کے ٹکڑے خرید کر گھر لوٹتا ہوں۔

جب ہم گھر پہنچے تو بزرگ نے بلند آواز میں پکارا: لبابہ اور فلاں فلاں! اس بزرگ کی آواز سن کر اس کی بہنیں، ساس اور بیٹیاں اکٹھی ہوگئیں۔ اس نے ان سب کو دائرے میں بٹھا کر مجھے بائیں جانب بٹھالیا اور ہم سب سے کہا اپنے اپنے دامن پھیلاؤ۔ چنانچہ میں نے تو قمیص دامن پھیلا دیا لیکن باقی سب نے ہاتھ پھیلائے کیونکہ ان کی قمیصیں پھٹی ہوئی تھیں، وہ ایک ایک دینار ہر ایک کے ہاتھ پر رکھتا جاتا اور دسواں دینار مجھے دیتا رہا۔ یہاں تک کہ ہمیانی خالی ہوگئی اور ہم سب کو سو سو دینار ملے۔

......☆......
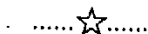
مغرب کی اذان ہوئی تو اس بزرگ کے اہل خانہ بھی عمدہ عمدہ کھانوں کے ارد

گرد بیٹھ گئے۔ بوڑھے بزرگ نے اپنی بیوی لبابہ سے کہا:

لبابہ! دیکھ لیا تو نے، اللہ صبر کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ ہم نے اپنے آپ کو حرام کے ایک دینار سے بچایا تو اللہ تعالیٰ نے ہم کو حلال کے ذریعے سے ہزار دینار عطا کیے۔

یہ بزرگ چند لقمے کھا کر اٹھ کھڑا ہوا اور باہر جانے لگا تو لبابہ نے کہا: "کہاں جا رہے ہو ابو غیاث؟"

"میں کسی فقیر روزہ دار کو تلاش کرنے جا رہا ہوں تاکہ اسے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرلوں۔" یہ کہہ کر بزرگ دروازے سے باہر نکل گئے۔

طبری کہتے ہیں مجھے اللہ تعالیٰ نے ان سے بڑا نفع دیا۔ ان سے میں اپنی خوراک حاصل کرتا رہا۔ سولہ سال بعد مکہ آیا تو معلوم ہوا کہ وہ لڑکیاں شہزادوں سے بیاہ دی گئی ہیں اور شیخ چند ماہ بعد فوت ہو گیا تھا۔ میں ان کے خاوندوں اور بچوں کے پاس جاتا اور انھیں ہمیانی والا قصہ سناتا۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتے اور میری بڑی عزت کرتے۔ پھر چالیس سال بعد پتہ چلا کہ ان میں سے اب کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔ رہے نام اللہ کا۔ اللہ تعالیٰ سب پر رحم فرمائے! آمین!

......☆......

[1] مآخذ مخطوطة المكتبة العربية دمشق مروية عن الطبري بالسند المتصل

[2] ہمیانی: بیلٹ کی طرح بنی ہوئی چرمی تھیلی جس میں درہم و دینار ڈال کر اسے کمر کے گرد باندھ لیا جاتا ہے۔

بے مثال وفاداری[1]

مامون الرشید کے انسپکٹر جنرل پولیس عباس بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں امیر المومنین مامون الرشید کے ایوان خاص میں داخل ہوا تو انہوں نے پکارا: عباس!

(میں نے کہا) لبیک یا امیر المومنین۔

''اسے لے جاؤ اور علی الصبح میرے دربار میں پیش کرنا۔''

کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص بیڑیوں، ہتھکڑیوں اور زنجیروں سے جکڑا ہوا بے حس وحرکت پڑا ہے۔ چنانچہ میں نے ماتحت پولیس ملازمین کو اسے حراست میں رکھنے کا حکم دیا۔ وہ اسے اٹھا کر حوالات کی طرف چلنے لگے۔ معاً مجھے خیال آیا کہ امیر المومنین نے جس غیظ وغضب اور سختی سے اسے حراست میں رکھنے اور علی الصبح پیش کرنے کا حکم دیا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ میں اسے پولیس ملازمین کے سپرد کرنے کی بجائے گھر میں اپنی نگرانی میں رکھوں۔ چنانچہ میرے حکم کے مطابق ملازمین اسے میرے گھر میں نظر بند کر کے چلے گئے۔ پہر رات گزرنے کے بعد میں نے اسے بلایا اور اس سے پوچھا: تو کون ہے؟ تیرا نام کیا ہے؟ تو کہاں کا رہنے والا ہے اور تیرا قصور کیا ہے؟

قیدی: میں دمشق کا رہنے والا ہوں۔

عباس: اللہ رب العزت دمشق اور اس کے اندر رہنے والوں کو خیریت سے رکھے۔ تم کون سے قبیلے اور کس گھرانے سے تعلق رکھتے ہو؟

قیدی: تم کس کس قبیلے اور کون کون سے گھرانے کو جانتے ہو؟

عباس: تو فلاں قبیلے کے فلاں آدمی کو جانتا ہے؟

قیدی: جب تک آپ مجھے اس آدمی سے اپنی دلچسپی کا سبب نہ بتائیں گے اس وقت تک میں آپ کو اس کے متعلق کچھ نہیں بتاؤں گا۔

عباس: اس آدمی سے میری دلچسپی کا سبب سنو۔ میں کسی دور میں گورنر دمشق کا افسر تھا۔ وہاں کے لوگوں نے گورنر کے خلاف بغاوت کر دی۔ معاملے کی سنگینی دیکھ کر گورنر دمشق پنجرے میں لٹک کر قلعے سے اترا اور اپنے ساتھیوں سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ان فرار ہونے والوں میں میں بھی تھا۔ مجھے پکڑنے کے لیے میرے پیچھے لوگوں کا جتھا مسلسل دوڑ رہا تھا۔ البتہ میں انتہائی تیز رفتاری سے دوڑتا ہوا، ان کی دسترس سے باہر ہو کر، ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اسی دوران میں اس آدمی کے گھر کے سامنے سے گزرا تو اس سے درخواست کی: ''میری مدد فرمائیے اللہ آپ کی مدد فرمائے گا۔''

اس نے مجھے اپنے محل نما مکان میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ جب میں داخل ہوا، تو اس کی بیوی نے مجھے فوراً مقصورہ (میاں بیوی کا خاص حجرہ) میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ اسی دوران مجھے مکان کے گیٹ پر لوگوں کا شور وغل سنائی دیا، جو مالک مکان سے کہہ رہے تھے کہ واللہ وہ شخص تیرے گھر میں داخل ہوا ہے۔ اس نے کہا تلاشی لے لو۔ چنانچہ لوگ اندر داخل ہو گئے اور انہوں نے مقصورہ کے علاوہ باقی گھر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ پھر وہ آپس میں مشورہ کر کے کہنے لگے کہ وہ اس مقصورہ میں ہو گا۔ تو مارے خوف کے میری ٹانگیں کپکپانے اور دل پھڑ پھڑانے لگا۔ اس کی بیوی نے جو کہ میرے پاس کھڑی تھی، جرأت کی اور انھیں سخت سست کہا۔ جس کی وجہ سے انھیں اندر داخل ہونے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ باہر نکل گئے۔ مجھ پر ایسا خوف اور وحشت طاری ہو رہی تھی کہ میری ٹانگیں میرا بوجھ برداشت کرنے سے جواب دے گئیں۔ وہ آدمی باہر دروازے پر کھڑا ہو گیا اور اس کی بیوی مجھے حوصلہ دینے لگی: ''ڈرو نہیں، آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے شر سے محفوظ کر لیا ہے۔ اب

آپ امن وسکون سے رہیں۔" جس پر میں نے ان کو ڈھیروں دعائیں دیں۔

اس کے بعد وہ اللہ کا بندہ مجھ پر مسلسل لطف وکرم اور محبت ومودّت کے یادگار موتی برساتا رہا یہاں تک کہ اس نے میرے اندر سے بیگانگی کا احساس ختم کر دیا۔ اس نے مجھے اپنے محل میں ایک الگ مکان دے دیا۔ ضروریات زندگی اتنی وافر مقدار میں مہیا کیں اور صبح وشام میری ایسی خبر گیری کی کہ میں تمام دکھ بھول گیا۔ چنانچہ میں نے اس کے ہاں زندگی کے بہترین چار ماہ گزارنے کے بعد اس سے ان لفظوں میں اجازت طلب کی: "اب فتنہ دب گیا ہے اور شہر پرسکون ہے۔ میں اپنے غلاموں کو تلاش کرلوں۔"

چنانچہ اس نے واپس آنے کا وعدہ لے کر اجازت دے دی۔ میں شہر گیا اور غلاموں کا پتہ نہ پا کر واپس آ گیا۔ اس دوران میری بے مثال اور انتھک خدمت کرنے کے باوجود اس نے نہ میرا نام پوچھا، نہ پتہ، نہ عہدہ، بلکہ وہ مجھے میری کنیت سے بلاتا رہا۔

ایک روز میں نے اس سے بغداد جانے کی اجازت مانگی تو اس نے بخوشی اجازت دینے سے قبل مجھ سے کہا کہ میں بغداد جانے والے قافلے کا پتہ کر آؤں اور جس روز وہ روانہ ہو، اس روز آپ کو الوداع کہوں۔ پھر میں نے اس سے عہد کیا کہ اتنی مدت کے حسن سلوک اور ہمدردی کی بنا پر میں تیرے ساتھ عہد کرتا ہوں، کہ زندگی بھر آپ کے اس احسان کو نہ بھولوں گا اور حسب طاقت اس کا بہترین صلہ دوں گا۔

اس کے بعد اللہ کے اس نیک بندے نے اپنے غلام کو سفر کے لیے گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا اور خود سامان سفر تیار کرنے میں لگ گیا۔ میں نے سمجھا کہ وہ خود کہیں جانے کا پروگرام بنا رہا ہے لیکن سارے دن کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ رات کو بمشکل سویا ہوگا اور علی الصبح مجھے خبر دی کہ آج قافلہ بغداد روانہ ہونے والا ہے۔ اٹھو اور تیاری کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ اکیلے جائیں۔ اس دن نہ تو میرے پاس سواری تھی نہ زادراہ۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ وہ شریف انسان میرے لیے اعلیٰ اور نفیس ملبوسات اور نئے

جوتوں کا جوڑا لایا۔ تلوار اور پیٹی لا کر میری کمر سے باندھ دی، پھر اعلیٰ نسل کے خچر پر دو بھرے ہوئے بکس رکھ کر ان پر بستر باندھ دیا۔ مجھے گھوڑے پر سوار کر کے ایک غلام بھی ساتھ دیا تا کہ وہ راستہ میں خدمت بجا لائے۔ وہ اور اس کی بیوی چند فرلانگ تک مجھے الوداع کہنے کے لیے میرے ساتھ آئے اور مجھ سے میری خدمت میں کسی بھی قسم کی کوتاہی کی معذرت کرنے لگے۔ سچ پوچھو تو اس وقت میرا دل رونے لگا، آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، میں نے ڈبڈباتی آنکھوں سے انھیں واپس بھیجا اور کئی دنوں کا سفر طے کرنے کے بعد بغداد پہنچا اور امیر المومنین کی خدمت کی بنا پر اس کا پتہ لینے سے قاصر رہا۔ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ شاید میں اس احسان کا بدلہ دے سکوں۔

قیدی: اللہ رب العزت نے تجھے اس حسن سلوک کا بدلہ دینے کا سنہری موقعہ عطا کیا ہے۔

عباس: وہ کیسے؟

قیدی: اللہ کے نیک بندے وہ شخص میں ہی تھا اور میرے اس حال نے تجھ پر میری شناخت مشکل بنا دی ہے۔

یہ سن کر عباس کا دل قابو سے باہر ہو گیا۔ وہ دیوانہ وار اٹھا اور بیڑیوں سمیت اسے اٹھا کر سینے سے لگا کر اس کے سر کو بوسے دینے لگا اور پوچھا: آپ اس نوبت تک کیسے پہنچے؟

قیدی: دمشق میں تمھارے دور جیسا فتنہ برپا ہوا اور اس کا الزام میرے سر دھر دیا گیا۔ گرفتار کر کے اس قدر تشدد کیا گیا کہ مجھے زندگی کی امید نہ رہی۔ پھر مجھے زنجیروں میں جکڑ کر یہاں امیر المومنین کے دربار میں پیش کر دیا گیا۔ ان کے ہاں میرا جرم اس قدر بھیانک ہے کہ وہ لامحالہ مجھے قتل کرا دیں گے۔ جس حال میں میری گرفتاری عمل میں آئی۔ اس نے مجھے وصیت کرنے کا بھی موقعہ نہ دیا۔ میرے پیچھے میرا غلام آیا ہوا ہے اور وہ بغداد میں میرے ملنے والوں کے گھر میں موجود ہے، تا کہ وہ میرے گھر والوں کو میرا حال بتا سکے۔ اگر آپ اس احسان کا بدلہ دینا چاہتے ہیں تو اسے بلایئے، تا کہ میں موت سے پہلے

اسے وصیت کر سکوں۔ اگر آپ نے ایسا کر دیا تو عہد وفا پورا ہو گیا۔

عباس: اللہ خیر کرے گا!

پھر عباس نے راتوں رات لوہار کو طلب کر کے اس کے ہاتھ پاؤں سے زنجیر، طوق اور بیڑیاں کٹوائیں۔ گھر کے حمام میں غسل کرایا اور اسے عمدہ لباس پہنا کر اس کے غلام کو بلوایا۔ جب غلام گھر میں داخل ہوا تو دمشقی آقا اپنے غلام کو دیکھ کر رونے لگا اور وصیت کر دی۔ پھر عباس نے اپنے نائب کو بلا کر ہدیے لانے اور گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا تاکہ اسے انبار تک چھوڑ آئے۔

قیدی: عباس! دیکھو امیر المومنین کے ہاں میرا جرم نہایت بھیانک ہے۔ اگر میں فرار ہو بھی گیا تو وہ مجھے اپنے لاؤ لشکر کے ذریعے پکڑ لیں گے اور قتل کرا دیں گے۔

عباس: تم نجات پاؤ اور مجھے اپنے کام کی تدبیر کرنے دو۔

قیدی: واللہ! میں بغداد سے باہر نہیں جاؤں گا اور مسلسل تیری خبر رکھوں گا۔ اگر معاملہ کٹھن ہوا تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔

عباس: چلو اگر تمھارا ارادہ یہی ہے تو بغداد کے فلاں محلے میں ٹھہرو۔ اگر میں سلامت رہ گیا تو خبر کر دوں گا ورنہ خود قتل ہو کر آپ کے احسان کا بدلہ چکا سکوں گا۔

پھر عباس نے اپنے متعلق سوچنا شروع کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ موت یقینی ہے کفن تیار کر لیا جائے اور غسل کر کے حنوط لگایا جائے۔ چنانچہ اس نے طلوع فجر سے پہلے غسل کیا اور حنوط لگا کر کفن تیار کر لیا۔ نماز فجر سے فارغ ہوتے ہی امیر المومنین کا حکم آیا کہ آدمی کو لے کر ایوان شاہی پہنچو۔ جب عباس وہاں پہنچا تو امیر المومنین نے پوچھا: عباس! مجرم کہاں ہے؟

عباس کی خاموشی پر انہوں نے کہا:

افسوس تجھ پر، اگر تو نے کہا کہ وہ فرار ہو گیا ہے، تو تیرا سر قلم کرا دوں گا۔

عباس: نہیں امیر المومنین ہرگز وہ فرار نہیں ہوا، بلکہ آپ تھوڑی دیر کے لیے میرا اور

اس کا قصہ سن لیجئے اور پھر جو جی میں آئے کر گزریئے۔

اس کے بعد انسپکٹر جنرل عباس نے اپنی اور اس کی مکمل روئیداد سنائی اور عرض کیا اگر آپ مجھ سے درگزر فرمائیں تو میں نے اس محسن سے حق وفا ادا کر دیا۔ اگر آپ مجھے اس پاداش میں قتل کرنا چاہتے ہیں تو میں غسل کر کے حنوط استعمال کر چکا ہوں اور میرا کفن میری بغل میں ہے۔

مامون: اللہ تجھے تیرے احسان کی جزا نہ دے، تیرا احسان بھلا کب اس کے درجے کو پا سکتا ہے، کیونکہ تو نے پہچاننے کے بعد احسان کیا اور اس نے بغیر جانے پہچانے تجھ پر احسان کیا۔ مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ تیری طرف سے میں خود اس کے احسان کا بدلہ دیتا۔

عباس: امیر المومنین وہ ابھی دارالحکومت بغداد میں موجود ہے تاکہ میرے معاملے کی خبر رکھے۔ اگر مجھے اپنی جان کا خطرہ درپیش ہو تو وہ میری جگہ پیش ہو کر اپنی گردن کٹوا دے۔

مامون: یہ اس کا تجھ پر دوسرا احسان ہے جو پہلے سے بھی بڑا ہے۔ جا اور اسے میرے پاس لا تاکہ تیرے اوپر ہونے والے احسان کا صلہ میں خود ادا کروں۔

چنانچہ عباس اس کے پاس گیا اور خوشخبری سنائی کہ آپ کا خوف دور ہونا چاہئے۔ امیر المومنین نے یوں کہہ کر آپ کو طلب کیا ہے۔ اس نے کہا: الحمد للہ! شکر ہے اس ذات کا جس کے سوا تنگیوں اور مشکلات کو کوئی دور نہیں کر سکتا۔ وہی حمد کے لائق ہے۔ پھر وہ سوار ہو کر امیر المومنین کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے اپنے پاس بٹھا کر گفتگو کی اور اس کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ پھر اسے دمشق کی گورنری پر متعین کرنا چاہا جسے اس نے شکریے کے ساتھ نامنظور کیا۔ اس کو خلعت فاخرہ دے کر الوداع کیا گیا اور ہارون الرشید نے دمشق کے گورنر کو اس سے حسن سلوک کا حکم دیا۔

[1] ماخذ المطالعة العربية (مطبوعہ مدینہ منورہ)

قابل رشک شوق علم [1]

محمد بن سعید: ہوسٹل والے! اللہ کا خوف کر۔ کہیں اس صالح انسان کو مار نہ ڈالنا اور اس کا خون اپنے سر نہ لینا۔ اسے اپنے ہوسٹل سے نہ نکالنا۔ یہ بیچارہ علم کی پیاس بجھانے کے لیے تلاطم خیز سمندروں اور لق و دق صحراؤں کو عبور کر کے مغرب سے مشرق کی طرف آیا ہے۔

ہوسٹل والا: کیا یہ شخص (بقی بن مخلد) مغرب سے مشرق کی طرف آیا ہے؟

محمد بن سعید: ہاں کیا خیال ہے کہ میں کسی اور کا نام لے رہا ہوں؟ دیکھئے میں پہلی دفعہ آپ سے کسی کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔ اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ مجھے خالی نہ لوٹانا۔ یہ عظیم رتبے والا شخص ہے۔ علم حدیث حاصل کرنے اور سنن رسول ﷺ روایت کرنے آیا ہوا ہے۔ کیا ہم اسے سر راہ مرنے کے لیے چھوڑ دیں؟

ہوسٹل والا: میں کیا کروں؟ میں نے اسے دو سال سے اپنے ہاسٹل میں رکھا ہے، نہ اس سے کرایہ لیتا ہوں، نہ اسے کسی چیز کی کمی آنے دیتا ہوں اور نہ اس کی نافرمانی ہی کرتا ہوں۔ کیا مجھے اس کا یہی صلہ ملے گا کہ یہ پردیسی یہیں مر جائے اور ہوسٹل سے سیدھا قبرستان کی طرف جائے۔ لوگ میرے ہوسٹل کو منحوس سمجھنا شروع کر دیں اور پھر کبھی یہاں آنے کا نام نہ لیں۔ اس طرح تو میں کنگال ہو جاؤں گا! یہ مریض انسان ہے۔ اسے مختلف بیماریوں نے لاغر کر

دیا ہے۔اسے بخار نے اٹھنے کے قابل نہیں چھوڑا۔
حکیموں کے سفوف اسے ٹھیک کرنے سے عاجز آ گئے ہیں اور یہ آج یا کل ختم ہونے کو ہے۔ مجھ پر رحم کرو اور مجھے اس سے بچاؤ۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ گواہ ہے کہ مجھ سے بھول ہو گئی جو میں نے اسے یہ فلیٹ کرایہ پر دے دیا تھا۔

محمد بن سعید: شریف آدمی! ذرا ہاتھ ہولا رکھ۔ اگر تجھے اس نعمت کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے تو، ساری رات اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرنے میں گزار دے۔ تو جانتا ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کتنی بڑی نعمت تیرے ہوٹل میں بھیج دی اور کتنا ثواب تیرے نامہ اعمال میں لکھ دیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت سے اس کی خدمت کر، میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس کے بدلے جنت عطا فرمائے گا۔

ہوٹل والا: صاحب! آپ میری پریشانی کا اندازہ نہیں کر رہے، اگر آپ کو اندازہ ہو جائے تو واللہ مجھے ہرگز ملامت نہ کریں۔ یہ شخص روزانہ پھٹی پرانی گودڑی پہن کر، ہاتھ میں لاٹھی اور کاسہ گدائی لے لیتا ہے۔ لوگوں سے بھیک مانگنے چلا جاتا ہے اور شام کو واپس آتا ہے..... ہنستے کیوں ہو ابن سعید؟ میں کوئی مذاق کر رہا ہوں۔

محمد بن سعید: نہیں نہیں، لیکن تجھے اصل حقیقت کا علم ہی نہیں۔

ہوٹل والا: کونسی حقیقت؟

محمد بن سعید: یہ آدمی اندلس کے پارک اور باغات، چشمے اور نہریں، محلات اور کوٹھیاں، مال و دولت اور جاہ و حشمت، دوست احباب اور خویش واقارب کو خیر باد کہہ کر، سمندروں اور دریاؤں کی تلاطم خیز موجوں سے مقابلہ کرتا ہوا

خشکی پر اترا اور لق و دق صحراؤں اور وسیع و عریض بیابانوں میں پیدل چلتا ہوا بغداد آ پہنچا۔ اسے نہ تو مال و دولت کی حرص تھی نہ جاہ و حشمت کی۔ کسی دوست کی ملاقات سے غرض تھی، نہ کسی عورت سے نکاح کی۔ بلکہ اس نے صرف اور صرف ابوعبداللہ احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو دیکھنے اور ان سے علم حدیث حاصل کرنے کے لیے یہ تکلیفیں اٹھائیں۔

جب ہوسٹل کے مالک نے ابوعبداللہ کا نام سنا تو اس کا دل مسرت سے جھومنے لگا۔ اس کی خوابیدہ عقیدت بیدار ہوگئی۔ اس گدا نما شائقِ علم کی ابوعبداللہ کے ساتھ محبت کی وجہ سے اس کا کینہ دور ہوگیا۔ اس نے نہایت شیریں اور نرم لہجے میں پوچھا۔

ہوسٹل والا: اچھا آپ فرما رہے ہیں کہ یہ شخص اندلس سے امام ابوعبداللہ احمد بن حنبل کی ملاقات کرنے آیا ہوا ہے؟

محمد بن سعید: جی ہاں!

ہوسٹل والا: واہ! اس شخص کو دنیا و آخرت کی خوشیاں مبارک ہوں! کیا اس نے ان سے ملاقات کر لی تھی؟ ذرا بتائیے کہ اس نے کس طرح ملاقات کی؟

محمد بن سعید: وہ تیرے ہوسٹل میں آیا اور اپنا ساز و سامان رکھ کر ابوعبداللہ رحمہ اللہ کا پتہ پوچھنے لگا۔ ان دنوں سخت گیری کی وجہ سے کوئی شخص ابوعبداللہ احمد بن حنبل کا نام بتانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ جو شخص یہ جسارت کر بیٹھتا، اسے خلیفۃ المسلمین کے جاسوس پکڑ لیتے اور عبرتناک سزا دیتے۔ اسے اس طرح کی بدسلوکی کی اطلاع سے، اس قدر صدمہ لاحق ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ یہ رصافہ کی جامع مسجد میں چلا گیا اور محدثین سے روایات سننے لگا۔ اس شوق میں اس نے بہت سے حلقوں سے خوشہ چینی کی۔ جب یہ ہمارے حلقے میں آیا

تو میں پہلا شخص تھا جس نے اسے مسافر اور غریب الدیار سمجھ کر سلام کیا۔ اس سے خیر و عافیت پوچھی تو اس نے مجھ سے پوچھا: یہ بزرگ کون ہیں؟

میں نے جواب دیا: یحییٰ بن معین!

اور یحییٰ بن معین سے کوئی طالب علم بھلا کس طرح بے خبر رہ سکتا تھا! چنانچہ یہ انھیں رجال حدیث پر جرح و تعدیل میں مصروف دیکھ کر تھوڑی دیر ٹھہرا رہا۔ جب حلقے میں ایک آدمی کی جگہ خالی ہوئی، تو وہاں جا کر کھڑا ہو گیا اور عرض کرنے لگا:

"اے ابوزکریا! اللہ تبارک و تعالیٰ آپ پر فضل و کرم فرمائے۔ میں غریب الدیار ہوں اور ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا مجھے جواب سے محروم نہ رکھیے گا۔"

شیخ نے فرمایا: پوچھیے!

چنانچہ اس نے جس جس محدث سے ملاقات کی تھی، ان کے متعلق شیخ سے پوچھنا شروع کیا تو شیخ نے بعض کی توثیق کی اور بعض پر جرح کی۔

چنانچہ اس نے ہشام بن عمار کے متعلق پوچھا۔ اس نے ان سے بہت سی روایات کا سماع کیا تھا۔ شیخ نے جواب دیا:

ابوالولید ہشام بن عمار، دمشق کے پیش امام، وہ ثقہ سے بھی اوثق ہیں۔ اگر ان کی چادر کے نیچے کبر بھی ہوتا تو انھیں نقصان نہ دیتا، کیونکہ وہ خیر و فضل میں لاثانی انسان ہیں۔

یہ سن کر حلقے والے چیخ اٹھے: اللہ آپ پر رحم فرمائے اتنی تعدیل ہی کافی ہے۔ اپنا سوال بدلیے، تو اس نے اپنے قدموں پر کھڑے کھڑے یہ سوال کر دیا کہ مجھے صرف ایک آدمی، احمد بن حنبل کے متعلق بتائیے کہ وہ کیسے انسان ہیں؟

یہ سن کر اہل حلقہ پر سناٹا طاری ہو گیا اور شیخ پر بھی سکتہ نمایاں ہونے لگا،

ابوزکریا نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ گویا وہ کہنا چاہتے ہوں کیا احمد کے متعلق بھی کوئی پوچھنے والا ہے؟ کیا تو اس کا نام لینے کی جرأت کر رہا ہے؟ گویا شیخ پر خوف طاری ہوا چاہتا تھا۔ مگر ان کا ایمان غالب آ گیا۔ انہوں نے سلطان کے غیظ و غضب کو پس پشت ڈال کر فرمایا: ''بھائی تیرا ملک کونسا ہے؟ ہم آپ کو احمد بن حنبل کا حال بیان کرتے ہیں۔'' شیخ لمحہ بھر خاموش ہوا اور پھر بڑی جرأت سے بولا: ''وہ مسلمانوں کے امام، ان سے بہتر اور افضل انسان ہیں۔'' یہ سن کر لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ اس بات سے خوف زدہ ہو گئے کہ مبادا انھیں سلطان وقت کے جلاد پکڑ کر لے جائیں۔

......☆......

اس کے بعد یہ مسافر لوگوں سے ابوعبداللہ کا گھر پوچھنے لگا، تو کچھ لوگ ڈر کی وجہ سے کنی کترا گئے، کہ کہیں یہ بادشاہ کا جاسوس نہ ہو اور ہم مارے جائیں۔ کچھ لوگ چند قدم ساتھ چل کر واپس لوٹ جاتے، اس طرح پوچھتا پوچھتا یہ ان کے گھر تک پہنچ گیا۔

ہوٹل والا یہ سن کر حیرت میں ڈوب گیا اور پوچھنے لگا: ''اس نے ان پر مصائب و آلام کے دنوں میں ملاقات کی؟''

جی ہاں! جب اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ابوعبداللہ نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے کہا: ''میں غریب الدیار (مسافر) ہوں اور بڑی دور سے آیا ہوں''

ابوعبداللہؒ نے فرمایا: ''خوش آمدید! کہاں سے آئے ہو؟''

''جی اندلس سے آیا ہوں۔''

فرمایا: ''افریقہ سے؟''

''نہیں جی، اس سے بھی دور دراز مقام سے، افریقہ جا کر تو میں سمندر کا سفر

شروع کرتا ہوں اور اسے عبور کر کے اپنے وطن پہنچتا ہوں۔

''اچھا یہ تو خاصا دور دراز مقام ہوا، مجھ سے کیا کام ہے؟''

آپ سے حدیث سننا اور روایت کرنا چاہتا ہوں۔

فرمایا:''جس طرح آپ نے دیکھا اور سنا کہ میں کسی سے ملاقات نہیں کر سکتا اور جو کوئی مجھ سے ملاقات کرے اسے پکڑ لیا جاتا ہے۔ آپ میرے پاس آئے ہیں، تو مجھے آپ کی سلامتی کا خطرہ ہے۔''

عرض کی:''آپ سے علم حدیث حاصل کرنے میں مجھے کسی عذاب اور دکھ کی پروا نہیں۔''

فرمایا:''اگر انہوں نے آپ کو روک دیا تو؟''

عرض کیا: میں ایک حیلے سے آجایا کروں گا۔ وہ یہ کہ میں گداگر کے روپ میں آکر صدا لگایا کروں گا: اَلْاَجْرُ یَرْحَمُکَ اللّٰہ...... ''مجھے خیرات دو اللہ آپ پر رحم فرمائے گا۔'' آپ دروازہ کھول کر مجھے احادیث سنا کر واپس چلے جایا کرنا۔

فرمایا: اچھا لیکن اس کا حلقہ والوں کو پتہ نہ چلے۔

عرض کی: بالکل پتہ نہ چلنے دوں گا۔

چنانچہ یہ روزانہ ایسا ہی کرتا تھا اور تو سمجھتا تھا کہ یہ لوگوں سے بھیک مانگنے جاتا ہے۔

ہوسٹل والے کے دل میں اس کی عظمت بڑھ گئی۔ گویا اس کے فلیٹ میں کوئی وزیر یا بادشاہ رہتا ہو۔

اس نے محبت بھرے انداز میں دہرا کر پوچھا: اچھا تو پھر یہ امام ابوعبداللہ احمد بن حنبل کا شاگرد ہوا نا!

جی ہاں، اور یہ اسی طرح علم حدیث حاصل کرتا رہا یہاں تک کہ امام احمد کی

آزمائش ختم ہوگئی اور ان سے پابندیاں اٹھالی گئیں۔ واثق کا بیٹا متوکل علی اللہ حکمران بن گیا۔اس نے اہل السنہ کا مذہب حقہ زندہ کیا اور بدعات کی کمر توڑ دی۔ امام احمد بن حنبل کو اللہ تعالیٰ نے صبر کا بدلہ عطا فرمایا اور ان کے ذریعے اپنے دین اسلام کی اس طرح حفاظت فرمائی جس طرح ارتداد کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مدد فرمائی تھی۔ آج الحمدللہ وہ اس امت کے مقتدیٰ اور پیشوا ہیں۔

وہ اس مسافر کی عظمت سے کما حقہ آگاہ ہیں۔ فرماتے ہیں کہ (یہ انسان حقیقی طالب علم ہے)

ہوسٹل کا مالک کہنے لگا: جزاک اللہ یا بن سعید خیرا

آپ نے اس انسان کا تعارف کرا کر مجھ پر احسان فرمایا، آؤ اس کے پاس چلیں اور اس کی تیمارداری کریں۔

حضرت بقی بن مخلد اس وقت اپنے کمرے میں وطن سے دوری اور پردیس میں بیماری کے صدمے سے نڈھال پڑے ہوئے تھے۔ جب کبھی ہوش میں آتے تو اپنے اردگرد بکھری ہوئی کتابوں سے دل بہلا لیتے اور جب بیماری کا غلبہ ہوتا تو کانپتے کراہتے ہوئے چٹائی پر لیٹ جاتے۔ چنانچہ یہ دونوں ان کے پاس گئے اور ان کی خیر و عافیت دریافت کرنے لگے۔ ابھی یہ تیمارداری کر ہی رہے تھے کہ ہوسٹل کے باہر عوام الناس کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی اور غلغلہ بلند ہونے لگا کہ وہ تشریف لے آئے۔ وہ تشریف لے آئے۔ انہوں نے باہر نکل کر دیکھا تو حد نگاہ تک بازار لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ دوکاندار اور خریدار جلوس کے پیچھے کشاں کشاں چلے آرہے ہیں۔ جب انہوں نے شاہراہ عام کے دونوں راستوں کے استقبالی ہجوم سے اس عظیم الشان جلوس کا سبب پوچھا، تو انہوں نے بتایا کہ امام ابو عبداللہ احمد بن حنبل اس ہوسٹل میں کسی بیمار مسافر کی مزاج پرسی کرنے تشریف لا

رہے ہیں۔ یہ سن کر ہوسٹل کے مالک پر شادی مرگ طاری ہونے لگی۔ زہے قسمت! آج میرے ہوسٹل میں وہ عظیم ہستی تشریف لا رہی ہے، جس کے دیدار کو حکمرانوں کی آنکھیں ترستی رہ جاتی ہیں۔ وہ مارے خوشی کے کبھی ادھر جاتا، کبھی ادھر اس کے دل میں مسرت وشادمانی کی موجیں اٹھنے لگیں اور وہ وفور شوق سے اپنی جگہ قرار نہیں پکڑ رہا تھا۔[2]

- جب امام ابوعبداللہ کمرے میں داخل ہوئے تو ہجوم پر سکون ہو کر بیٹھ گیا، سینکڑوں طلباء حدیث نے قرطاسیں اور دواتیں کھول لیں اور کان لگا کر بیٹھ گئے۔ آپ نے مزاج پرسی کے بعد فرمایا:

((يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَبْشِرْ بِثَوَابِ اللهِ ، اَعَلاكَ اللهُ اِلَى الْعَافِيَةِ و مَسَحَ عنك بِيَمِيْنِهِ الشَّافِيَةِ.))

طلبائے حدیث نے ان الفاظ کو اپنے رجسٹروں میں لکھ لیا، اور واپس چلے گئے۔ اس دن سے یہ ہوسٹل، ائمہ اور طلبائے حدیث کے ٹھہرنے کی جگہ قرار پایا۔ دن بھر ہزاروں افراد یہیں خوردونوش کرتے اور یہیں قیام کرتے۔ ہوسٹل کے مالک کے گھر میں مال و دولت کی ریل پیل ہوگئی اور امام بقی بن مخلد اندلسی کو اللہ تعالیٰ نے صحت وشفا عطا فرمائی اور وہ اپنے وطن کو علم سے روشن کرنے لگ گئے۔

......☆......

[1] یہ قصہ طبقات حنابلہ میں ہے، لیکن ہمارا ماخذ قصص من التاریخ ہے۔

طوائفوں کی توبہ[1]

دہلی کی شارع عام مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں، آجروں اور مزدوروں کی ریل پیل، بیل گاڑیوں اور تانگوں کی آمد و رفت سے اس دریا کا منظر پیش کر رہی تھی جس میں ندیوں اور نہروں، چشموں اور آبشاروں کا پانی رواں دواں ہو اور اس میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی ہوں۔ لوگ کناروں پر کھڑے ہو کر اس پر فریب اور دلکش منظر سے لطف اندوز ہو رہے ہوں اور اپنی اپنی پسند کی مچھلیاں پکڑنے کے لیے کنڈیاں اور جال لگائے بیٹھے ہوں۔

اس پُر رونق بازار اور وسیع شارع عام کے دونوں طرف کھلی ہوئی دوکانوں سے حاکم اور محکوم، آجر اور مزدور، بچے اور بوڑھے اشیاء صرف، کپڑے، کتابیں اور کاپیاں، غلے اور فروٹ خرید رہے تھے کہ دفعتاً بازار میں سکوت طاری ہو گیا۔ خریداروں اور دوکانداروں کی نگاہیں بگھیوں اور رتھوں میں جلوہ افروز حسیناؤں پر ٹک گئیں۔ یہ حسینائیں جو بن سنور کر اپنے بالا خانوں میں عیاش امیر زادوں کو داد عیش دے کر، ان کی دولت دنیا پر ڈاکے ڈالتی تھیں۔ آج وہ نہا دھو کر، بھڑکیلے ملبوسات زیب تن کر کے گلستان کے ان رنگا رنگ پھولوں کی طرح نکھری ہوئی دکھائی دیتی تھیں جنھیں شبنم کے قطروں نے دھو ڈالا ہو۔ جب لوگوں کی نگاہیں ان کی زرق برق پوشاکوں، عنبریں بالوں، سرگیں آنکھوں، گورے چٹے رخساروں، گلابی ہونٹوں اور صاف شفاف دانتوں پر پڑیں تو وہ خرید و فروخت بھول گئے اور ان کی

طرف دیکھتے ہی رہ گئے لیکن آج ان حسیناؤں کو بازار کے لوگوں سے کچھ رغبت نہ تھی۔ وہ اپنی نائیکہ کے جشن پر اکٹھی ہو کر جا رہی تھیں۔ آج رات انہوں نے پازیبیں پہن کر وہاں تھرک تھرک کر اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔

چنانچہ یہ اداکارائیں مسلم اور غیر مسلم نوجوانوں کو اپنی اداؤں سے گھائل کرتی ہوئی مدرسہ عزیزیہ کے دروازے سے گزر رہی تھیں کہ حضرت شاہ محمد اسماعیلؒ کی نظر ان پر پڑ گئی۔ انہوں نے جب انھیں بے پردہ دیکھا تو ساتھیوں سے پوچھا: یہ بے پردہ بیبیاں کون ہیں؟ ساتھیوں نے بتایا کہ حضرت یہ طوائفیں ہیں اور کسی ناچ رنگ کی محفل میں جا رہی ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: ''چلو یہ تو معلوم ہو گیا کہ طوائفیں ہیں لیکن یہ بتاؤ کہ یہ کس مذہب سے تعلق رکھتی ہیں؟

ساتھیوں نے جواب دیا کہ جناب ہم کیا بتائیں کہ ان کا مذہب کیا ہے، اگر یہ کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہوتیں تو یوں بن سنور کر اور بے پردہ ہو کر باہر نہ نکلتیں۔

شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ان کا کوئی مذہب نہ ہو بلکہ یہ کسی نہ کسی مذہب کی طرف منسوب تو ضرور ہوں گی خواہ نام کے اعتبار سے ہی سہی۔ تو انہوں نے بتایا کہ جناب یہ مذہب اسلام ہی کو بدنام کرنے والی ہیں اور بدقسمتی یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں۔

شاہ صاحب نے جب یہ بات سنی تو فرمایا:

مان لیا کہ یہ بدعمل اور بدکردار ہی سہی، لیکن کلمہ گو ہونے کے اعتبار سے ہوئیں تو ہم مسلمانوں کی بہنیں ہی۔ لہٰذا ہمیں انھیں نصیحت کرنی چاہئے ممکن ہے کہ گناہ سے باز آ جائیں، ساتھیوں نے کہا کہ ان پر نصیحت کیا خاک اثر کرے گی؟ بلکہ ان کو نصیحت کرنے والا تو الٹا خود بدنام ہو جائے گا۔

شاہ صاحب نے فرمایا: ''تو پھر کیا؟ میں تو یہ فریضہ ادا کر کے رہوں گا خواہ کچھ ہو جائے۔

ساتھیوں نے عرض کی کہ حضرت! آپ کا ان کے پاس جانا قرینِ مصلحت نہیں ہے۔ آپ کو پتہ تو ہے کہ شہر کے چاروں طرف آپ کے مذہبی مخالفین ہیں جو آپ کو بدنام کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ آپ نے فرمایا: ''مجھے اس کی ذرہ بھر پروا نہیں، میں انھیں ضرور نصیحت کرنے جاؤں گا۔''

اس عزم صمیم کے بعد آپ نے اپنے دل سے پوچھا! اے دل تو یہ تو بتا کہ اگر تبلیغ حق کی پاداش میں تیرے بدن کے ٹکڑے ہو جائیں۔ انھیں کوّوں اور چیلوں کے آگے ڈال دیا جائے۔ تیرے جسم کو جس میں تیرا مسکن ہے، ہاتھیوں کے پاؤں تلے کچل دیا جائے تو، بہر حال تو نے کلمہ حق کی تبلیغ کر کے رہنا ہے۔ ان کے دل نے کہا! جب تک میرے اندر جان ہے میں راہ حق میں تمام مصائب و آلام کو برداشت کرتا رہوں گا۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا کہ دل نے دم واپسیں تک ہر دکھ اور تکلیف برداشت کی اور تبلیغ حق کا حق ادا کر دیا۔ آپ تبلیغ حق و اصلاح کا عزمِ صادق لے کر اپنے گھر میں تشریف لائے۔ درویشانہ لباس زیب تن کیا اور تن تنہا نائیکہ کی حویلی کے دروازے پر پہنچ گئے اور صدا لگائی: اللہ والیو! دروازہ کھولو، اور فقیر بابا کی صدا سنو۔

آپ کی آواز سن کر چند چھوکریاں آئیں۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو دیکھا باہر ایک درویش صورت بزرگ کھڑا ہے۔ انہوں نے سمجھا کہ یہ کوئی گداگر فقیر ہے جو تماشا کر کے خیرات لینا چاہتا ہے۔

چھوکریوں نے چند روپے لا کر اُسے دیئے۔ لیکن اس نے اندر جانے پر اصرار کیا اور پھر نائیکہ کی اجازت سے کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہے کہ چاروں

طرف شمعیں اور قندیلیں روشن ہیں۔ شہر بھر کی طوائفیں، طبلے اور ڈھولک کی تھاپ پر تھرک رہی ہیں۔ ان کی پازیبوں اور گھنگھروں کی جھنکار نے عجیب سماں باندھ رکھا ہے۔ ان پر اس قدر محویت طاری تھی کہ انہوں نے فقیر بے نوا، مرد قلندر کی مطلقاً پروا نہ کی اور اپنے شغل میں مصروف رہیں۔ جونہی ان کی نائیکہ کی نگاہ اس فقیر بے نوا پر پڑی تو اس پر ہیبت طاری ہوگئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے سامنے فقیرانہ لباس میں گداگر نہیں بلکہ شاہ اسماعیل کھڑا ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ کا پوتا اور شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کا بھتیجا ہے۔ یہ بڑا جرأت مند اور غیور انسان اور کجکلاہوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والا جسور ہے۔ یہ اتنا نڈر اور بے باک شخص ہے کہ تلوار حمائل کر کے تن تنہا متعصب رافضیوں کے جلسہ عام میں خلفائے ثلاثہ کی شان ومنقبت بیان کر چکا ہے۔ شاہ دہلی اکبر شاہ ثانی کے دربار میں بدعات پر ضرب کاری لگا چکا ہے۔ اس کی کھال میں خدا کے سوا کسی کا خوف نہیں اور نیکوکار بھی اتنا کہ سفر وحضر میں نماز تہجد قضا نہیں ہونے دیتا، بے لوث اتنا کہ دین مصطفیٰ کی سربلندی کی خاطر اپنے سے چھوٹے شخص کے ہاتھ پر بیعت کر کے تحریک جہاد کی قیادت کرنے کا خواہاں ہے۔ اگر یہ چاہتا تو اپنے جدامجد شاہ ولی اللہ کا آستانہ تعمیر کروا کر گدی نشین بن کر کے برصغیر کے پیر پرستوں کا پیشوا بن جاتا۔ اور لوگوں کی نذروں، نیازوں سے کروڑوں کا بینک بیلنس بنا لیتا اور ہزاروں ایکڑ اراضی خرید کر بڑے بڑے جاگیرداروں کا مدمقابل ہوتا۔ مگر اسلامیان ہند کا یہ سچا ہمدرد اور دلی خیر خواہ جب اپنے ہم عصر پیر پروہتوں کو دیکھتا کہ وہ مسلمان طوائفوں کو بے حیائی سے روکنے کی بجائے ان کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کرتے ہیں اور ان کی ناجائز آمدنی سے نذرانے لیتے ہیں تو اس کی غیرت ایمانی جوش مارنے لگتی ہے۔ وہ منبر پر کھڑے ہو کر علی الاعلان ان پر تنقید کرتا اور انھیں اپنے

عقائد و اعمال کی اصلاح کی تلقین کرتا۔ چنانچہ اس کے بے لوث اور جذبہ ایمانی سے بھرپور وعظ سے مردہ ایمان والوں کے دلوں میں حرارت ایمانی گردش کرنے لگتی اور وہ شرک و بدعات سے اور پیر پروہتوں کو نذریں، نیازیں دینے سے توبہ تائب ہونے لگتے۔ جب مزاروں کے گدی نشینوں اور دین فروش ملاؤں نے اپنی ناجائز آمدنی گھٹتی دیکھی تو وہ اس کے درپے آزار ہو گئے۔ اسے قتل کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ لیکن یہ متوکل علی اللہ، مصلح اور ریفارمر جھجکا نہ ڈرا، بلکہ ہر طبقۂ زندگی میں فیض عام بانٹتا چلا گیا۔ انھیں وعظ و تبلیغ کرتا ہوا طوائفوں کی حویلی تک جا پہنچا۔ انھیں فہمائش کرنے کے لیے ان کے دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ اس کی شخصیت اس قدر پُر رعب تھی کہ نائیکہ نے لباس کی تبدیلی کے باوجود انھیں پہچان لیا، اپنی نشست سے اٹھی اور احترام کے ساتھ ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ بڑے ادب سے عرض کرنے لگی: حضرت! آپ نے ہم سیاہ کاروں کے پاس آنے کی زحمت کیوں کی۔ آپ نے پیغام بھیج دیا ہوتا تھا ہم آپ کے پاس حاضر ہو جاتیں۔

آپ نے فرمایا:

''بڑی بی! تم نے ساری زندگی لوگوں کو راگ وسرود سنایا ہے۔ آج ذرا کچھ دیر ہم فقیروں کی صدا بھی سن لو۔

جی ہاں سنائیے! ہم مکمل توجہ کے ساتھ آپ کا بیان سنیں گی۔

یہ کہہ کر اس نے تمام طوائفوں کو پازیبیں اتارنے اور طبلے ڈھولکیاں بند کرکے وعظ سننے کا حکم دے دیا۔ وہ ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھ گئیں۔

شاہ اسماعیل (رحمہ اللہ) نے حمائل شریف نکال کر سورۂ والتین تلاوت فرمائی۔ آپ کی تلاوت اس قدر وجد آفریں اور پرسوز تھی کہ طوائفوں کے ہوش ٹھکانے آگئے اور وہ بے خود ہو گئیں۔ اس کے بعد آپ نے آیات مبارکہ کا دلنشیں

رواں دواں ترجمہ کر کے خطاب شروع کر دیا۔

ان کا یہ خطاب، زبان کا کانوں سے خطاب نہ تھا، بلکہ یہ دل کا دلوں سے اور روح کا روحوں سے خطاب تھا۔ یہ خطاب دراصل اس الہام ربانی کا کرشمہ تھا جو شاہ صاحب جیسے مخلص دردمندوں اور امت مسلمہ کے حقیقی خیر خواہوں کے دلوں پر اترتا ہے۔ قلم وقرطاس میں یہ سکت نہیں کہ روحانی خطاب کو الفاظ کا جامہ پہنا سکیں۔ البتہ عالم تصور اس کی اتنی نشان دہی کر سکتا ہے کہ آپ نے قرآن مجید کی آیات مبارکہ سے کائنات پر انسان کی برتری اور بزرگی اس انداز سے بیان کی کہ انسانی مخلوق اپنے آپ کو ملائکہ مقربین سے افضل خیال کرنے لگی۔

قرآن کریم میں حضرت انسان کی بزرگی اور افضلیت یوں بیان کی گئی ہے۔

﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴾ (بنی

اسرائیل: ۷۰)

”اور ہم نے آدم کی اولاد (انسان) کو عزت دی، انھیں خشکی اور تری میں سواری دی، ہم نے انھیں پاکیزہ چیزوں سے روزی دی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔“

کہ باقی مخلوق ہاتھوں اور پاؤں پر جھک کر چلتی ہے۔ منہ سے چرتی چگتی، کھاتی پیتی ہے اور عقل وخرد سے عاری ہے جبکہ انسان اپنے پاؤں پر سیدھا چلتا، ہاتھ سے کھاتا پیتا، خشکی میں زمینی سواریوں پر سفر کرتا ہے۔ دریاؤں اور سمندروں میں کشتیوں پر بیٹھ کر سمندر سے تازہ اور لذیذ گوشت حاصل کرتا ہے۔ اس سے گراں قدر موتی اور ہیرے نکالتا ہے۔ اور ملائکہ کرام باوجود ﴿عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ ہونے کے ٹھنڈے اور شیریں مشروبات، لذیذ ماکولات، نرم وگرم ملبوسات، پھلوں کی

لذتوں اور پھولوں کی رنگتوں سے محروم ہیں۔ یہ حضرت انسان ہی ہے جسے اللہ نے احسن تقویم کا شاہکار بنایا اور اسے ایسی شکل وصورت عطا کی ہے کہ چاند اور سورج سے اسے تشبیہ دینا ایسے ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ اللہ کریم نے اسے اپنے ہاتھ سے تخلیق کر کے مسجود ملائکہ بنایا۔ اسے دنیا اور آخرت کی نعمتوں کا وارث بنایا۔

فرشتوں نے عرض کی تھی، اے اللہ! عبادت ہم بھی کرتے ہیں اور انسانوں سے زیادہ کرتے ہیں مگر وہ ہر طرح کی لذتوں سے دنیا میں ہی لطف اندوز ہیں جبکہ ہم بیویوں کی چاہت، بچوں کی محبت، پھلوں کی مٹھاس اور پھولوں کی خوشبو سے محروم ہیں۔ اے اللہ! ہم تیری تقدیر پر راضی ہیں۔ البتہ ہمیں آخرت میں ان نعمتوں سے بہرہ ور فرما دینا۔ لیکن اللہ نے فرمایا: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں اس مخلوق کو جسے کُن کہہ کر پیدا فرمایا ہے اُس مخلوق کے برابر کردوں جسے میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ شیطان لعین نے اس کی بزرگی پر حسد کیا، اسے زچ کرنے کی ٹھانی اور دوٹوک انداز میں چیلنج دیا:

﴿ قَالَ فَبِمَا اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ○﴾ (الاعراف:۱۶، ۱۷)

''اے اللہ! اس بنا پر کہ تو نے مجھے گمراہ کیا، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں انھیں تیری سیدھی راہ (سے روکنے کے لیے ہر موڑ) پر بیٹھوں گا۔ پھر میں ان پر آگے سے بھی حملہ کروں گا اور پیچھے سے بھی۔ دائیں جانب سے بھی آؤں گا اور بائیں جانب سے بھی۔ تجھے ان کی اکثریت ناشکری ہی نظر آئے گی۔''

اور اس ملعون نے یہ چیلنج دیا تھا۔

﴿ وَ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ

وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ۝﴾ (النساء:۱۱۹)

”کہ میں انھیں تیری راہ سے بہکاتا اور انھیں سبز باغ دکھاتا رہوں گا۔ انھیں حکم کرتا رہوں گا اور وہ (پیروں اور پروہتوں کے نام پر نذر و نیاز دینے کے لیے) جانوروں کے کان چیریں گے اور میں ان کو حکم کروں گا کہ وہ اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑ دیں۔(چنانچہ اللہ فرماتے ہیں) یاد رکھو! جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنایا وہ صریح نقصان میں پڑ گیا)۔“

اور اس خبیث نے واقعی اپنے دعوے کو عملی جامہ پہنا دیا۔

﴿ وَ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾

”اور ابلیس ملعون نے ان کے متعلق اپنا دعویٰ سچ کر دکھایا اور سوائے مومنین کی جماعت کے باقی سارے اس کے پیچھے چل پڑے۔“(سبا:۲۰)

چنانچہ بنو آدم اپنے باپ کی راہ کو چھوڑ کر اس کے دشمن کے تابعدار بن گئے۔ آستانوں اور درگاہوں میں مدفون ہستیوں کی نذر و نیاز دینے کے لیے جانوروں کے کان چیرنے، مصنوعی حسن کے لیے پیشانیوں کے بال اکھاڑنے اور سرجری کروانے لگے۔ انھیں خدا سے اس قدر غافل کر دیا کہ فحاشی اور بے حیائی کے جوہڑ میں اوندھے منہ گرنے لگے اور اس کے جال میں پھنس کر اپنی بزرگی اور شرافت کھو بیٹھے۔ نتیجتاً عفت و عصمت کی وہ دیویاں جنھیں جائز نکاح کی بدولت ان کے شوہروں نے سچے موتیوں کی طرح حفاظت میں رکھنا تھا اور ان کی اولاد نے ان کے پاؤں دھو دھو کر پینے تھے وہ کنواری مائیں بننے لگیں۔ اپنے نومولودوں کو کھیتوں اور

گٹروں میں پھینکنے لگیں اور جوانی کے چار دن عیش سے گزارنے کے بعد معاشرے کا قابل نفرت حصہ بننے لگیں۔ ان کی جوانی کی بہاریں لوٹنے والے انھیں ٹھوکریں مارنے لگے اور وہ بڑھاپے میں اپنی کسمپرسی، بے توقیری اور عفت واحترام کی بربادی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ مگر:

اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

اگلا مرحلہ موت کا ہے۔ شب دیجور جیسے سیاہ بال اب سفید ہو چکے، موتیوں جیسے دانت ایک ایک کر کے جھڑ چکے۔ چہرے پر جھریاں پڑ چکیں اور گوریوں کا چمڑا لٹکنے لگا۔ بلوریں آنکھوں سے بینائی ختم ہو چکی۔ دوبارہ جوان ہونے کی امید نہ رہی۔ کوٹھیوں سے منتقل ہو کر قبر کی گھپ اندھیر کوٹھڑی میں تن تنہا داخل ہونے کا وقت قریب آ گیا۔ جوانی میں عفت مآب اور تہجد گزار ہوتیں تو یقیناً ان کی جائز اولاد بڑھاپے میں انھیں ہتھیلیوں پر اٹھاتی لیکن شیطان ملعون نے انھیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ نہ دنیا کا نہ آخرت کا۔ اب موت کے فرشتوں کی آمد آمد ہے۔ حسن کی دیویاں انھیں دیکھ کر کہتی ہیں:

﴿ رَبِّ لَوْ لَا اَخَّرْتَنِي اِلٰى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝﴾ (المنافقون:۱۰)

”اے اللہ! ذرا مجھے تھوڑی سی اور مہلت کیوں نہ دی تاکہ میں صدقہ کرلوں اور نیکوکاروں سے ہو جاؤں۔“ لیکن یہ روحیں پہلے کیا کرتی رہیں جو اب مہلت مانگ رہی ہیں اور مہلت مل بھی جائے تو پھر اسے ایسے بھلا دیں گی جیسے اس سے قبل بیماری کی حالت میں موت کا منہ دیکھ کر توبہ واستغفار کرتیں، صحت آنے پر پھر بھول جاتیں اور ازسرنو حرام کھانا شروع کر دیتی تھیں۔ اس کا اب مہلت کا وقت ختم ہے۔ قبر میں اترنے کی تیاری کرو۔

﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۖ ذَٰلِكَ مَا كُنتَ مِنْهُ تَحِيدُ﴾

''اور موت کی بے ہوشی یقیناً آ کر رہی اور وہ شک دور ہو گیا جو تیرے دماغ میں گھوم رہا تھا۔'' (ق:۱۹)

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنفُسَكُمُ ۖ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ﴾ (الانعام:۹)

'' کاش تم موت کے وقت ظالموں کی ٹیسیں اور ہائے وائے کرنا دیکھتے۔ جب فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے ان سے کہہ رہے ہوتے ہیں کہ نکالو اپنی جانوں کو۔ آج تمہیں رسوا کن عذاب سے سزا دی جائے گی۔ کیونکہ اللہ پر ناحق بات کہتے تھے اور اس کی آیات سے تکبر کرتے تھے۔''

ان فرشتوں کی ہولناک دہشت کی وجہ سے مجرموں کی روحیں ان کے جسموں کے کونوں میں چھپنے لگتی ہیں اور وہ انھیں مار مار کر نکالتے اور اس طرح نکالتے ہیں جس طرح باریک دوپٹے کو کانٹے دار بیری کی شاخ سے کھینچا جاتا ہے اور اس کشمکش میں اس کی جان نرخرے میں اٹک جاتی ہے۔

﴿كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ○ وَقِيلَ مَنْ رَاقٍ ○﴾ (القیامۃ:۲۶،۲۷)

''اور اس وقت اطباء کی ادویات اور حکیموں کی سکیمیں فیل ہو جاتی ہیں اور آخری چارہ کار کے طور پر کہا جاتا ہے کہ جھاڑ پھونک کرنے والے کو بلاؤ۔''

﴿فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ ○ وَأَنتُمْ حِينَئِذٍ تَنظُرُونَ ○﴾

''اور اس وقت تمھاری تدابیر کہاں چلی جاتی ہیں جب جان حلق میں اٹک جاتی ہے اور تم اس وقت اسے دیکھ رہے ہوتے ہو۔''

بالآخر سب عزیز واقارب کی موجودگی میں اس کی روح کھینچ لی جاتی ہے اور اسے بدبودار ٹاٹ میں لپیٹ کر آسمانوں کی طرف لے جایا جاتا ہے اور جہاں سے گزاری جاتی ہے سب آسمان والے اس کا اور اس کے باپ کا نام پوچھتے ہیں۔ جب بتایا جاتا ہے تو اسے برے لفظوں سے یاد کرتے ہیں اور اس کے لیے آسمانوں کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ○﴾ (الاعراف:۴۰)

''جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے سرتابی کی، ان کے لیے نہ آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے اور نہ وہ بہشت میں داخل ہوں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ نکل جائے اور گنہگاروں کو ہم ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔''

عزیز واقارب اس جوان یا بوڑھے مردوں، عورتوں کے سوٹ قینچی سے کاٹ کر ان کے ہاتھوں سے قیمتی گھڑیاں، جیب سے روپے، کانوں سے سونے کی بالیاں اور گلے کے قیمتی ہار اتار کر اسے نہلاتے، کفناتے اور دفناتے ہیں۔

اس کے بعد اس کی روح بدن میں لوٹا دی جاتی ہے۔ منکر نکیر ہیبت ناک صورت اور بجلی کی طرح کڑکتی آواز میں ((مَنْ رَّبُّكَ، مَا دِينُكَ وَمَنْ نَبِيُّكَ)) کے جواب پوچھنے آدھمکتے ہیں۔ مجرموں کے جواب نہ دینے پر انھیں ایک گرز سے مارتے ہیں کہ ان کا بدن ریزہ ریزہ ہو کر پھر اصل صورت پر آجاتا ہے۔ وہ

انھیں کہتے ہیں کہ اگر تو نے قرآن پڑھا ہوتا، یا سنا ہوتا تو تجھے پتہ چلتا کہ تمھارا رب کون، تمھارا دین کیا اور اور تمھارا نبی کون تھا۔ چنانچہ مسلسل سزا دینے کے لیے دوزخ کی طرف اس کی قبر میں سوراخ کر کے اسے لٹا دیا جاتا ہے۔

پھر جب حشر کے روز اسرافیل علیہ السلام قرناء میں پھونک دیں گے تو زمین میں زلزلہ برپا ہو جائے گا۔ پہاڑ آپس میں ٹکرا دیے جائیں گے اور وہ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ آسمان تلچھٹ کی طرح ہو جائے گا ستارے بے نور ہو جائیں گے۔ اللہ فرماتے ہیں:

﴿فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۝﴾ (الحاقۃ:۱۳تا۱۶)

”تو جب صُور میں ایک بار پھونک ماری جائے گی۔ زمین اور پہاڑ دونوں اٹھا لیے جائیں گے۔ پھر یک بارگی توڑ پھوڑ کر برابر کر دیے جائیں گے۔ تو اس روز ہو پڑنے والی (قیامت) ہو پڑے گی۔ آسمان پھٹ جائے گا اور وہ اس دن کمزور ہو گا۔“

اس روز صور کی ہولناک آواز کی دہشت سے دودھ پلاتی مائیں اپنے شیر خوار بچوں کو پٹخ کر بھاگ کھڑی ہوں گی۔ حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے اور دودھ دوہنے والے گوالے برتن پھینک دیں گے کپڑا لپیٹنے والے تھان پھینک کر ہائے وائے کرتے ہوئے جنگلوں کی طرف بھاگنا شروع کر دیں گے۔ افراتفری کا عالم ہو گا اور لوگ مدہوشوں کی طرح بے سدھ پھر رہے ہوں گے حالانکہ وہ نشے کی وجہ سے ایسے نہ پھر رہے ہوں گے بلکہ اللہ کے سخت عذاب کی دہشت نے ان کی عقلیں ماؤف کر دی ہوں گی۔

آہ! اس روز کیا حال ہوگا جب ہر آدمی اپنے سگے کی صورت دیکھ کر بھاگ جائے گا۔ اپنے ماں باپ سے بیگانہ ہو جائے گا اور اپنے بیوی بچوں سے چھپتا پھرے گا۔ خواہش کرے گا کہ کاش آج اللہ میرے بدلے میری ماں اور باپ، بیوی اور بچوں، بہنوں اور بھائیوں کو دوزخ میں ڈال دے اور مجھے چھوڑ دے۔

آہ! اس روز کیا بنے گا جب مجرموں کو گردنوں میں طوق، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پاؤں میں زنجیریں ڈال کر اور گندھک کے لباس پہنا کر اللہ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔

﴿وَ تَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْأَصْفَادِ ۝ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۝ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ إِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝﴾ (ابراہیم:۴۹ تا ۵۱)

''اس دن تم گنہگاروں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے اور ان کے مونہوں کو آگ جھلسا رہی ہوگی۔ یہ اس لیے ہوگا تا کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دے۔ بے شک اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔''

آہ! اس روز ریاء کار حافظوں، عالموں، مجاہدوں، جانبازوں، سخیوں اور فیاضوں کو کس طرح جکڑ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا؟ ظالم حاجیوں اور نمازیوں سے ان کی نیکیاں چھین کر مظلوموں کو دے دی جائیں گی۔

آہ! جس روز زانیوں اور بدکاروں کی (ویڈیوز، مُووِیاں) اور ان کے کرتوتوں کی فائلیں کھول کر ان کے سامنے رکھ دی جائیں گی اور انھیں کہا جائے گا:

﴿اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝﴾ (بنی اسرائیل:۱۴)

"اپنا کیا دھرا خود ہی پڑھ لو آج تم اپنے خود ہی محاسب کافی ہو۔"

آہ! اس روز بدکار اور زانیہ عورتوں کا کیا بنے گا جب وہ بیڑیوں اور زنجیروں میں جکڑی ہوئی دربار الٰہی میں پیش کی جائیں گی اور ایک ایک زانیہ کے پیچھے ستر (۷۰) ستر (۷۰) زانی مرد لعنت کے طوق پہنے کھڑے ہونگے۔

اسی دوران جہنم سے ایک گردن نکلے گی اور ان مجرموں کو دیکھ کر یوں جھرجھری لے گی جیسے بھوکے خچر جَو پر ٹوٹ پڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مجرموں کو میدان محشر سے یوں چُگ لے گی جس طرح مرغ دانے چگتا ہے۔

جب طوائفوں نے شاہ اسماعیل دہلوی رحمہ اللہ کے اس مفہوم والے بیان کو سنا تو ان پر لرزہ طاری ہو گیا۔ روتے روتے اُن کی ہچکیاں بندھ گئیں۔انھیں یقین آ گیا کہ جس طرح عالم ازل سے رحم مادر میں آنا برحق ٹھہرا اور رحم مادر سے دنیا میں آنا برحق ثابت ہوا، اس طرح دنیا سے قبر میں جانا بھی برحق ہے۔ وہاں سے اللہ کے دربار میں پیش ہونا بھی برحق ہے۔ یہ حقائق کسی کے نہ ماننے سے جھٹلائے نہیں جا سکتے کیونکہ ان حقیقتوں پر ایمان نہ رکھنے والے بھی اسی عمل سے ماں کے پیٹ میں آئے جس طرح ایمان والے آئے اور اسی طرح پیدا ہوئے جس طرح اہل ایمان پیدا ہوتے ہیں۔اسی طرح مریں گے جس طرح اہل ایمان مرتے ہیں اور بالآخر قبروں سے اٹھ کر اسی جگہ پیش ہوں گے جہاں اہل ایمان پیش ہوں گے۔ خواہ کوئی اس حقیقت پر ایمان رکھے یا نہ رکھے ہر حال ایسا ہونا ضرور ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے جب ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑیاں دیکھیں تو انہوں نے اپنے وعظ کا رخ توبہ کی طرف موڑ دیا اور بتایا کہ جو کوئی گناہ کر بیٹھے تو اللہ سے اس کی معافی مانگ لے تو اللہ تعالیٰ بڑے حوصلے والا ہے۔ وہ معاف بھی کر دیتا ہے۔ بلکہ اسے تو اپنے گنہگار اور سیاہ کار بندوں کی توبہ سے اتنی خوشی ہوتی

ہے جس طرح کوئی مسافر اپنی اونٹنی پر سوار سینکڑوں میل لمبے ریگستان میں سفر شروع کر دے۔ جب درمیان میں پہنچے تو ذرا ستانے کی غرض سے درخت کے نیچے سو جائے اور جب اسے جاگ آئے تو اپنی اونٹنی کو وہاں موجود نہ پا کر چکرا جائے۔ ادھر ادھر تلاش کر کے تھک ہار کر اور اپنے آپ کو موت کے منہ میں دیکھ کر مایوس ہو کر لیٹ جائے کہ جھلستے ہوئے ریگستان میں سڑ سڑ کر مرنے سے درخت کے نیچے مرنا ہی بہتر ہے۔ اسے اس حال میں نیند آ جائے۔ پھر وہ جاگے اور مع سامان خورونوش کے اپنی اونٹنی کو موجود پائے تو وہ خوشی کی فراوانی کی وجہ سے یہ کہہ بیٹھے: واہ میرے اللہ! میں تیرا رب اور تو میرا بندہ ہے۔ چنانچہ جس طرح اس بندے کو موت کے منہ سے نکل کر خوشی ہوتی ہے اس طرح اللہ کو اس بندے سے بھی کہیں زیادہ خوشی، اس مرد یا عورت سے ہوتی ہے جو گناہوں سے سچی توبہ کر لے۔ اس کا فرمان ہے:

﴿ قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ ﴾ (الزمر:۵۳)

"(اے میرے پیارے نبی! میری طرف سے لوگوں کو یہ بات بتاتے ہوئے) کہہ دیجیے کہ (اللہ فرما رہے ہیں) اے میرے وہ بندو جو اپنی جانوں پر زیادتی کر چکے ہو۔ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جانا۔ یقیناً اللہ کریم تمھارے سب گناہ بخش دے گا کیونکہ وہ بڑا ہی بخشنہار اور مہربان ہے۔"

وہ ہر توبہ کرنے والے کی توبہ قبول فرماتا ہے اور اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ بلکہ اگر کوئی خطا کار سچی توبہ کر لے، آئندہ اس طرح کے گناہوں سے تاحیات بچا رہے اور نیک اعمال پر عمل پیرا ہو جائے تو وہ اس کی خطاؤں کو نیکیوں میں بدل

دیتا ہے۔ فرمایا:

﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ آمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○﴾ (الفرقان:٧٠)

''ہاں! مگر جس نے توبہ کر لی۔ ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ تعالیٰ تو بخشنے والا، مہربان ہے۔''

حدیثِ قدسی میں ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ فرماتا ہے:

((یَا ابْنَ آدَمَ اِنَّکَ مَا دَعَوْتَنِیْ وَرَجَوْتَنِیْ غَفَرْتُ لَکَ عَلٰی مَا کَانَ مِنْکَ وَلَا اُبَالِیْ.یَا ابْنَ آدَمَ لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوْبُکَ عَنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِیْ غَفَرْتُ لَکَ وَلَا أُبَالِیْ یَا ابْنَ آدَمَ إِنَّکَ لَوْ أَتَیْتَنِیْ بِقُرَابِ الْاَرْضِ خَطَایَا ثُمَّ لَقِیْتَنِیْ لَا تُشْرِکُ بِیْ شَیْئًا لَأَتَیْتُکَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً))

''اے آدم کے بیٹے! (جس طرح حق تھا) تو نے (اس طرح) نہ مجھے پکارا اور نہ مجھ سے رحمت کی امید ہی رکھی۔ (اگر تو ایسا کر لیتا تو) تیری طرف سے تیرے اوپر جتنا گناہوں کا بوجھ تھا وہ سب میں معاف کر دیتا خواہ وہ کیسے بھی ہوتے اور مجھے کوئی پروا نہیں۔ اے آدم کے بیٹے! اگر تیرے گناہ آسمان کی بلندیوں کو بھی چھونے لگیں اور تو مجھ سے بخشش و مغفرت کا سوال کرے تو میں تجھے بخش دوں اور مجھے کوئی پروا نہ ہو۔ اے آدم کے بیٹے! اگر تو زمین برابر بھی میرے پاس گناہ لے آئے اور تو اس حال میں میرے سامنے پیش ہو کہ تو نے میرے ساتھ کسی طرح کا شرک نہ کیا ہو تو میں اس کے برابر مغفرت لے کر موجود

ہوں گا۔'' [الترمذی باسناد حسنٍ غریبٍ، کتاب الدعوات، حدیث: ۳۵۴۰]

اس طرح حدیث پاک میں آتا ہے:

((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ))

''گناہ سے توبہ کرنے والا یوں پاک اور صاف ہو جاتا ہے گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔''

الغرض آپ نے توبہ کے اتنے فضائل بیان کئے کہ ان کی سسکیاں بند ہو گئیں۔ آنکھوں کے آنسو تھم گئے اور وہ اپنے دوپٹوں سے اپنے رخسار پونچھنے لگیں۔ کسی ذریعے شہر والوں کو اس وعظ کی خبر ہو گئی۔ وہ دوڑے آئے اور مکانوں کی چھتوں، دیواروں، چوکوں اور گلیوں میں کھڑے ہو کر وعظ سننے لگے۔ تاحدِ نگاہ لوگوں کے سر ہی سر نظر آنے لگے۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے عفت مآب زندگی کی برکات اور نکاح کی فضیلت بیان کرنی شروع کر دی اور اس موضوع کو اس قدر خوش اسلوبی سے بیان کیا کہ تمام طوائفیں گناہ کی زندگی پر کفِ افسوس ملنے لگیں۔

حضرت شاہ اسماعیل کے اس وعظ نے برائی کے اس طوفان کے آگے بند باندھ دیا اور غلط راہ پر چلنے والیوں کو صراطِ مستقیم پر گامزن کر دیا۔ آپ نے انھیں اٹھ کر وضوء کرنے اور دو، دو رکعت نوافل ادا کرنے کی ہدایت کی۔ جب وہ وضو کر کے قبلہ رخ کھڑی ہوئیں اور نماز کے دوران سجدوں میں گریں تو شاہ شہید رحمہ اللہ نے ایک طرف کھڑے ہو کر اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے اور عرض کی:

''اے مقلب القلوب! اے مصرف الاحوال! میں تیرے حکم کی تعمیل میں اتنا کچھ ہی کر سکتا تھا۔ یہ سجدوں میں پڑی ہیں اگر تو ان کے دلوں کو پاک کر دے، گناہوں کو معاف کر دے اور انھیں آبرومند بنا دے تو تیرے آگے کچھ مشکل نہیں۔ ورنہ تجھ پر کسی کا زور نہیں۔ میری فریاد تو یہ ہے کہ انھیں ہدایت عطا

فرما کر انھیں نیک بندیوں میں شامل فرما۔

ادھر سید اسماعیل رحمہ اللہ کی دعا ختم ہوئی اور ادھر ان کی نماز۔ وہ اس حال میں اٹھیں کہ ان کے دل پاک ہو چکے تھے اور وہ جائز نکاح پر راضی ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ان میں سے جوان عورتوں نے نکاح کرا لیے اور ادھیڑ عمر والیوں نے گھروں میں بیٹھ کر محنت مزدوری سے گزارا شروع کر دیا۔

کہتے ہیں کہ ان میں سب سے زیادہ خوبصورت موتی نامی خاتون کو جب اس کے سابقہ جاننے والوں نے شریفانہ حالت اور سادہ لباس میں مجاہدین کے گھوڑوں کے لیے ہاتھ والی چکی پر دال پیستے دیکھا تو پوچھا: ''سنا وہ زندگی بہتر تھی جس میں تو ریشم وحریر کے ملبوسات میں شاندار لگتی اور تجھ پر سیم وزر نچھاور ہوتے تھے یا یہ زندگی بہتر ہے جس میں تیرے ہاتھوں پر چھالے پڑے ہوئے ہیں؟

کہنے لگی: ''اللہ کی قسم! مجھے گناہ کی زندگی میں کبھی اتنا لطف نہ آیا جتنا فرسانِ مجاہدین کے لیے چکّی پر دال دلتے وقت ہاتھوں میں ابھرنے والے چھالوں میں کانٹے چبھو کر پانی نکالنے سے آتا ہے۔

اللہ اکبر! یہ ہے حلاوتِ ایمان اور یہ ہے پر لطف زندگی۔

......☆......

[1] اس قصے کا اصل تذکرۃ الشہید میں ہے۔

مزدور کا ایمان ویقین

موسم سرما کی ٹھنڈی ہوا زوروں پر تھی، مرد اور عورتیں بچے اور بوڑھے، دکاندار اور گاہک، آجر اور مزدور اونی ملبوسات پہنے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اسی دوران اپنی بلڈنگ کی چوتھی منزل پر بیٹھے بزرگ کا جی چاہا کہ وہ بھی کائنات کے فطرتی حسن کا نظارہ کرے چنانچہ وہ اپنی وہیل چیئر کو شیشے کی ونڈو کے قریب لے آیا اور صاف وشفاف نیلگوں آسمان پر تیرنے والے سورج کی تپش سے اپنے سرد جسم کو گرمانے لگا اور جونہی کوئی سفید بدلی سورج کے سامنے آتی تو اس کا دل کملا جاتا اور جب وہ پیچھے ہٹ جاتی تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا اور میرے مولیٰ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کا ترانہ الاپنے لگتا اسی دوران وہ برق رفتار کاروں اور سواریوں سے بھری ہوئی بسوں اور پُر رونق دکانوں کی طرف دیکھنے لگا ابھی وہ اس خوشنما منظر کا نظارہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ سامنے والی بلڈنگ کی چھٹی منزل کے بیرونی حصے پر پڑی جہاں ایک مزدور اسے زمین وآسمان کے درمیان لٹکتا ہوا یوں نظر آیا کہ وہ زمین پر اوندھا گرنے والا ہے اس نے دیکھا کہ اس بے چارے نے حلال لقمے سے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کمند سے اپنی کمر باندھی ہوئی ہے اور اس کے ذریعے آٹھویں منزل سے لٹک کر چھٹی منزل کے بیرونی حصے کی رگڑائی کر رہا ہے اور خون منجمد کر دینے والی شدید ٹھنڈی ہوا اس کے جسم سے آر پار ہو رہی ہے اسے ایک ہاتھ سے کمند پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے رگڑائی کرتے دیکھ کر اس بوڑھے بزرگ کا دل

دہل گیا کہ خدانخواستہ اگر کمند ٹوٹ گئی یا سردی کی وجہ سے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا تو یہ مسکین اوندھا گر پڑے گا اور اس کا منکا ٹوٹ جائے گا، لہٰذا اس بزرگ نے اللہ سے دعا مانگنی شروع کی کہ وہ اسے خیر و عافیت سے منزل مقصود تک پہنچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ مسکین مزدور کمند کو دونوں ہاتھوں سے تھامتا ہوا، ہانپتا کانپتا آہستہ آہستہ آٹھویں منزل کی طرف چڑھنے لگا اس دوران اس کے ہاتھ سرخ اور سرد ہو رہے تھے اور بدن کانپ رہا تھا اگر رحمت خداوندی اس کا ساتھ نہ دیتی تو اس کے ہاتھ سے کمند چھوٹ یا ٹوٹ جاتی تو اور اس کا زمین و آسمان کے درمیان لٹکتا ہوا بدن دھڑام سے زمین پر گر پڑتا تھا، بہرحال اللہ نے اسے سلامتی کے ساتھ آٹھویں منزل تک پہنچایا اور پھر وہ نیچے اتر کر اپنی کارکردگی کی عمدگی دیکھنے لگا اور اگلے دن کے کام کا پروگرام بنانے لگا سارا دن کام کرنے کی وجہ سے اس مسکین کے اعضاء بدن چور چور ہو چکے تھے اور یہ تھوڑی دیر ستانا چاہتا ہی تھا کہ مغرب کی اذان ہوگئی تو یہ قریب والی مسجد میں نماز پڑھنے چلا گیا۔

ادھر بوڑھے بزرگ نے بھی نماز مغرب کی تیاری شروع کر دی اس سلسلے میں اس کی نوجوان پوتی نے اس کی مدد کی اس نے اسے وضو کرایا اور اس کی وہیل چیئر کو قبلہ رخ کر دیا بوڑھے بزرگ نے اپنی ناتوانی اور کمزوری کی وجہ سے کرسی پر ہی اپنے کمرے میں نماز ادا کی اور دوبارہ اپنی وہیل چیئر کو شیشے کی ونڈو کے سامنے کر کے بیٹھ گیا اور مسکین مزدور کی راہ تکنے لگا، اسے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ نوجوان مسکین نے اپنی تھکاوٹ کو بالائے طاق رکھ کر اللہ کا حق بھی ادا کیا اور اپنے آجر کی خیر خواہی میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ چنانچہ اس نے دیکھا کہ نوجوان مسکین مزدور مسجد سے نکل کر بلڈنگ کے سامنے بیکار لکڑی کے ٹکڑے اور درختوں کے خشک پتے اور سوکھی گھاس کے تنکے اکٹھے کر کے اسے آگ لگا رہا ہے تاکہ اسے تاپ کر اپنے ٹھٹھرتے بدن کو حرارت پہنچا سکے اور اس کے انگاروں سے اپنی ٹھنڈی اور ابتر خوابگاہ

کو گرما سکے، ابھی وہ بے چارا آگ سینکنے بیٹھا ہی تھا کہ اس کے سامنے ایک لمبی کار آ کھڑی ہوئی اور اس سے ایک ڈھول نما پیٹ اور گنجے سر والا ساہوکار باہر نکلا اور اس نے حقارت کے ساتھ اس مسکین مزدور کو دیکھا اور بولا۔

آجر: تو کتنی دیر سے آگ تاپ رہا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ تو سارا دن آگ ہی تاپتا رہا ہے اور ذرا برابر کام نہیں کیا۔

مزدور: نہیں جناب اگر آپ دن کو چکر لگا لیتے اور مجھے کام کرتے دیکھ لیتے تو آپ کو یقین آ جاتا کہ میں نے بہت سا کام کیا ہے۔

آجر: تم میرے ساتھ بحث کرتے ہو اور مجھے بیوقوف بناتے ہو۔

مزدور: نہیں جناب میں سچ اور حق بات کہتا ہوں اور سوائے اللہ کے کسی سے نہیں ڈرتا۔

آجر: (غصے سے چنگھاڑتے ہوئے) آج سے تو کام سے فارغ ہے آئندہ یہاں کام کرنے نہ آنا، یہاں سے چلا جا اور کسی دوسرے کو بیوقوف بنا۔

مزدور: اللہ تجھے سلامت رکھے میرا گمان یہ تھا کہ آپ آ کر کام دیکھیں گے اور جو کمی رہ گئی ہے اس کے متعلق ہدایات دیں گے اور میرے حال پر ترس کھائیں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے ابھی تک نماز بھی ادا نہیں کی اور کام بھی نہیں دیکھا۔

آجر: (چنگھاڑتے ہوئے) نکل جا یہاں سے، میں دیکھوں گا کہ تجھے میرے علاوہ اور کون مزدوری پر رکھے گا؟

مزدور: اللہ روزی دینے والا ہے اور وہی فراہم کرے گا۔ بندہ کچھ نہیں دے سکتا۔ یہ کہہ کر اس نے سلگتی آگ چھوڑ دی اور بغیر مزدوری لئے چل پڑا اس کے پاس تن کے کپڑوں کے علاوہ کچھ نہ تھا اور یہی کپڑے اس کا اوڑھنا بچھونا تھے، اس نے کچی اور ٹھنڈی کوٹھڑی کو الوداع کہا اور خالی ہاتھ چل پڑا۔

بوڑھے بزرگ نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا اور اس کے بدن میں حرارت پیدا ہوئی اور وہ اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکا اس

نے اپنی نوجوان پوتی کو آواز دی۔

بیٹی ادھر آؤ اور اس نوجوان کو بلاؤ جو سڑک کے کنارے جا رہا ہے۔

پوتی: دادا جان میں اسے کیسے بلا سکتی ہوں وہ تو اجنبی نوجوان ہے۔

دادا: بیٹی جلدی کر و ورنہ وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ نوجوان پوتی الیکٹرک سیڑھی کے ذریعے جلدی سے نیچے اتری اور مسکین مزدور کے پیچھے تیزی سے دوڑنے لگی اور اسے راستے پر جا لیا اور اس سے کہنے لگی۔

معاف کرنا مسلمان برادر، میرا دادا آپ سے ملنا چاہتا ہے، آپ اس کے پاس چلیں۔

نوجوان (حیرانی سے) مجھ سے ملنا چاہتا ہے، حالانکہ میرا اس سے تعارف ہی نہیں، معاف کرنا بہن وہ کہاں ہے اور مجھے کیسے جانتا ہے؟

لڑکی: وہ آپ کو جانتا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

نوجوان نے انتہائی شرمندگی کے ساتھ اس لڑکی کے آگے چلنا شروع کر دیا جب وہ بوڑھے بزرگ کی بلڈنگ کے دروازے پر پہنچا تو اس نے لطیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور کہا:

نوجوان! میرے قریب آ کر بیٹھو اور مجھے اپنا ماجرا سناؤ۔

نوجوان: محترم آپ مجھے پہلے کبھی نظر نہیں آئے آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟

بزرگ: میں آپ کو اس دن سے جانتا ہوں جس دن سے آپ نے اس نئی بلڈنگ میں کام کرنا شروع کیا تھا۔

نوجوان: چند منٹ پہلے جو کچھ یہاں ہوا آپ کو اس کا علم ہے؟

بزرگ: ہاں، اور اسی لئے تو میں نے آپ کو بلا بھیجا ہے۔

نوجوان نے سر نیچے جھکا لیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ یوں گویا ہوا۔ اے محترم بزرگ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ کو کیا بتاؤں، میں

حلال روزی کی تلاش کرنے کی غرض سے اسلامی عربی ملک چھوڑ کر یہاں آیا ہوں، بیمار والد اور بوڑھی والدہ اور بہنوں کا میں واحد کفیل ہوں میں اپنی محنت کی اجرت کو اپنے اوپر خرچ کرنے کی بجائے ان کی طرف بھیجتا ہوں اور اس سلسلے میں جتنی مشقت برداشت کرتا ہوں اس کا آپ کو خوب علم ہو چکا ہے مجھے اس سلسلے میں جتنی مشقت اٹھانی پڑتی ہے اس کا شکوہ کرنا حرام سمجھتا ہوں لیکن مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ اس طرح سے حلال روزی کمانے والے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ گھٹیا سلوک کیا جاتا ہے اور یہ گھٹیا سلوک کرنے والے کوئی کافر یا ملحد نہیں بلکہ ہمارے مسلمان سیٹھ ہی ہیں۔

محترم بزرگ اگر میں حرام طریقے سے روزی کمانا چاہتا تو مجھے وہ سہولت میسر آ سکتی تھی کہ بہت سارے منشیات فروشوں نے منشیات فروخت کرنے کے عوض مجھے بھاری بھر کم رقم اور مراعات کا لالچ دیا اور کتنی ساری بدکار عورتوں نے مجھے ورغلا کر اللہ کی اطاعت سے پھیرنا چاہا لیکن میں نے ان کے ہاتھ جھڑک دیئے اور کتنے سارے ڈاکوؤں نے مجھے مالداروں کے مال اور ان کی عزتوں پر ڈاکہ ڈالنے کی ترغیب دی اور مجھے اپنا ساتھی بنانا چاہا لیکن میں ان کا ساتھی نہ بنا اور جب کبھی وہ مجھے ملتے تو میں ان سے کنی کترا کر اللہ کے گھر میں عبادت کے لئے چلا جاتا اور وہاں جا کر دعا کرتا کہ اے اللہ مجھے حلال روزی عطا فرما کیونکہ میں حرام نہیں کھانا چاہتا۔

اس کے بعد میں قرآن کی تلاوت کرتا تو اپنے دل میں سکون محسوس کرتا اور روزی کمانے کے لئے نکل پڑتا اور اس کی خاطر حلال کسب میں عار محسوس نہ کرتا اگر چہ لوگ اسے کتنا ہی حقیر سمجھتے ہوں اور کم مزدوری کی وجہ سے اس کے قریب نہ جاتے ہوں۔

اسی دوران شیخ نے اپنی پوتی سے عشاء کا کھانا لانے کا حکم دیا وہ فوراً کھانا لے کر اپنے دادا جان کے پاس حاضر ہوگئی، حالانکہ وہ اجنبی نوجوان کی اپنے گھر

میں موجودگی کی وجہ سے پریشان بھی تھی۔لیکن شیخ نے نوجوان مزدور کو اپنے ساتھ کھانا تناول کرنے کی دعوت دی جب نوجوان نے کھانا کھا لیا تو اللہ کا شکر ادا کیا اور واپس جانے کی اجازت طلب کی لیکن شیخ نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور اس سے میٹھی اور نرم گفتگو کرتے ہوئے کہا:

اے نوجوان تو نے جو یہ باتیں کی ہیں اگر سچ اور حق ہیں تو،تو بہترین مسلمان ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تیرے ساتھ مصاہرت (رشتہ داری) قائم کرلوں۔

نوجوان نے یہ سنا تو اس کا منہ کھلا رہ گیا کیونکہ نہ تو اس کے پاس کوئی اعلیٰ تعلیمی ڈگری تھی اور نہ اس کے پاس دولت کے انبار تھے اور نہ ہی وہ کسی اعلیٰ ادنیٰ درجے کی کوٹھی کا مالک تھا اور نہ ہی اس کا کنبہ قبیلہ یہاں موجود تھا اس نے نہایت حیرانی سے پوچھا۔

اے شیخ آپ کس سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں؟

شیخ نے کہا۔اے میرے بیٹے دنیا کی زیب وزینت پر تفاخر نے انسانوں کی قدروقیمت مٹا دی ہے جس کی پاداش میں اللہ نے ہمیں بھلا دیا ہے۔اے میرے بیٹے میں تیری شادی اپنی پوتی سے کرنا چاہتا ہوں تاکہ وہ اس دنیا میں تیری تنہائی اور وحشت میں تیری معاون ہو۔

نوجوان اس کو یوں سن رہا تھا گویا وہ خواب دیکھ رہا ہو اس نے اپنی آنکھوں پر اچھی طرح ہاتھ پھیرا اور اسے حقیقت سمجھتے ہوئے بولا۔یہ کیسے اور کہاں اور کب ہوگا؟

شیخ نے کہا ان شاء اللہ صبح ہم رجسٹرار کو بلا کر عقد رجسٹرڈ کروالیں آپ یہیں رات بسر کریں لیکن عقد سے پہلے لڑکی سے اس کی موافقت ضروری ہے۔

اس کے بعد شیخ نے اپنی پوتی کو بلایا اور پوچھا:

بیٹی اس نوجوان سے شادی کے متعلق تیری کیا رائے ہے؟

اس نے حیا سے اپنی نگاہیں زمین پر گاڑ دیں اور خاموشی سے رضا مندی کا اظہار کردیا۔

دانشمند خاتون[1]

خیر القرون کے سنہری دور میں مسلمان جذبہ جہاد سے معمور ہوا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کسریٰ ایران اپنے تخت پر بیٹھا ہوا بھی ان سے لرزتا تھا اور خاقان چین ان کی ہیبت سے سہا رہتا تھا۔ جب ان کی تلواریں بجلی کی طرح کوندتی تھیں تو قیصر روم کی آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔

وجہ یہ تھی کہ وہ کرۂ ارضی پر حق و انصاف کے داعی اور سچائی کے پیکر تھے۔ دشمن بھی ان کی عدالت و دیانت کے معترف تھے۔ ان کے دلوں میں اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ تھا۔ وہ شہادت فی سبیل اللہ لاعلاء کلمۃ اللہ کی امید لیے گھروں سے نکلتے اور اکثر غازی بن کر لوٹتے تھے۔ وہ دن کو میدان جنگ کے شہسوار اور رات کو مصلیٰ پر اپنے پروردگار کے سامنے عاجزی و انکساری کے ساتھ سربسجود رہتے تھے۔ آج کے مسلمان تو طاؤس و رباب کے رسیا ہو کر ذلیل و خوار اور مقہور و مغضوب ہو گئے ہیں لیکن وہ شمشیر و سناں کے شیدائی ہوا کرتے تھے۔ غیر مسلم اور انصاف پسند اقوام ان کی فتوحات کے لیے دعائیں کرتی تھیں۔ اور ان کی آمد پر پلکیں بچھا دیتی تھیں۔

الغرض وہ عمل اور کردار کے غازی تھے اور شہادت کی موت کے اس طرح طالب کہ جس طرح آج کے مسلمان زندگی کے طلبگار ہیں، ان عظیم اور پر عزم مجاہدوں میں سے ایک کا نام ابوعبدالرحمٰن فروخ تھا۔ یہ شخص نہایت حسین و جمیل اور تندرست و توانا نوجوان تھا۔ کردار اور گفتار کا سچا اور خالص مومن۔ ساتھ ہی دنیوی دولت کی

فروانی بھی تھی۔تیس ہزار (۳۰۰۰۰) دینار اس کی ملکیت میں تھے۔

اس کی شادی بھی ایسی ہی خوبصورت اور خوب سیرت خاتون سے ہوئی جو بڑی ہی اطاعت گزار اور نہایت فرمانبردار تھی۔اس درجہ کی وفادار کہ خاوند لمحہ بھر جدا ہو جائے تو ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتی۔ابھی فروخ کی شادی کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ وادی عقیق میں مدینہ کا علاقائی ثقافتی جشن برپا ہو گیا۔پھر رات کی چاندنی نے سونے پر سہاگے کا کام دکھایا۔اس ثقافتی جشن میں تمام لوگ اپنے من پسند حلقوں میں بیٹھے تھے۔کہیں شعراء کے حلقے قائم ہیں،لوگ ان کے اشعار سے محظوظ ہو رہے ہیں اور کہیں علماء کے حلقے قائم ہیں، وہاں لوگ ان کے علمی مناقشوں سے لطف اٹھا رہے ہیں۔کہیں ظریف طبع بیٹھے لوگوں کو لطیفوں اور ظرافتوں سے ہنسا رہے ہیں۔کئی حلقوں میں دعوتیں اڑائی جا رہی ہیں تو کہیں حربی قسم کی کھیلیں کھیلی جا رہی ہیں۔الغرض لوگ اپنے اپنے فنون کی نمائش کر رہے تھے۔بڑا عجیب سماں تھا۔ عورتیں مردوں سے الگ اپنے حلقے قائم کیے ہوئے ہیں اور اس حسن افزا منظر سے اپنا حصہ وصول کر رہی ہیں۔وادی عقیق کے پاس والے پانی کے تالاب میں پاؤں لٹکائے محو گفتگو ہیں اور ہنستی ہنستی ایک دوسری پر پانی کے چھینٹے پھینک رہی ہیں اور پھر تھک کر ایک جگہ بیٹھ کر اپنی سہیلی کا انتظار کرنے لگی ہیں جب انتظار طویل ہو گیا تو ایک نے کہا پتہ نہیں سہیلہ نے اتنی دیر کیوں کر دی اور اس نے ان راتوں کے لطف کو کیوں فراموش کر دیا۔

امینہ: فروخ کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی ہے۔اس لیے اب وہ ہمیں کبھی نہیں مل سکتی۔

سہیلیاں: وہ کوئی پہلی خاتون تو نہیں کہ جس کی شادی ہوئی ہو۔ہم سب شادی شدہ ہیں، اس کے باوجود ہم نے سہیلیوں کو نہیں بھلایا اور شوہر کا حق بھی ادا

کرتی ہیں۔

امینہ: لیکن سبھی کے شوہر فروخ جیسے تو نہیں ہو سکتے۔ کیا تم نے فروخ کے حسن و جمال اور شباب کی جھلک نہیں دیکھی۔ وہ تو نہایت ہی حسین و جمیل نوجوان ہے اور بڑا دولت مند بھی! سہیلہ کو ایک تو محبت کا نشہ ہے، دوسرا دولت کا! اس لیے وہ ہمیں فراموش کیے بیٹھی ہے۔

سہیلیاں: اسے بچپن کی سہیلیوں کا خیال تو رکھنا چاہیے۔

امینہ: اگر تمہیں یہی چیزیں نصیب ہو جائیں تو تم اپنے ماں باپ کو بھول جاؤ گی۔

وہ اسی طرح کی باتوں میں مشغول تھیں کہ ان کے پاس سے ایک نوجوان شہسوار ہتھیار زیب تن کیے سر اور منہ پر عمامہ لپیٹے ہوئے گزرا جسے وہ پہچان نہ سکیں۔ انہوں نے صرف اس قدر دیکھا کہ وہ لوگوں کی جماعتوں کو چیرتا ہوا دور دراز نخلستان کے وسط میں غائب ہو گیا ہے...... یہ سہیلہ کا شوہر فروخ تھا۔ یہ حسین و جمیل نوجوان شادی کی بہاریں لوٹ رہا تھا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کا اعلان ہو گیا۔ اس اعلان نے فروخ کو دنیا کی ہر چیز سے بیگانہ کر دیا۔ شہادت کے طالب، اس نوجوان نے سامان جہاد تیار کیا اور نہ صرف مال و متاع بلکہ اپنی باوفا اور حسین و جمیل بیوی سے بھی لاتعلق ہو گیا۔ بیوی کی ہزار منت سماجت کے باوجود اس سے روگرداں ہو کر شہادت فی سبیل اللہ کا جذبہ لے کر مجاہدوں کے ساتھ محاذ جنگ پر چلا گیا۔

اس زمانے میں اسلامی افواج کا سمندر، دنیا کے گوشے گوشے میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور فتوحات پر فتوحات حاصل کرتا ہوا براعظم یورپ، افریقہ اور براعظم ایشیا کے اکثر حصے پر قابض ہو گیا تھا۔ یعنی حق و صداقت کا علم لہراتا، وسیع و عریض سمندروں پر تیرتا ہوا چین و تاشقند، ملتان و سندھ، ہسپانیہ و حبشہ اور ایشیائے کوچک تک اس طرح جا پہنچا تھا کہ سورج ان کی سرزمین پر طلوع ہوتا اور ان کی سرزمین پر

ہی غروب ہوتا تھا۔

فروخ نے اپنے گھر میں، خوبصورت، خوب سیرت نئی نویلی دلہن کو تیس ہزار دینار امانت کے طور پر دیتے ہوئے کہا کہ انھیں حفاظت سے رکھنا۔ یہاں تک کہ میں جہاد سے واپس آ جاؤں کیونکہ حق زوجیت تو ادا ہو گیا مگر اللہ کا وہ حق کہ جس سے قومیں سربلند و سرخرو ہوا کرتی ہیں، ادا کرنا ابھی باقی ہے۔

جشن عقیق کی پر لطف راتوں نے ذہنوں پر یادگار نقوش ثبت کیے۔ دن گزر گئے۔ سہیلہ جو اس جشن کو پر لطف بنانے میں سہیلیوں کا پورا ساتھ دیا کرتی تھی، موسلا دھار بارش والی رات میں چھپ جانے والے تارے کی طرح جدائی کے آنسو بہاتی ہوئی گھر کے کونے میں چھپ گئی۔ سہیلیوں نے اس کی عدم شمولیت کا سبب دریافت کرنے کے لیے اس کی راز دان اور عزیز ترین سہیلی امینہ کو بھیجا لیکن آج سہیلہ نہ تو اس سے گفتگو کرتی ہے، نہ اس کی طرف ہی دیکھتی ہے۔ واپسی پر اس نے سہیلیوں سے بیان کیا کہ وہ بڑی افسردہ خاطر اور بدحال ہے۔ گویا وہ پہلی سہیلہ نہیں رہی وہ سوچ و بچار میں غرق ہے۔ گویا اس کے دل میں آگ ہے جو اسے سکون سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ اور اسے بے چین کر رہی ہے۔ جب بھی میں نے بات شروع کی وہ تھوڑی سی آنکھیں کھول کر دیکھتی اور پھر بند کر لیتی۔ میں نے بچپن کی یادیں چھیڑیں اور اس کے دل پسند اشعار سنائے اور اشعب کے طنز و مزاح سے بھرپور شگوفے سنائے لیکن وہ افسردہ بیٹھی رہی۔ جونہی میں نے فروخ کا ذکر کیا اس کا بدن جھومنے لگا، چہرہ تمتمانے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ فروخ سے متعلقہ باتوں سے محبت کرتی ہے اور ہجر و فراق کے رنج والم کے گھیراؤ سے خوفزدہ بھی ہے۔ اس نے حزن و ملال کے لہجہ میں کہا کہ افسوس وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔

اگر کوئی اور عورت اس مقام پر ہوتی تو وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتی اور بے

حیائی اپنا کر اپنی دنیا و عاقبت خراب کر لیتی اور برے پیشے سے خاندان اور قبیلے کی ناموس کو برباد کر دیتی۔ لیکن سہیلہ اپنے تقویٰ، دین داری اور حسب ونسب کی بلندی کی بنا پر اور وفا شعاری کی وجہ سے شیطان کے بہکاوے سے محفوظ رہی اور عفت و عصمت کو محفوظ رکھنے کی بے نظیر مثال قائم کر گئی۔ ممکن تھا کہ وہ اپنے محبوب اور حسین وجمیل شوہر کے فراق و جدائی کے سبب دیوانی ہو جاتی لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی رحمت کے سبب بچا لیا۔ سہیلہ اپنی شادی کے باعث امید سے تھی لیکن ابھی اس حالت سے بے خبر تھی۔ چند مہینوں کے بعد جب حمل کے آثار معلوم ہونے لگے تو رنج والم زیادہ ہو گئے۔ وہ اپنی سہیلیوں سے الگ تھلگ رہنے لگی اور اس وحشت نے اس کی جمعیت خاطر کو پراگندہ کر دیا۔ وہ اپنے محبوب خاوند کی تصوراتی خوشبو سونگھنے کے لیے بار بار اپنا رخ مشرق کی طرف پھیر لیتی۔

وہ صبح و شام مدینہ منورہ کی طرف سے آنے جانے والے قافلوں سے فروخ کے متعلق دریافت کرتی لیکن اس کے متعلق کچھ پتہ نہ چلتا۔ وہ راتوں کو چاند سے اور دن کو سورج اور صبح کو بادنسیم سے فروخ کی خیریت اور واپسی کا تصور باندھتی۔ شعراء اپنے محبوب کو چاند، سورج اور پھول سے تشبیہ دے کر اپنے مچلتے ہوئے مصنوعی عشق کا اظہار کر کے راتوں کو میٹھی نیند سوتے ہیں لیکن جس کے دل میں حقیقی چاہت اور طلب صادق ہو، اسکی آنکھوں میں بیداری کا سرمہ ہوتا ہے۔ نرم نرم بستر خواب پر اسے کانٹے چبھتے ہیں وہ زبان حال میں کہتا ہے۔

هَنِيئاً لِأَرْبَابِ النَّعِيمِ نَعِيمُهَا   وَلِلْعَاشِقِ الْمِسْكِينِ مَا يَتَجَرَّعُ

"ناز ونعمت میں پلنے والوں کو ان کی عیش وعشرت مبارک ہو اور غریب عاشق کو جدائی کے تلخ گھونٹ مبارک ہوں۔"

سہیلہ پر نیند حرام ہو چکی تھی۔ گزشتہ زندگی کے چند محبت بھرے لمحات اسے بے

قرار کئے ہوئے تھے۔ اسے انہی لمحات کے پلٹ آنے کی چاہت اور شوق تھا۔ اور اس فکر میں اس کے دیوانہ ہونے کا خدشہ تھا۔ اس مصیبت سے نجات کا کوئی راستہ ہو سکتا تھا تو یہی کہ وہ صحابہ کرامؓ یا تابعین عظام رحمہم اللہ میں سے کسی کا تعاون حاصل کرے۔ جو اسے رشد و ہدایت اور نیکی و تقویٰ کی راہ پر گامزن رکھے۔ کیونکہ قلبی امراض یعنی حرص و ہوا، جبن و بخل، حزن و ملال، حسد و کینہ اور حب و عشق پر سوائے دین اور تقویٰ کے اور کوئی چیز قابو نہیں پا سکتی۔ جب بھی کوئی محبّ یا عاشق اپنے لیے راحت و آرام چاہتا ہے تو اسے یہ چیز سچی توبہ اور اللہ تعالیٰ پر پختہ ایمان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ سہیلہ اپنا اکثر وقت مسجد نبوی میں گزارتی اور بزرگان دین کے وعظ و ارشاد سنتی اور زمین کے اس ٹکڑے پر عبادت کرتی جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ یہ جنت کا ٹکڑا ہے۔ جس شخص کا دل روحانی بیماریوں سے سلامت ہو اور اس کی بصیرت اندھے پن سے محفوظ ہو، اس شخص کو اس ٹکڑے سے پھولوں کی خوشبو اور نعمتوں کا مزا نصیب ہوتا ہے اور وہ تقویٰ کے دو پروں سے اڑ کر جنت کی سیر کرتا ہے۔

فروخ جہاد میں مصروف ہو گیا۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے اس کے گھر چاند جیسا بیٹا دے دیا۔ جو چند سالوں کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ سہیلہ نے اب بیٹے پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور اسے سرمایہ حیات بنا لیا۔ رات دن اس کی تربیت سے دل بہلاتی، اسے محبوب شوہر کی یادگار سمجھتی اور اُسے اس کے باپ کی باتیں سناتی۔ جب کبھی کوئی قافلہ مشرق سے آتا، اس سے فروخ کے متعلق دریافت کرتی اور آج آیا اور ابھی آیا کے تخیل میں محو رہتی اور اتنی محو کہ اپنے آپ کو اس کے بازوؤں میں پاتی اور اسے اتنی لمبی مدت گزارنے پر عتاب کرتی۔ پھر بیٹا آجاتا تو اس کی ناز و ادا

میں مشغول ہو جاتی۔ اس عرصے میں قافلے آتے جاتے رہے لیکن فروخ کی خبر معلوم نہ ہو سکی تا آنکہ گھر کا خرچہ ختم ہو گیا، ہاتھ تنگ ہو گیا۔ صرف تیس ہزار دینار والا خزانہ باقی رہ گیا سہیلہ امانت کو ہاتھ نہ لگاتی اور بیٹے کو دلاسا دیتی۔ کہتی:

ماں: اے بیٹا کل تک تیرا باپ آجائے گا اور اس کے پاس بہت سی رقم ہو گی تو ہم اس حلال روزی سے عیش و آرام کی زندگی گزاریں گے۔

بیٹا: امی میرا ابو کب آئے گا؟

ماں: عنقریب آنے والے قافلے کے ساتھ آئے گا۔

دونوں میں فروخ کا تذکرہ ہوتا رہتا اور اس طرح ان کا وقت کٹ جاتا اور ساتھ ساتھ روزانہ آنے جانے والے قافلوں سے فروخ کے متعلق دریافت جاری رہتی۔

ایک دن ایک قافلہ آیا۔ سہیلہ نے اپنے محبوب شوہر کے متعلق اس سے خبر دریافت کی۔ اسے فروخ کی شکل و شباہت بتائی اور اس کا تعارف کروایا تو ایک شخص نے بتایا کہ اس نے اسی شباہت والے شخص کو اپنی آنکھوں سے میدان جہاد میں شہید دیکھا ہے۔

بس پھر کیا تھا، سہیلہ پر جو گزری وہ اس کا رب ہی جانتا ہے۔ وہ کیفیت الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ نہ الفاظ ہی میں اتنی سکت ہے کہ وہ اس کے غم واندوہ کو بیان کر سکیں۔ سہیلہ مغموم و مایوس ہو کر گھر لوٹ آئی اور اس نے اللہ رب العزت سے لو لگا لی۔ اپنے لخت جگر کو سرمایہ زندگی خیال کر کے علم و تقویٰ پر اس کی تربیت شروع کر دی۔ پورا خزانہ اس کی تعلیم و تربیت پر وقف کر دیا تا کہ وہ طلب علم کے لیے سفر کرے، اپنی اور اپنے ساتھیوں کی ضروریات پر اسے کام میں لائے۔

سالہا سال بیت گئے، حکومتیں بدل گئیں، حالات بدلتے رہے لیکن اسلامی

افواج کا سمندر، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا جھنڈا بلند کرتا ہوا بدستور ٹھاٹھیں مارتا رہا اور بڑے بڑے معرکے سر کرتا ہوا چین کی سرحد تک پہنچ گیا۔ خاقان چین اسلامی افواج کی ہیبت سے لرز گیا۔ اس نے اسلامی افواج کے سپہ سالار حضرت قتیبہ بن مسلم سے درخواست کی کہ وہ بغیر جنگ کے ہی ان کے مطالبات ماننے کو تیار ہے۔ حضرت قتیبہ نے فرمایا: امیر المومنین نے قسم کھائی ہے کہ وہ سرزمین چین کو روند کر ہی دم لیں گے۔ خاقان چین نے درخواست کی امیر المومنین اپنی قسم اس طرح پوری کر لیں کہ ہم اپنے ملک کی مٹی سے بھرا ہوا ٹوکرا ان کے قدموں میں ڈال آتے ہیں اور وہ اسے اپنے قدموں کے نیچے روند کر اپنی قسم پوری کر لیں۔ چنانچہ خلیفہ کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی تو انہوں نے اس پر صاد کیا اور یوں پورا چین اسلامی حکومت کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ بالآخر اسلامی افواج منصور و مظفر واپس لوٹیں اور ان ممالک کی طرف متوجہ ہوئیں جن کے باشندے اسلامی حکومت کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

فروخ کو ان مہموں میں ستائیس سال بیت گئے۔ اسلامی افواج کا یہ وظیفہ تھا کہ وہ دن کو فریضہ جہاد ادا کرتیں اور رات کو کچھ وقت اللہ کے سامنے راز و نیاز کرتیں اور عبادت کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے سرگوشیوں کا لطف اٹھاتیں۔ پھر جسم کا حق ادا کرنے کے لیے لیٹ جاتیں۔ مجاہدین اسلام فضل و شرف اور اخلاص کی عمدہ ترین مثال تھے دن کو میدان کے شیر اور رات کو لرزاں و ترساں عابد و زاہد ہوتے تھے۔ ایک رات جبکہ پورا لشکر نوافل ادا کر کے سو گیا۔ فقط پہرے دار اور ایک شخص جاگ رہا تھا۔

فروخ کو محسوس ہوا کہ کوئی خفیہ ہاتھ اس کے دل کو چھو رہا ہے اور اسے اس کے ماضی کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ ستائیس سال کے عرصہ کو رات کے اندھیرے میں یاد کرتا ہے اور بے قرار ہو کر خیمے سے باہر نکل آتا ہے۔ ایسی پر سکون

رات جس میں پہرے داروں کی آواز کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ فوج کے پڑاؤ سے باہر نکلنا شروع کر دیتا ہے۔ کوئی پہرے دار اس کو نہیں روکتا کیونکہ سب اسے جانتے ہیں۔ شاید وہی اکیلا پرانا ستائیس سالہ مجاہد ہو جو کبھی لشکر سے جدا نہ ہوا ہو۔ وہ چل کر پہاڑ پر کھلی فضا میں مشرق کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ پو پھوٹنے کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس نے مغرب کی طرف منہ کر لیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل پسیجا جا رہا ہے۔ وہ عالم تصور میں اپنی سہیلہ کے چاند جیسے مکھڑے کو دیکھنے لگتا ہے کہ وہ دروازے پر کھڑی سفر پر نہ جانے کی درخواست کر رہی ہے لیکن وہ اس کی پروا نہیں کرتا۔ جب وہ گھر سے نکلا تھا تو رات چاندنی تھی۔ گویا ابھی کل ہی کی بات تو ہے۔ وہ عقیق کی راتوں اور اپنے ساتھیوں کو یاد کرتا ہے۔ پھر اپنی موجودہ صورت حال پر غور کرتا ہے کہ فی سبیل اللہ شہید تو ہو جاؤں گا مگر اللہ رب العزت نے مجھ سے میری بیوی کے حقوق کے متعلق جواب طلبی کر لی تو پھر؟ تب وہ سہیلہ کے متعلق سوچنے لگا کہ آیا وہ زندہ بھی ہے یا رنج والم سے فوت ہو گئی ہے؟

وہ مدینہ منورہ میں ہے یا کسی اور جگہ کوچ کر گئی؟ وہ وفاداری کے عہد پر قائم ہے یا شیطان نے اسے بے حیائی کی راہ پر لگا دیا ہے؟

تیس ہزار دینار (کم وبیش پچاس لاکھ روپے) کے خزانے کے ساتھ کیا گزری ہو گی؟ محفوظ رہا ہے یا خرچ ہو چکا ہو گا۔ اگر وہ فوت ہو گئی ہے تو مال کے ساتھ کیا گزری! اس طرح ستائیس سالہ عرصہ حیات کے وہ صفحات الٹنے لگا۔ اور سوچنے لگا کہ جب اس نے بستر عروسی پر اپنی بیوی کو جدائی دی تھی تو اسے کتنی تکالیف اور کتنے غم اٹھانے پڑے ہوں گے۔

پھر وہ اس لطف وسرور کا تصور کرنے لگا جو اسے سہیلہ کی ملاقات سے حاصل ہو گا۔ چاہا کہ ابھی اڑ کر مدینہ پہنچ جائے۔ جب وہ گھر سے نکلا تھا تو اس کے سر اور

ڈاڑھی کے بالوں میں سے ایک بھی سفید نہ تھا۔ اب سارا سر اور ڈاڑھی سفید ہو چکی تھی۔ وہ سوچنے لگا، کہ میں تو ستائیس سال سے مدینۃ الرسول (ﷺ) کو بھی نہ دیکھ سکا۔ اور نہ ہی عقیق کی بارونق راتوں سے لطف اندوز ہوا اور نہ بیوی کی خبر گیری کر سکا۔

فروخ کو بیوی اور وطن کی یاد ستانے لگی چنانچہ اس نے فوراً امیر لشکر سے واپسی کی اجازت لی اور گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ شدت شوق کی وجہ سے جہاں کہیں رات پڑتی وہاں سے فوراً کوچ کرتا۔ اس طرح میدانوں اور شہروں کو طے کرتا اور سوچتا ہوا کہ یہ دینار جو مال غنیمت سے ملے ہیں یہ ان تیس ہزار میں جمع کروں گا جو میں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اور بقیہ زندگی آرام، سکون سے بسر کروں گا۔ وہ اس قدر تیزی سے چلتا تھا گویا موت سے مقابلہ کر رہا ہو اور ڈر رہا ہو کہ مبادا وہ اسے راستے ہی میں نہ آ دبوچے۔ چنانچہ وہ گھوڑے کو ایڑ لگاتا اور دوڑاتا ہوا جزیرہ عرب میں پہنچ گیا۔ جونہی اسے وہاں کے ریگستان اور پہاڑ نظر آئے، اس کا دل مچلنے لگا۔ وطن مالوف، بیوی اور دوستوں کی ملاقات کے وجد آفریں شوق سے اُسے وہاں کی گرم ہوا ٹھنڈی معلوم ہونے لگی اور وہاں کا جسم کو جھلس دینے والا سورج سایہ دار محسوس ہونے لگا۔ جزیرۂ عرب کے چٹیل اور بے آب و گیاہ میدان اسے گلستان نظر آنے لگے۔ اسے وہاں کی ریت اور پہاڑ خوشنما دکھائی دینے لگے۔ جوں جوں وہ مدینۃ الرسول ﷺ کی حدود کے قریب ہوتا جا رہا تھا، خوشی سے جھومتا جا رہا تھا اور جونہی اسے جبل احد نظر آیا، اس کا دل سینے میں رقص کرنے لگا۔ اسے وہاں وہ رونق نظر آنے لگی جو اس نے کبھی دیکھی نہ تھی۔ سرخ اور نیلی رنگتوں والے پہاڑوں اور ریت کے سرخ ٹیلوں نے وہ کیفیت پیدا کر دی کہ جنھیں وہ دیکھتا ہی چلا جا رہا تھا اور اُکتاتا ہی نہ تھا۔ جب وہ جبل احد پر پہنچا تو اپنے آپ کو سب تفکرات سے آزاد کر کے آنے والے لذیذ سرزنش کے لیے تیار کرنے لگا۔ اسے جب مدینہ نظر آیا تو

اس کا دل خوشی سے پھولنے اور مچلنے لگا۔ اور جب مسجد نبویؐ نظر آئی تو اس نے سب چیزوں کو بھلا دیا۔ ان دنوں مسجد پر گنبد وغیرہ نہ بنے تھے۔ گھر کی بجائے مسجد الرسول ﷺ کا رخ کیا تا کہ مسجد میں نماز ادا کرے اور پھر سرور دو عالم ﷺ پر سلام پڑھے۔ اس نے نوافل ادا کیے اور رسول کریم ﷺ پر سلام پڑھا۔ وہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک حلقے کی شکل میں بہت سے لوگ جمع ہیں۔ بڑی بڑی پگڑیوں والے بزرگ ایک شخص کے ارد گرد بیٹھے درس سن رہے ہیں۔

اس نے دور ہی سے دیکھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ اس نے اپنی پیشانی کے نصف سے زیادہ حصے کو عربی رومال سے چھپا رکھا تھا چنانچہ وہ وہیں بیٹھ کر خطاب سننے لگا۔ وعظ وارشاد ایسا تھا کہ فروخ کے دل میں یہ خیال مچلنے لگا۔ کاش وہ بھی علم حاصل کرتا اور اس طرح کے منصب پر فائز ہو جاتا۔ عصر کی اذان ہوئی تو جلسہ منتشر ہو گیا۔ اس نے باجماعت نماز ادا کی اور اس کے بعد ساتھ والے نمازی سے پوچھا۔

فروخ: یہ کون صاحب درس دے رہے تھے؟

نمازی: بڑا تعجب ہے! کیا تو انھیں نہیں جانتا؟ یہ امام ربیعۃ الرائے ہیں۔ بھائی! آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟

فروخ: مسافر ہوں، ابھی ابھی سفر سے آیا ہوں۔ ربیعۃ الرای کون ہے؟

نمازی: یہ اس شہر کے امام اور فقیہ ہیں۔ یہ مالک بن انس، سفیان ثوری اور شعبہ کے استاد ہیں۔ ان کے حلقہ درس میں چالیس افراد ایسے ہیں جو بذات خود حدیث کے امام ہیں۔ انہوں نے کیا خوب بیان فرمایا۔ بتاؤ! تم نے اس جیسا بیان کبھی سنا؟

فروخ: واہ! سبحان اللہ۔

اس گفتگو کے بعد فروخ نے گھوڑا کھولا اور نیزہ پکڑ کر اس پر سوار ہوا اور اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ اپنے دروازے پر دستک دی تو گھر کے اندر سے ایک حسین و جمیل نوجوان نکلا۔ اس کے پیچھے فروخ کی بیوی سہیلہ تھی جسے فروخ نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ نوجوان نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ اس نوجوان کی طرف دیکھ کر غیرت سے فروخ کا خون کھول اٹھا اور اسے ڈانٹتا ہوا گھر میں داخل ہونے لگا۔ نوجوان تعجب کرتا ہوا چلا آیا۔

نوجوان: اللہ کے دشمن تو بغیر اجازت میرے گھر میں کیوں گھستا ہے؟

فروخ: اللہ کا دشمن تو ہے۔ تو میری بیوی کے ساتھ میرے گھر میں کیوں پھر رہا ہے؟

دونوں الجھنے لگے، جھگڑا طول پکڑ گیا۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ شاگرد بھی اپنے استاد کی مدد کو پہنچے۔ نوجوان کہہ رہا تھا ''میں تجھے حاکم شہر کے سامنے پیش کیے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔

فروخ: اللہ کی قسم میں تجھے امیر شہر کے پاس ضرور لے جاؤں گا۔ تو میرے گھر میں میری بیوی کے ساتھ پھر رہا ہے۔ شور بلند ہوا، لوگوں نے ان کے باوقار تلمیذ کو دیکھا تو خاموش ہو گئے۔

تلمیذ: جناب آپ کسی اور جگہ بھی تو ٹھہر سکتے ہیں!

فروخ: جناب یہ میرا گھر ہے۔ میں ابوعبدالرحمٰن فروخ ہوں۔

جونہی بیوی کے کان میں یہ آواز پڑی تو وہ لپکتی ہوئی آئی اور اس نے لوگوں سے کہا، یہ میرا خاوند ہے اور یہ نوجوان ربیعہ اس کا بیٹا ہے۔ یہ مجھے الوداع کہہ کر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکل گیا تھا اور ربیعہ اس وقت میرے بطن میں تھا۔ اتنا تعارف ہوتے ہی دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر دیر تک روتے رہے۔ اس کے بعد فروخ گھر میں داخل ہو گیا۔

ربیعہ ضروری اشیاء لانے کے لیے گھر سے باہر چلے گئے اور یہ دونوں میاں بیوی بیٹھے باتیں کرنے لگے۔

فروخ: سہیلہ معاف کرنا اللہ کے لیے مجھے بخش دینا؟ طویل ترین غیر حاضری میرا بڑا جرم تھا لیکن میں تجھ سے بے حد پیار کرتا ہوں۔

سہیلہ: کیا اب بھی تو مجھ سے محبت کرتا ہے حالانکہ میں بوڑھی ہو چکی ہوں۔

فروخ: سہیلہ، اخلاص ہی خوبی ہے اور یہی سب سے بڑھ کر خوبصورتی ہے! تو اب بھی مجھے دنیا کی تمام عورتوں سے خوبصورت لگتی ہے۔

کچھ وقت اس طرح کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے بعد فروخ نے چار ہزار دینار سہیلہ کو دیئے اور کہا اب ہم اللہ تعالیٰ کے فضل سے آسودہ حال ہیں۔ انھیں ان تیس ہزار دینار میں ملا لیجئے۔ تمھارے پاس وہ دینار محفوظ تو ہوں گے۔ ذرا مجھے وہ بھی دکھاؤ۔

سہیلہ کچھ دیر توقف کر کے بولی: آپ نے مسجد میں نماز نہیں پڑھی؟

فروخ: ہاں پڑھی ہے، وہاں بڑا دلچسپ منظر دیکھنے میں آیا مخلوق جمع تھی، سناٹا چھایا ہوا تھا اور ایک عالم درس دے رہا تھا۔ سبحان اللہ ایسا منظر تو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ بہت خوب بیان ہو رہا تھا۔ وہ تو کوئی بڑا ہی صاحبِ علم شخص تھا۔ بڑے بڑے لوگ اس کے بیان سے مستفید ہو رہے تھے۔ اس کا بیان انبیاء کا کلام معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے تو اپنے آپ پر افسوس ہونے لگا کہ کاش میں بھی علم حاصل کر کے اس طرح درجہ فضیلت حاصل کرتا۔

سہیلہ: کیا آپ کو یہ بات پسند ہے کہ تم عالم دین بن جاتے اور تیس ہزار دینار آپ کے پاس نہ ہوتے؟

فروخ: واللہ! مجھے یہ درجہ بہت ہی محبوب ہے۔ کاش میں بھی ایسا عالم دین ہوتا!

سہیلہ: کیا آپ کو یہ پسند ہے کہ وہ دینار صرف ہو جائیں اور آپ کا بیٹا ہی ایسا عالم ہو؟

فروخ: اللہ کی قسم مجھے یہ بات بھی بڑی محبوب ہے کہ میرا لخت جگر ایسا عالم دین بن جائے۔

سہیلہ: وہ عالم دین جو مسجد نبویؐ میں علماء اور عوام الناس میں درس حدیث دے رہا تھا وہ آپ کا یہی بیٹا ہی تو ہے۔ میں نے وہ تیس ہزار دینار اس کی تعلیم پر خرچ کر دیئے ہیں۔ کیا آپ تیس ہزار دینار کے بدلے اسے خرید نہیں لیتے؟

فروخ: کیا وہ عالم دین میرا ہی بیٹا ہے؟

اس کے پورے جسم میں سرور اور شادمانی کی لہر موجزن ہو گئی اور خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور وہ وفور مسرت سے اچھل کر گھر سے باہر آیا اور دیوانہ وار اپنے نوجوان بیٹے کو تلاش کرنے لگا تا کہ اسے دوبارہ اپنے سینے سے چپکا کر تسکین حاصل کرے۔

چنانچہ یہی امام ربیعۃ الرای آسمان علم پر ستارہ بن کر چمکا۔ نہ صرف یہ کہ خود امام تھا بلکہ بڑے بڑے آئمہ دین کا استاد بنا۔ پوری اسلامی دنیا اس ماں اور اس کے مایہ ناز سپوت پر فخر کرتی ہے۔

کاش کہ آج کی مائیں بھی اس دانشمند خاتون کی طرح ایمان اور تقویٰ کا چراغ ہاتھ میں لیے اپنے بیٹوں کی پرورش کریں اور انھیں علوم دینیہ کے لیے وقف کر دیں۔

......☆......

[1] اس قصے کا اصل تاریخ بغداد (ج:۸/۴۲۱) اور وفیات الاعیان (۷:۱/۱۸۲) میں ہے لیکن ہمارا ماخذ قصص من التاریخ للشیخ الطنطاوی ہے۔

مومنہ خاتون کی بیمثال استقامت[1]

شب معراج میں جب رسول کریم ﷺ ایک نہایت خوبصورت اور وسیع و عریض محل پر سے گزرے تو اس کی معطر فضاؤں نے آپ کو حیران کر دیا۔ وہاں کی بھینی بھینی خوشبوئیں نہ صرف یہ کہ محل کے ماحول کو مہکا رہی تھیں بلکہ گزرنے والوں کے دماغوں کو تازگی و شادابی عطا کر رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے متعجب ہو کر جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کس کا ٹھکانا اور کس کی ملکیت ہے؟ انہوں نے ارشاد فرمایا: یہ فرعون کے گھر والوں کی ماشطہ اور اس کے معصوم بچوں کا محل ہے۔

سبحان اللہ! مومنہ خاتون یہ محل، جس میں اس کی اور اس کے معصوم پھولوں کی روحیں ہنسی خوشی سے برزخی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ دراصل یہ اس قربانی کا بدل اور صلہ ہے جو اس نے ایمان قبول کرنے کی خاطر دی۔

دولت دنیا سے محروم اور دولت ایمان سے مالا مال یہ خاتون اپنے پھولوں جیسے خوبصورت اور کبوتروں کی طرح بھولے بھالے معصوم بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اس دور کے مغرور و سرکش بادشاہ کے محل میں مزدوری کرنے جاتی اور دن بھر کام کر کے شام کو واپس لوٹتی۔ معصوم بچوں کو کھانا کھلاتی اور اللہ کا شکر ادا کر کے سو جاتی۔ صبح سویرے بچوں کو ناشتہ تیار کر کے کھلا دیتی اور محل میں جا کر اپنے ذمہ لگائے گئے کام سرانجام دیتی۔

چونکہ یہ خاتون نہایت پاکباز اور دانشمند تھی، اس لیے عرصہ دراز سے شاہی محل

میں تعینات رہی اور اپنے امور خوش اسلوبی سے سرانجام دیتی رہی۔

ان دنوں سیدنا موسیٰ کلیم اللہ (علیہ الصلوۃ والسلام) اور فرعونِ مصر کے درمیان مقابلہ زوروں پر تھا۔ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی حیرت انگیز کامیابیوں نے اور اس کے حواریوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ چونکہ اس متکبر ظالم کے پاس اقتدار تھا فرعونِ مصر اس لیے وہ جب کبھی سنتا کہ اس کی قوم کے کسی باشندے نے ایمان قبول کر لیا ہے تو اسے خوفناک سزائیں دیتا۔ کسی کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیتا اور کسی کو لکڑی کے تختے پر لٹکا کر اس کے ہاتھوں اور پاؤں پر میخیں ٹھونک کر سرعام لٹکا دیتا۔ اس کے اسی طرح کے مظالم کے دورانیہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت فرعون کے محل میں بھی پہنچ گئی تھی۔ اس کا خازن، ایک خادمہ اور بیوی آسیہ بھی ایمان قبول کر چکی تھیں۔ وہ جب کبھی سنتیں کہ سیدنا موسیٰ غالب رہے ہیں اور فرعون زچ ہو گیا ہے، تو وہ دل ہی دل میں خوش ہوتیں اور اپنے ایمان کا اظہار نہ کرتیں مبادا کہ فرعون کو بھنک پڑ جائے اور وہ انھیں عذاب کی چکی میں پیس ڈالے۔

فرعون کی قوم میں سے ایمان قبول کرنے والی مومنہ خاتون شاہی محل کی خواتین کو کنگھی کیا کرتی تھی۔ ایک روز وہ فرعون کی نوجوان اور نازک مزاج بیٹی کو کنگھی کر رہی تھی کہ اچانک اس کے ہاتھ سے کنگھی گر گئی۔ اسے اٹھاتے وقت بے ساختہ اس کی زبان سے ''بسم اللہ'' نکل گیا۔ جب فرعون کی نازک مزاج اور شوخ و طرار بیٹی نے یہ کلمہ سنا تو چونک پڑی اور پوچھا: یہ اللہ کون ہے؟

''جو میرا، تیرا اور تیرے باپ کا رب ہے'' (مومنہ نے جواب دیا)

وہ کہنے لگی: کیا میرا باپ سارے لوگوں کا رب نہیں ہے؟

''جی نہیں بلکہ لوگوں کا رب تو وہ ہے جو مجھے، تجھے اور تیرے باپ کو روزی دیتا ہے۔

اچھا اس کا مطلب یہ ہے کہ تو میرے باپ کے علاوہ کسی اور کو رب سمجھتی ہے؟

جی ہاں! میرا، تیرا اور تیرے باپ کا رب اللہ ہی ہے۔

یہ سن کر فرعون کی لڑکی سیخ پا ہو گئی اور اس نے اپنے باپ کو اطلاع کر دی۔

فرعون جو کہ اس ایمان کا مقابلہ محل سے باہر کر رہا تھا جب اسے اطلاع ملی کہ موسیٰ کی دعوت تو میرے محل میں داخل ہونے لگی ہے اور میرا کھانے والے بھی اس کی دعوت پر، ایمان قبول کر رہے ہیں تو وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے اس بات کا سخت نوٹس لیا اور اپنی خادمہ کو بر سر دربار بلا کر جواب طلبی کی:

''مجھے اطلاع ملی ہے کہ تو میرے سوا بھی کسی کو رب مانتی ہے؟ کیا یہ بات درست ہے؟''

جی ہاں: یہ بات درست ہے کہ میرا اور تیرا رب اللہ تعالیٰ ہی ہے، جو بلند اور بزرگ و برتر ہے۔ وہ ظالم یہ سن کر بگڑ گیا اور آگ بگولہ ہو کر سپاہیوں کو حکم دینے لگا کہ تانبے والی دیگ کو گرم کرو اور جب وہ آگ جیسی ہو جائے تو مجھے اطلاع کرنا۔ اس کے بعد فرعون نے اس بی بی کو بلایا اور دھمکی دی کہ اگر تو نے میری خدائی تسلیم نہ کی اور اس بات پر قائم رہی جو موسیٰ کہتا ہے تو میں تیرے سامنے تیرے بچوں کو اس دیگ میں پھینکواؤں گا اور آخر میں تجھے بھی نذر آتش کر دوں گا۔

معصوم اولاد ماں باپ کی بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ جس کے پاس اولاد نہ ہو وہ کائنات میں مارا مارا پھرتا ہے اور اپنی آرزو پوری کرنے کے لیے ضعیف الاعتقادی کی بنا پر وہ کچھ بھی کر بیٹھتا ہے جو ایمان اور اسلام کے منافی ہوتا ہے اور جس کے پاس اولاد ہوتی ہے وہ اس کے اندر اپنی جان سمجھتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی کوئی بچہ ماں سے ناراض ہو کر گھر سے نکل جاتا ہے تو اس کی ماں ماری ماری پھرتی ہے۔ کبھی مسجدوں میں اعلان کراتی ہے اور کبھی ریڈیو، ٹیلی ویژن پر۔

اخبارات میں اشتہارات چھپتے ہیں کہ گم شدہ بچے کی والدہ تڑپ رہی ہے اور بستر مرگ پر پڑی ہے۔ خدارا اس کی مامتا پر رحم کیجئے اور بچے کا پتہ بتلایئے۔ بچوں سے محبت کا معاملہ انسانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ جذبہ حیوانوں اور پرندوں، درندوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ اخبارات میں آیا کہ کسی ملک کے چڑیا گھر والوں نے جنگل سے چیتے کا بچہ حاصل کرنے کے لیے بذریعہ طیارہ جنگل میں پہنچ گئے۔ وہاں چیتے کے بچے کو اکیلا پاکر، فوراً طیارے میں لے آئے اور اس کا منی گیٹ بند کر کے طیارے سٹارٹ کرنے لگے۔ اس عرصے میں بچے کی ماں آکر طیارے سے چمٹ گئی۔ جونہی طیارہ اڑا وہ بھی اس کے ساتھ فضاء میں لہرانے لگی۔ پائلٹ نے یہ صورت حال دیکھ کر ترس کھایا اور طیارہ اتار کر بچہ رہا کر دیا۔ وہ دونوں ماں بیٹا ہنسی خوشی اچھلتے کودتے جنگل میں داخل ہو گئے۔ غرضیکہ بچے ماں باپ کی بڑی کمزوری ہوتے ہیں۔ جب وہ بیمار ہو جائیں تو ماں باپ کے لیے دنیا اندھیر ہو جاتی ہے اور جب وہ مسکرا دیں تو والدین کے لیے کائنات روشن ہو جاتی ہے۔

فرعون لعین نے جب اس مومنہ خاتون کو بچوں کے جلا ڈالنے کی دھمکی دی، اس نے کمال استقامت کا مظاہرہ کیا۔ نہایت اطمینان وسکون سے جواب دیا اور کہا کہ میں تو اس حقیقت پر ایمان رکھتی ہوں کہ میرا اور تیرا رب اللہ ہی ہے۔ اگر تو اس کی پاداش میں مجھے اور میرے بچوں کو مار ڈالے گا تو میں صبر کروں گی۔ چنانچہ اس ظالم نے جب دیکھا کہ دیگ گرم ہو کر آگ کی طرح دہکنے لگی ہے تو اس نے اس کے بچوں کو پکڑوا کر اس کے سامنے کھڑا کر دیا اور کہا کہ اب بھی وقت ہے موسیٰ کے دین سے پھر جا اور بچوں کے ساتھ زندگی گزار۔ لیکن یہ خاتون نہ تو بچوں کے بغیر رہ سکتی تھی اور نہ ایمان کے بغیر، چنانچہ اس نے ایمان کی خاطر اپنی اور اپنے بچوں کی

جان کی قربانی دینے کا عزم مصمم کر لیا اور کہا کوئی بات نہیں تو جلانا چاہتا ہے تو جلا دے، اس ذات پاک پر تو ہماری جان بھی قربان ہے۔ البتہ اس نے اتنی درخواست کی کہ میری اور میرے بچوں کی ہڈیوں کو ایک ہی جگہ دفنایا جائے۔

فرعون نے کہا ٹھیک ہے تو نے عرصہ دراز تک ہماری خدمت کی ہے اس کے صلے میں ہم تیری یہ درخواست منظور کرتے ہیں۔

اس کے بعد لعین نے اس کے ایک معصوم بچے کو دہکتی ہوئی دیگ میں پھینکوا دیا۔ آن کی آن میں اس کے معصوم کی ہڈیاں نظر آنے لگیں۔ فرعون انتظار کرنے لگا کہ اب یہ خاتون میرے پاؤں پکڑ کر منت سماجت کرے گی۔ لیکن اس اللہ کی بندی نے اس جانکاہ صدمے کو نہایت استقلال سے برداشت کیا اور صبر و شکیب کا مجسمہ بنی رہی۔ پھر اس نے دوسرا بچہ بھی پھینکوا دیا۔ لیکن یہ حرف اف تک زبان پر نہ لائی اور ایمان پر قائم رہی۔ اس کے بعد فرعون نے تیسرا بچہ پھینکوا دیا۔ وہ بھی آن کی آن میں جل گیا اور اس کی ہڈیاں صاف نظر آنے لگیں جب اس نے دیکھا کہ یہ تو ٹس سے مس نہیں ہوتی تو اس کی آتش غضب بھڑکی اور چوتھا بچہ بھی دیگ میں پھینکوا دیا۔

سب سے آخر میں چھوٹے بچے کی باری آئی اور وہ اس وقت اپنی ماں کی چھاتی سے دودھ پی رہا تھا۔ فرعون کے سپاہیوں نے جب اسے ماں کی گود سے چھینا اور اسے گھسیٹتے ہوئے دیگ کی طرف لے جانے لگے تو ماں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس کے سامنے دنیا اندھیر ہو گئی اور قریب تھا کہ وہ دیوانی ہو جاتی، لیکن بچے کو اللہ نے قوت گویائی عطا فرمائی اور وہ بولا امی جان! صبر کرو۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی راہ میں قربانی دینا افضل نیکی ہے۔

اسے صبر آ گیا۔ آخر میں اسے بلا کر کہا گیا: ”اب تو تیری عقل ٹھکانے آ گئی ہو گی؟“ اس نے جواب دیا: جی ہاں! میری عقل ٹھکانے پر ہی ہے اور میں اسی

بات پر ثابت قدم ہوں کہ میرا اور تیرا رب اللہ ہی ہے۔ فرعون یہ جواب سن کر مزید بگڑ گیا اور اسے بھی بچوں کے ساتھ پھینکنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ جب اسے بھی دیگ میں پھینک دیا گیا تو فرعون کی بیوی آسیہ نے بھی ایمان کا اظہار کر دیا اور اسے اس سے زیادہ المناک مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے بھی سولی پر چڑھا دیا گیا اور اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں میخیں ٹھونک دی گئیں اور اسے تختے سمیت دھوپ میں لٹکا دیا گیا۔

وہ بے چاری کئی دنوں تک سسک سسک کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ لیکن آخر دم تک ایمان پر قائم رہی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی قربانیوں کو قبول فرمایا اور جنت میں اپنے پاس انھیں جگہ عطا فرمائی۔

......☆......

[1] اس قصے کا اصل تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

نوخیز مجاہد اسلام کا شوقِ شہادت[1]

حضرت ابوقدامہ شامی اپنے مجاہد ساتھیوں کے ہمراہ رقہ میں جہاد کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ اسی دوران شہداء کرام کے خاندان کی ایک غریب اور مسکین خاتون شرم و حیاء کی چادر میں مستور ان کی خدمت میں پیش ہوئی اور اپنے سر کے سنہری اور ریشم و حریر جیسے نرم اور نازک سیاہ بالوں سے بٹی اور مٹی میں اٹی بالوں کی مینڈھیاں پیش کر کے گزارش کرنے لگی:

مجھے پتہ چلا ہے کہ تم جہاد کے لیے گھوڑے کس رہے ہو۔ اور اگر ہمارے پاس بھی گھوڑے ہوتے تو وہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیتیں تاکہ تم ان پر سوار ہو کر نیزہ بازی اور شمشیر زنی کرتے۔ لیکن میرے پاس میرے اپنے بالوں کی بٹی ہوئی یہ مینڈھیاں ہیں۔ اگر یہ آپ کو درکار ہوں تو خود رکھ لیجیے ورنہ کسی اور بھائی کو دے دیجیے شاید کہ میرے بالوں پر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلنے والوں کے پاؤں کا گرد و غبار پڑ جائے اور مجھ پر جہنم کی آگ حرام ہو جائے۔

مور کے پروں جیسے سنہری اور ریشم و حریر کی مانند جیسے نرم و نازک سیاہ بال عورتوں کی بہت بڑی کمزوری ہوتے ہیں۔ وہ ان بالوں کو بڑھانے اور ان کی سیاہی برقرار رکھنے کے لیے مختلف جڑی بوٹیوں کے تیل استعمال کرتی ہیں، تاکہ وہ اپنے آپ کو جاذب نظر اور پر کشش بنا سکیں اور انھیں دیکھنے والے دن کو چین اور راتوں کو سکون کی نیند سو نہ سکیں۔ جواں خواتین تو ایک طرف رہیں، ادھیڑ عمر کی بھی سیاہ

خضاب لگا کر اپنے بیٹوں کی عمر کے نوجوانوں کو فتنہ میں مبتلا کر رہی ہیں۔ لیکن اس پاکباز خاتون کو اپنے حسین و جمیل شوہر کی شہادت کے بعد اپنے سر کے سنہری بال بڑھانے اور بکھیرنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی کیونکہ

اس نے اپنے بالوں کو مجاہدین کے ان گھوڑوں کی رسیاں بنانا تھا جن کے قدموں کی ٹاپوں کی قسم اللہ نے قرآن میں کھائی ہے۔

﴿ وَالْعٰدِيَاتِ ضَبْحًا ۝ فَالْمُوْرِيَاتِ قَدْحًا ۝ فَالْمُغِيْرَاتِ صُبْحًا ۝ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝ ﴾ (العادیات:۱تا۵)

''ان سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم، جو ہانپ اٹھتے ہیں۔ پھر پتھروں پر نعل مار کر آگ نکالتے ہیں۔ پھر صبح کو چھاپہ مارتے ہیں۔ اور اس وقت گرد اڑاتے ہیں۔ پھر (دشمنوں کی فوج میں) اُسی وقت جا گھستے ہیں۔''

چنانچہ اس نے اپنے سنہری بال کاٹے اور ان کی خوبصورتی ختم کرنے کے لیے انھیں مٹی میں آلودہ کر کے مجاہدین کے گھوڑوں کی رسیاں بنا لیں اور انھیں ابوقدامہ کی خدمت میں پیش کر کے درخواست کی کہ اگر ہم عورتوں پر جہاد و قتال فرض ہوتا تو میں بھی پیچھے نہ رہتی۔ میرے پاس میرے محبوب شوہر کی عزیز از جان یادگار ہے جسے میں دیکھ کر جی رہی ہوں اور وہ ہے میرا چاند سا خوبصورت نوخیز بیٹا جو اپنے باپ کی جائیداد کی دیکھ بھال کے لیے رقہ سے باہر گیا ہوا ہے۔ اگر وہ تمھارے نکلنے سے پہلے آ گیا تو میں اسے بھی تمھارے پاس جہاد فی سبیل اللہ کے لیے روانہ کردوں گی۔ میرا وہ لختِ جگر پندرہ برس کے سن و سال میں ہی شمشیر و سنان، تیر و تفنگ اور جملہ فنون سپہ گری میں مہارت تامہ حاصل کر چکا ہے۔ جس طرح وہ حسن صورت میں عدیم المثال ہے، اسی طرح حسن سیرت میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔

وہ قرآن کا بہترین قاری ہونے کے ساتھ ساتھ قائم اللیل اور صائم النہار بھی ہے۔ میں نے اپنے محبوب شوہر کی خواہش اور دلی آرزو کے مطابق اس کی تربیت کی ہے تاکہ وہ بھی جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے اپنے والد اور ماموں سے جا ملے۔ سردست آپ یہ کام کریں کہ میرے سامنے اس رسی کو اپنے تھیلے میں ڈال لیں تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے کہ میری پرخلوص متاع جہاد میں رائیگاں نہیں گئی۔

ابو قدامہ شامی نے وہ رسی اپنے تھیلے میں ڈال لی اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ رقہ سے نکل پڑے۔ ابھی مسلمہ بن عبدالملک اموی کے قلعے تک پہنچے ہی تھے کہ انھیں پیچھے سے آواز سنائی دی: ''ابو قدامہ! ذرا ٹھہرو۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے!''

ابو قدامہ ٹھہر گئے اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے: ''تم چلتے رہو میں اس گھڑ سوار کی بات سن لوں وہ کیا کہتا ہے؟

چنانچہ وہ نقاب پوش شہسوار ان کے پاس آ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور ان سے معانقہ کرنے کے بعد کہنے لگا: اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے تمھاری رفاقت عطا فرمائی اور ناکام نہ لوٹایا۔

ابو قدامہ شامی نے اس سے خوش گوار لہجے میں فرمایا: ''عزیز من اپنا نقاب اتار کر گفتگو کیجیے تاکہ میں آپ کی عمر کا اندازہ کر سکوں کہ آپ پر جہاد واجب ہو تو اپنے ساتھ لے چلوں ورنہ آپ کو واپس جانے کے لیے کہہ دوں۔

ابو قدامہ کی اس فرمائش پر گھوڑ سوار نے اپنا نقاب اتارا تو وہ یوں نظر آیا جیسے چودھویں رات کا دمکتا ہوا چاند اور لشکارے مارتا ستارہ ہو۔

اس عمر کے خوبصورت اور نوجوان بچے والدین کے نور نظر اور دلوں کے ارمان ہوتے ہیں۔ اگر وہ بیمار ہو جائیں تو والدین کے لیے دنیا میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ وہ اس کی موہوم موت کے خطرے سے کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں اور اس کے علاج

کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ جونہی وہ بچہ مسکرادے، ان کے لیے کائنات روشن ہو جاتی ہے۔ خصوصاً وہ نو عمر لخت جگر جو اطاعت شعار اور والدین کے فرمانبردار بھی ہوں ان کے اندر تو والدین کی جان ہوتی ہے۔

ابو قدامہ شامی کو اس بچے کے چہرے پر علم وحلم، جود وکرم، شرافت، دیانت، صداقت، سیادت اور قیادت کے آثار نظر آئے تو انہوں نے اس نوخیز سے پوچھا: عزیز من تیرا باپ زندہ ہے؟

اس نے جواباً عرض کی: وہ تو اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے ہیں اور میں کفار سے ان کا انتقام لینے کے لیے آپ کے ساتھ نکلا ہوں اور میں بھی اسی طرح اللہ کی راہ میں شہید ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح اللہ نے میرے والد کو شہادت عطا کی ہے اس طرح مجھے بھی عطا فرمائے گا۔

ابو قدامہ نے پوچھا: ''میرے عزیز! تیری والدہ زندہ ہے؟''

اس نے جواب دیا: ''ہاں''

ابو قدامہ: تو پھر اس کے پاس جا اور اس سے اجازت طلب کر۔ اگر وہ اجازت دے دے تو فبہا ورنہ اس کے پاس رہو۔ کیونکہ تیرا اس کی فرمانبرداری کرنا جہاد سے افضل ہے۔ جنت تلواروں کے سائے میں اور ماؤں کے قدموں تلے ہے۔

وہ کہنے لگا: ''چچا جان آپ مجھے پہچانتے نہیں؟ میں آپ کے پاس امانت رکھنے والی خاتون کا بیٹا ہوں۔ آپ اتنی جلدی میری ماں کی وصیت بھول گئے وہ میری ماں ہی تھی جس نے آپ کو اپنے سر کے بالوں سے بٹی ہوئی رسی دی تھی اور آپ کو اسلام کی حرمت کا حوالہ دے کر درخواست کی تھی مجھے ثواب سے محروم نہ رکھنا۔

ان شاء اللہ میں شہید بن شہید ہوں گا۔ میں آپ کو اللہ کے نام کا واسطہ دے کر درخواست کرتا ہوں کہ مجھے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے ساتھ لے چلیے۔ میں کوئی

نادان نہیں، بلکہ کتاب اللہ کا حافظ ،سنت رسول (ﷺ) کا عالم، تیر و تفنگ کا ماہر اور فنون سپہ گری سے واقف ہوں۔ لہٰذا مجھے کمسن سمجھ کر واپس نہ کیجئے، کیونکہ میرے گھرانے میں مجھ سے زیادہ فہم و فراست رکھنے والا اور کوئی نہیں ہے۔ پھر یہ کہ میری ماں نے مجھے قسم دے کر کہا تھا: بیٹے! واپس نہ لوٹنا۔

اور یہ بھی کہا تھا کہ اے میرے لخت جگر کفار سے مڈ بھیڑ کے وقت پیٹھ نہ پھیرنا۔ اپنی جان اللہ پر نثار کر دینا اور جنت میں اپنے پیارے باپ اور ماموں کے پڑوس کا سوال کرنا۔ جب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ تجھے شہادت عطا کر دے تو میری بخشش کی سفارش کرنا۔ اہل علم نے مجھے بتایا ہے کہ شہید اپنے گھرانے کے ستر (۷۰) آدمیوں اور ستر (۷۰) ہمسائیوں کی بخشش کی سفارش کرے گا اتنا کچھ کہنے کے بعد اس نے مجھے اپنے سینے سے چپکایا اور آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا: اے میرے اللہ، اے میرے خالق! یہ میرا بچہ میرے جگر کا ٹکڑا اور میرے دل کا پھول ہے۔ میں اسے تیرے سپرد کرتی ہوں۔ اسے اس کے باپ سے ملا دے۔

ابو قدامہ نے یہ بات سنی تو اس نوجوان لڑکے کے شباب، حسن و جمال اور اس کی والدہ کے صبر و شکیب پر زار و قطار رونے لگے۔ یہ دیکھ کر نوجوان لڑکے نے کہا: چچا جان! روتے کیوں ہو؟ اگر میری کمسنی پر روتے ہو تو کیا اللہ تعالیٰ اتنی عمر والے سیاہ کار کو عذاب نہ کرے گا؟

انہوں نے کہا: ''میرے بھتیجے میں تیری کمسنی پر تو نہیں رو رہا بلکہ تیری والدہ کی اس زندگی کا تصور کر کے رو رہا ہوں جو وہ تیرے بغیر بسر کرے گی۔

یہ جہادی قافلہ مسلمہ بن عبدالملک اموی کے قلعے سے نکل پڑا اور سارا دن سفر کرتا ہوا ایک جگہ پر آرام کی غرض سے اتر پڑا۔ اس عرصے میں ابو قدامہ نے دیکھا کہ وہ لڑکا سب سے بڑھ کر ذکر الٰہی کرنے والا اور سب سے اچھا شہسوار ثابت ہوا

ہے۔ جب کہیں قافلہ پڑاؤ کرتا یہ ان کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا اور جب قافلہ کوچ کرتا اس کا عزم بلند اور دل خوشی سے لبریز ہو جاتا۔ خوشی کی لہریں اس کے چہرے پر دوڑنے لگتیں۔

یہ قافلہ کئی دن اور راتیں چلتا رہا۔ ایک دن غروب آفتاب کے وقت مشرکین کے علاقے میں جا پہنچا۔ چونکہ یہ مجاہدین دن کو روزے اور رات کو نوافل پڑھتے تھے سو نوجوان نے ان کے لیے کھانا پکایا۔ انھیں روزہ افطار کرا کر بیٹھا ہی تھا کہ دن بھر کی تھکاوٹ کی وجہ سے اونگھ طاری ہوگئی اور یہ سو گیا۔ قافلے والے مجاہدین نمازیں ادا کر کے ضروری امور نپٹانے کے بعد اس نوجوان کے پاس سے گزرے تو یہ میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہا تھا اور اسی دوران اس کے لبوں پر مسکراہٹ طاری تھی۔ ابوقدامہ شامی نے اپنے ساتھیوں کو متوجہ کر کے بتایا کہ ذرا اس سونے والے کی مسکراہٹ تو دیکھو۔

جب وہ نوجوان نیند سے بیدار ہوا تو ابوقدامہ نے سوال کیا: میرے عزیز اور پیارے بھتیجے! ہم نے تجھے نیند میں مسکراتا ہوا دیکھا ہے اس کا سبب تو بتاؤ۔ تو اس نے بتایا: ''چچا جان! میں نے نیند میں ایک بہترین خواب دیکھا ہے۔ میں اپنے آپ کو ایک سرسبز وشاداب باغیچے میں سیر کرتے دیکھ رہا تھا۔ اسی سیر کے دوران میں نے ہیروں اور جواہرات سے آراستہ چاندی کا محل دیکھا ہے، کہ جس کے دروازے سونے کے بنے ہوئے اور ان کے آگے ریشمی پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ ان کے پیچھے خوبصورت نوعمر دوشیزائیں کھڑی ہیں۔ وہ پردے اٹھا کر مجھے دیکھتی ہیں۔ ان کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہے ہیں۔ جب بھی وہ مجھے دیکھتی ہیں تو کہتی ہیں: ''مرحبا! تمھارا آنا مبارک ہو۔''

میں نے ایک خوبصورت خاتون کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے کہا:

جلدی نہ کیجئے ابھی تیرا وقت نہیں آیا۔
اسی دوران میں نے ایک خاتون کو اپنی سہیلی سے کہتے سنا: یہ مرضیہ کا شوہر ہے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے کہا کہ آگے بڑھو، اللہ تم پر رحم فرمائے۔
میں آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس محل کی آخری منزل پر میں سرخ سونے سے تعمیر کیا ہوا ایک کمرہ ہے۔ اس کے اندر ہرے رنگ کے زبرجد کا تخت سجا ہوا ہے اس کے پائے سفید چاندی کے ہیں اور اس پر سورج کی طرح چمکتے ہوئے چہرے والی ایک خاتون بیٹھی ہوئی ہے۔ اگر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ میری نگاہ کی حفاظت نہ فرماتا، تو میری بینائی اور عقل ہی کھو جاتی کیونکہ اس کمرے کی سجاوٹ اور خاتون کا حسن بیان سے باہر ہے، خاتون نے جب مجھے دیکھا تو کہنے لگی:
((مَرْحَبًا وَ اَهْلًا وَّ سَهْلًا)) ''اللہ کے پیارے دوست! تو میرے لیے اور میں تیرے لیے ہوں۔'' میں نے اسے اپنے سینے سے لگانا چاہا تو اس نے کہا:
رکیے اور جلدی نہ کیجئے تم تو پرہیز گار اور متقی انسان ہو۔ قبیح حرکتوں سے دور رہنے والے ہو میرا تیرے ساتھ ملنے کا وعدہ کل نماز ظہر کے وقت ہے اس لیے خوش ہو جاؤ۔
یہ سن کر ابو قدامہ نے فرمایا: ''میرے عزیز! تم نے خیر دیکھی اور خیر ہی ہوگی۔''
چنانچہ قافلے کے مجاہدین نے اس لڑکے کے خواب پر تعجب کرتے ہوئے رات گزاری جب صبح ہوئی تو انہوں نے اپنے گھوڑے کسنے شروع کر دیئے۔ جہاد کا منادی پکارنے لگا: ''اے اللہ کے لشکرو! سوار ہو جاؤ اور جنت کے لیے تیار ہو جاؤ۔
﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا ﴾ ''نکلو جہاد کے لیے ہلکے ہو یا بوجھل۔ یعنی جوان بھی، بوڑھے بھی، شجاع بھی اور بزدل بھی۔''
آن کی آن میں دشمن کا ٹڈی دل لشکر سامنے آ گیا جس پر سب سے پہلے حملہ

اس نوجوان لڑکے ہی نے کیا۔

چنانچہ وہ اس کی صفوں کو چیرتا ہوا اور اس کی جمعیت کو پارہ پارہ کرتا ہوا لشکر کے درمیان جا گھسا۔ اس نے ان کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور بڑے بڑے سور ماؤں کو جہنم واصل کر دیا۔ ابوقدامہ نے اسے لشکر کے درمیان بے خوف وخطر دیکھا تو اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور کہا میرے بھتیجے! واپس چلے جاؤ تم جنگی کروفر کے اسالیب سے واقف نہیں ہو۔ حملے پر حملہ کرتے جاتے ہو حالانکہ لڑائی میں طرح طرح کی چالیں چلنا پڑتی ہیں۔ تم دشمن کو جل دینے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ اس نے جواباً عرض کیا: چچا جان! تم نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا یہ فرمان نہیں پڑھا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ ﴾ (الانفال:۱۵)

”اے اہل ایمان! جب میدانِ جنگ میں کفار سے تمھارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا۔“

کیا تم چاہتے ہو کہ میں جہنم میں داخل ہو جاؤں؟

ابھی چچا بھتیجا اس موضوع پر بات چیت کر ہی رہے تھے کہ ان پر مشرکین نے یکبارگی حملہ کر دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور اپنا اپنا دفاع کرنے لگے۔ اس حملے میں بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔ جب دونوں لشکر ایک دوسرے سے جدا ہوئے، تو میدان جنگ مقتولین سے بھر چکا تھا اور ان کے خون سے زمین سرخ ہو چکی تھی۔ کثرت خون اور غبار کی وجہ سے زخمیوں کو پہچاننا دشوار ہو چکا تھا۔ ابوقدامہ اللہ کے فضل وکرم کے بعد اپنی جنگی مہارتوں کی وجہ سے شمشیر زنی اور نیزہ بازی کرتے ہوئے دشمن کے حصار سے نکل چکے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر مقتولوں کے درمیان اس نوجوان لڑکے کو تلاش کرنے لگے۔ کیا دیکھتے ہیں

کہ وہ خوبرو لڑکا خاک وخون میں تڑپ رہا ہے اور کہہ رہا ہے:

''اے مسلمانوں کی جماعت اللہ کے لیے میرے چچا کو بلاؤ۔''

ابوقدامہ نے اس کی دلگداز آواز سنی تو اس کی طرف لپکے۔ اسے خاک وخون میں لت پت اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندے جانے کی وجہ سے پہچان نہ سکے۔ بولے: ''میں ہوں ابوقدامہ۔''

خاک وخون میں غلطیدہ نوجوان نے کہا:

''چچا جان! رب کعبہ کی قسم خواب سچا ثابت ہوا۔ میں بالوں کی رسی کا عطیہ پیش کرنے والی خاتون کا بیٹا ہوں۔''

یہ سنتے ہی ابوقدامہ اس پر گر پڑے۔ اس کی پیشانی کا بوسہ لے کر اس کے چہرے اور بدن سے مٹی اور خون پونچھنے لگے۔ درخواست کرنے لگے: بھتیجے! قیامت کے دن اپنے چچا ابوقدامہ کو بھی اپنی سفارش میں شامل رکھنا۔

اس نے کہا: ''بھلا میں تیرے جیسے آدمی کو بھلا سکتا ہوں جو اپنی چادر سے میرا چہرہ صاف کر رہا ہے۔ چچا جان! مجھے اللہ کی ملاقات کرنے دیجیے۔ وہ حورا جس کی خوبیاں میں نے آپ کو بتائی تھیں میرے سر پر کھڑی ہے اور میری روح نکلنے کا انتظار کر رہی ہے۔ کہہ رہی ہے جلدی کرو میں آپ کے انتظار میں بے تاب کھڑی ہوں۔

چچا جان! اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ کو صحیح سلامت واپس لے جائے تو اللہ کے لیے میرے یہ خون آلود کپڑے میری غم زدہ اور مسکین والدہ کے سپرد کر دینا تاکہ اسے پتہ چلے کہ میں نے اس کی وصیت کو رائیگاں نہیں جانے دیا اور نہ میں نے مشرکین کے ساتھ جنگ میں کسی طرح کی کمزوری کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسے میری طرف سے سلام عرض کرنا اور کہنا تم نے جو ہدیہ اللہ سبحانہٗ کی بارہ گاہ میں پیش کیا تھا وہ اس نے قبول کر لیا ہے۔

چچا جان! میری ایک چھوٹی بہن ہے۔ اس کی عمر تقریباً دس سال ہے۔ میں جب کبھی گھر میں داخل ہوتا تھا وہ خوشی خوشی میرا استقبال کرتی اور مجھے سلام کرتی تھی۔ جب میں باہر نکلتا تو مجھے دروازے تک الوداع کرنے آتی تھی۔ اس مرتبہ جب اس نے مجھے الوداع کیا تو کہنے لگی۔ پیارے بھائی! دیر نہ لگانا اور جلدی واپس آنا۔ اگر وہ آپ کو ملے تو اسے میری طرف سے سلام عرض کرنا اور کہنا کہ تیرا بھائی کہہ رہا تھا: اب قیامت تک میری بجائے اللہ تیرا حافظ و نگہبان ہے۔

اس کے بعد وہ مسکرایا اور کہنے لگا:

((اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ .))

اس کے بعد اس کی روح پرواز کر گئی۔ غازیان اسلام نے اسے اس کے کپڑوں میں کفنا کے زمین میں دفنا دیا۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

اس کے بعد ابو قدامہ اپنے غازی دوستوں کے ہمراہ محاذِ جنگ سے واپس آئے۔ اور رقہ میں داخل ہوئے تو سب سے بڑی فکر اس بات کی تھی کہ وہ اس شہید لڑکے کی ماں کا گھر تلاش کریں۔ چنانچہ وہ ایک گھر کے دروازے پر سے گزرے تو وہاں ایک بچی کھڑی تھی۔ شکل و شباہت اور حسن و جمال میں اس شہید کے ساتھ یوں مشابہ تھی جیسے انڈے کے ساتھ انڈا اور کبوتر کے ساتھ کبوتر۔

وہ روزانہ دروازے پر آ کر کھڑی ہو جاتی تھی اور آنے جانے والوں سے اپنے اکلوتے بھائی کا پتہ پوچھتی رہتی اور ہر ایک سے کہتی: ''چچا جان آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟

وہ کہتا: ''میں محاذ جنگ سے آ رہا ہوں۔''

تو وہ اس سے پوچھتی۔ کیا آپ کے ساتھ میرا بھائی بھی آیا ہے؟

وہ کہتے: ''ہم اسے نہیں جانتے''

جب ابو قدامہ نے اس کی آواز سنی تو اس کے پاس چلے آئے۔ اس نے ان سے بھی یہی پوچھا: اے چچا کہاں سے آئے ہو؟

انہوں نے جواب دیا: ''محاذ جنگ سے آرہا ہوں۔''

وہ پوچھنے لگی: ''آپ کے ساتھ میرا بھائی تو نہیں آیا؟''

ابھی وہ بولنے نہ پائے تھے کہ وہ معصومہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور کہنے لگی: ہائے میرے اللہ! سارے لوگ واپس آرہے ہیں، لیکن میرا بھائی نہیں آیا۔ یہ سن کر ابو قدامہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن انہوں نے بچی کے رنج والم کی وجہ سے اپنے آپ پر قابو پالیا اور کہا:

''بیٹی اس گھر والی بی بی سے کہو کہ ابو قدامہ سے بات کرے۔ وہ دروازے پر کھڑا ہے۔'' اندر سے عورت نے یہ بات خود ہی سن لی اور باہر آگئی۔

ابو قدامہ شامی کہتے ہیں کہ مجھے دیکھ کر دفعتاً اس کا رنگ فق ہو گیا لیکن فوراً سنبھل گئی میں نے اسے سلام کہا تو اس نے میرے سلام کا جواب دے کر پوچھا:

تعزیت کرنے آئے یا خوشخبری دینے۔

میں نے کہا: ''اللہ تجھ پر رحم فرمائے۔ میں تعزیت کی صورت میں بشارت دینے آیا ہوں۔ اس نے کہا: ''اگر میرا بیٹا صحیح سلامت واپس لوٹا ہے تو آپ تعزیت کرنے والے ہیں اور اگر فی سبیل اللہ شہید ہو گیا ہے تو آپ بشارت دینے والے ہیں۔

میں نے کہا: ''تو پھر بشارت حاصل کرو اللہ نے تمھارا ہدیہ قبول کر لیا ہے۔ یہ سن کر اس پر فطرتِ ممتا غالب آگئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بالآخر وہ ماں تھی۔ کچھ دیر بعد آنسو پونچھے اور کہنے لگی: واقعی اللہ نے میرا ہدیہ قبول کر لیا ہے؟ میں

نے کہا: ''ہاں۔'' کہنے لگی:

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے بیٹے کی شہادت کو میرے لیے قیامت کے دن کا ذخیرہ بنا دیا۔ ابو قدامہ کہتے ہیں: میں نے اس سے پوچھا کہ اس شہید کی ہمشیرہ کیا کرتی ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ چھوٹی بچی جو آپ سے اپنے بھائی کے متعلق پوچھ رہی تھی وہ اس کی چھوٹی بہن ہے۔

چنانچہ میں نے اسے بلوا کر اس کے بھائی کی طرف سے سلام کہا اور پیغام دیا کہ تیرا بھائی کہتا تھا کہ: اب قیامت تک اللہ تیرا نگہبان ہے۔ یہ الفاظ سن کر گویا اس پر بجلی گر پڑی۔ بے ساختہ اس کی چیخ نکلی اور وہ غش کھا کر اوندھے منہ گر پڑی۔ میں نے تھوڑی دیر بعد اسے ہلایا جلایا تو اس کے بدن سے روح پرواز کر چکی تھی۔ مجھے اس کی اپنے بھائی سے اس قدر محبت پر بے حد تعجب ہوا۔ پھر میں نے شہید کی وصیت کے مطابق اس کے خون آلود کپڑے اس کی والدہ کے سپرد کیے اور ان بہن بھائیوں کے دلگداز خاتمے پر غم کے آنسو بہاتا ہوا واپس چلا آیا۔

......☆......

[1] اس قصے کا اصل مشارع الاشواق الی مصارع العشاق میں ہے۔

شیر دل خاتون کی آرزوئے شہادت[1]

صحابہ کرامؓ آنحضرتﷺ کے سانحہ ارتحال سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ نوزائیدہ اسلامی ریاست خطرات میں گھر گئی۔ کہیں نبوت کے جھوٹے دعویدار اپنی اپنی جھوٹی نبوتوں کا ڈھنڈورا پیٹ کر نومسلموں کو مرتد بنا رہے تھے اور کہیں مرکز خلافت کو کمزور کرنے کے لیے منکرین زکوٰۃ، زکوٰۃ دینے سے انکار کرنے لگے کہیں مرکز خلافت پر حملہ آور ہونے کی منصوبہ بندیاں ہو رہی تھیں۔ ان کٹھن حالات میں سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کا دل بیٹھ جاتا کیونکہ جس طرح لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے تھے اسی طرح انہوں نے یکے بعد دیگرے اسلام کو خیر باد کہہ دینا تھا۔

اس موقع پر سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے دلیرانہ اور سرفروشانہ اقدام اور ان کے قطعی فیصلے نے ارتداد کے طوفانوں کا رخ موڑ دیا اور فتوحات اسلامیہ کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اس پرآشوب موقعہ پر آپ نے لشکر اسامہ کو قیصر روم کے خلاف جہاد پر بھیجنے کا عزم بالجزم کر لیا اور صحابہ کو یہ کہہ کر خاموش کرا دیا کہ اگر تم نہ نکلے تو میں اکیلا نکلوں گا۔ اگرچہ میری تکا بوٹی ہو جائے اور اگر تم جہاد کے لیے نکل پڑے تو میری پروا نہ کرنا اگرچہ یثرب کے بھیڑیے مجھے چیر پھاڑ کھائیں۔ آپ کی اس دلنشیں تقریر پر صحابہ کرامؓ کے حوصلے بلند ہو گئے اور انہوں نے سرفروشانہ ولولے کے ساتھ جہاد کی تیاری شروع کر دی۔

اسی تیاری کے دوران ایک نقاب پوش خاتون سالارِ لشکر حضرت اسامہؓ کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ اے عظیم سالار میں اپنے شوہر کو دیکھنا چاہتی ہوں!

آپ کا شوہر کون سے دستے میں موجود ہے؟

سیدنا اُسامہ بن زیدؓ نے پوچھا۔

اس نے بڑے طمطراق سے جواب دیا:''وہ شہدائے کرام کے دستے میں رہتا ہے۔ وہ غزوہ موتہ میں آپ کے باپ زیدؓ بن حارثہ کے ہمراہ شہید ہوگیا تھا۔''

حضرت اسامہ بن زیدؓ کے چہرے پر حیرت نمایاں ہوئی۔

پوچھا: بی بی! وہ اللہ کی رحمت اور اس کی جنات عدن میں منتقل ہوگیا۔ اللہ کی نیک بندی! تو مجھ سے میری طاقت سے ماوراء مطالبہ کررہی ہے؟ میں کس طرح اس سے تیری ملاقات کراسکتا ہوں؟

اے سپہ سالار! یہ بات آپ کے بس میں ہے۔ آپ مجھے اپنے لشکر میں قبول فرمائیے۔ ممکن ہے میرا رب مجھے شہدائے کرام میں لکھ لے اور میں عالم آخرت میں اپنے شوہر سے مل جاؤں۔

اللہ کی بندی! اللہ تیری وفاداری اور شجاعت میں برکت فرمائے، تو گھر چلی جا، ہمارے پاس کافی لشکر ہے۔

یہ سنتے ہی اس نے اپنے سر سے سکارف اٹھا کر دو طویل مینڈیاں کاٹ کر حضرت اسامہؓ کے سامنے رکھ دیں اور بولی ''لو یہ مینڈیاں اور ان سے اپنے گھوڑے کی رسی بنالو۔ کل آپ کو میری شجاعت کا پتہ چل جائے گا۔''

دوسرے دن حضرت اسامہؓ کے پاس ایک نوخیز لڑکا آیا اور کہنے لگا:

''چچا جان! مجھے بھی اپنے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے جانے دیجیے تاکہ میں شہید ہوکر اپنے ابا کے پاس چلا جاؤں؟''

حضرت اسامہ مسکرادیے اور فرمایا:

''لڑکے! اللہ آپ کی عمر میں برکت فرمائے! گھر چلا جا اور جب تو جوان ہو جائے گا تو ہم تجھے اپنے لشکر میں شامل کرلیں گے۔''

لڑکے نے فوری جواب دیا: ''میری ماں نے مجھے اللہ وحدہ لاشریک کے نام

ہبہ کر دیا ہے۔ لہٰذا اب وہی مجھے قبول کر سکتا ہے یا واپس لوٹا سکتا ہے۔"

حضرت اسامہؓ کے چہرے پر تعجب کے آثار نمایاں ہوئے اور انہوں نے پوچھا: تم کس کے بیٹے ہو؟

لڑکے نے جواب دیا: میں اس خاتون کا بیٹا ہوں، جس نے آپ کو گھوڑے کی رسی کے لیے اپنے سر کی مینڈھیاں دی تھیں۔

حضرت اسامہ چلا اٹھے: اچھا تم اس ذات العقال کے بیٹے ہو، جس کا شوہر جنگ موتہ میں شہید ہوا تھا؟

"ہاں میں اس کا اکلوتا فرزند میسرہ ہوں۔"

چنانچہ بچے کے پرزور اصرار پر حضرت اسامہؓ نے اسے لشکر میں شامل کر کے اسے اپنے پیچھے پیچھے رہنے کی ہدایت کی۔

جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لشکر روانہ فرمادیا تو ایک دن کی مسافت پر لشکر اسلام کی دائیں پلٹن کے کمانڈر نے دیکھا کہ ایک نقاب پوش مجاہد تلوار تھامے اپنے سیاہی مائل گھوڑے پر سوار لشکر اسلام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے سمجھا کہ یہ کوئی قاصد ہوگا جو خلیفۃ الرسول ﷺ ابوبکر صدیقؓ کا پیغام لا رہا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ شہسوار وہی ذات العقال ہے جو درجہ شہادت پانے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ چنانچہ حضرت اسامہؓ اس کے پاس گئے اسے سمجھایا بجھایا اور واپس گھر جانے کی تلقین کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ پھر آپ نے شرط عائد کر دی کہ وہ لشکر اسلام کے آخر میں رہے لیکن اس میں بھی ناکامی ہوئی اور خاتون نے مجاہدین سے آگے بڑھنے پر اصرار کیا۔ جب کوئی بس نہ چلا تو حضرت اسامہؓ نے اسے کروفر اور فنون سپہ گری سکھائے جب اطمینان حاصل کر لیا تو اسے قتال میں حصہ لینے کی اجازت دے دی۔ اگلے دن جنگ شروع ہوئی تو ذات العقال نے شجاعت و بسالت کی لازوال داستانیں رقم کیں۔ اس نے اپنی تلوار سے کفار کی لاشوں کے پشتے لگا دیے

مجاہدین اسلام جب بھی کسی کافر کا سرتن سے جدا ہوتا دیکھتے تو بلند آواز سے نعرہ تکبیر بلند کرتے اور خود بھی بڑھ چڑھ کر کفار پر حملہ آور ہوتے۔

دوسرے دن لڑائی کے بعد مجاہدین اسلام ذرا ستانے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت اسامہؓ نے لشکر اسلام کے احوال کا جائزہ لینے کے لیے گشت شروع کر دیا انہوں نے ذات العقال کے بیٹے کو سویا ہوا دیکھا تو پاس جا کر اسے جگایا۔ بچہ جاگتے ہی گویا ہوا: ''چچا جان کاش آپ مجھے نہ جگاتے میں شہیدوں کے جلو میں اپنے باپ کے ساتھ جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔''

حضرت اسامہؓ فرمانے لگے:

''میرے بیٹے، اللہ کی قسم تو ہونہار اور مخلص بچہ ہے۔''

چنانچہ یہ بچہ بھی جنگجو مردوں کی صفوں میں شامل ہونے پر اصرار کرنے لگا۔ جب اس نے آپ کو مجبور کر دیا تو آپ نے اسے مختصراً فنون سپہ گری سکھائے اور اجازت دے کر اسے اپنی ماں کے ساتھ ساتھ رہنے کی تلقین کی۔

جب جنگ شروع ہوئی تو یہ بچہ بھی اعدائے اسلام کی گردنیں کاٹتا ہوا دیکھا گیا حتیٰ کہ دشمن کے تیر نے اسے درجہ شہادت پر فائز کر کے اسے اس کے باپ کے ساتھ ملا دیا۔ اس موقع پر اس کی ماں کسی کافر کے ساتھ نبرد آزما تھی۔ جب اس نے اپنے مد مقابل کا سر اڑا دیا تو فوراً لپکتی ہوئی اپنے بچے کی طرف بڑھی۔ مبادا کہ دشمنان دین اس کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں چنانچہ وہ اسے اٹھا کر اپنے خیمے میں لے آئی۔

اللہ کے فضل و کرم اور ان پاکیزہ روحوں کی قربانیوں کی بدولت حضرت اسامہؓ کا لشکر فتح یاب ہو کر لوٹا۔ اس کے آگے آگے ذات العقال بھی تھی جس نے اپنے شوہر اور بیٹے کی قربانی دی تھی۔ جس قوم میں اس خاتون جیسی خواتین اور اس کے شیر دل بیٹے جیسے جانباز ہوں، انھیں کفار ہرا سکتے ہیں نہ زیر کر سکتے ہیں۔

---

[1] اس قصے کا اصل المطالعة العربية مطبوعہ سعودی عرب ہے۔

گمنام مجاہد اسلام کا اخلاص[1]

خلفائے بنوامیہ کے دور میں کفار اور مسلمانوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ لشکر اسلام کے مجاہدین نے زبردست تیر اندازی اور شمشیر زنی کر کے لشکر کفار کو ایک قلعے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ عساکر کفار قلعے کے پھاٹک بند کر کے اس کی فصیلوں پر چڑھ گئے اور وہاں مورچہ زن ہو کر مجاہدین پر تیروں کی بارش کرنے لگے۔ جو کوئی مجاہد قلعے کا رخ کرتا وہ تیروں سے اس کا بدن چھلنی کر دیتے۔ اس صورتحال سے نبرد آزما ہونے کے لیے مجاہدین اسلام نے مختلف تدبیروں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ سب کی متفقہ رائے یہ ٹھہری کہ جب تک قلعے کی فصیل میں نقب نہ لگائی جائے اور اندر داخل ہو کر حملہ نہ کیا جائے اس وقت تک کامیابی سے ہمکنار ہونا ممکن نہیں۔

چنانچہ اسلامی افواج کے سپہ سالار حضرت مسلمہ بن عبدالملک اُمَوی قریشی نے اس مقصد کے لیے مجاہدین اسلام کو ایک جگہ اکٹھا کر کے بڑا فصیح و بلیغ خطبہ دیا۔ انھیں جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیت اور شہادت کے فضائل سے آگاہ کیا اور اعلان کیا کہ ہے کوئی مجاہد جو اس کام کا بیڑا اٹھائے۔ اللہ اسے فردوس بریں میں جگہ عطا فرمائے گا۔

شہادت کے فضائل سن کر مجاہدین اسلام میں سے ایک شخص جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کام کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ چہرے پر نقاب باندھ کر تیروں کی بارش میں کود پڑا

اور لہولہان ہونے کے باوجود قلعے کی فصیل میں نقب لگانے پر کامیاب ہو گیا۔ قلعے میں نقب لگنے کی ہی دیر تھی کہ مجاہدین اسلام اپنے شمشیر وسنان اور تیر وتفنگ لے کر اندر داخل ہو گئے اور عساکر کفار کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے لگے۔ آن کی آن میں دشمن کا صفایا ہو گیا اور اس قلعے پر اسلامی پرچم لہرانے لگا۔

اسلامی افواج کے سپہ سالار نے شکرانے کے نوافل ادا کرنے کے بعد ایک دربار عام منعقد کیا اور اپنے لشکر کی کارکردگی کو سراہنے کے بعد مطالبہ کیا کہ اب ہمارے سامنے وہ نقاب پوش مجاہد آئے جس کی بے مثال جرأت و بہادری سے قلعے کی فتح کا معاملہ آسان ہو گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ افواج کے سامنے اس کی بہادری کی تعریف کرے اور مال غنیمت میں سے وافر حصہ عطا کرے۔ اسے یکے بعد دیگرے کئی ترقیاں دیکر اعلیٰ جرنیل بنا دے۔ اس نے کئی بار اس گمنام شخص کو پکارا لیکن کوئی فرد بھی کھڑا نہ ہوا۔ آخر تھک ہار کر مسلمہ بن عبدالملک نے اپنے ملٹری سیکرٹری کو ذمہ داری سونپ دی کہ جس طرح بھی ہو سکے اس شخص کو تلاش کیا جائے خواہ اس کی تلاش میں کتنی ہی دیر کیوں نہ ہو جائے۔

چنانچہ ملٹری سیکرٹری نے انٹیلی جنس کے ذریعے اس آدمی کی تلاش شروع کر دی اور فرداً فرداً ہر فوجی سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ ابھی پوچھ گچھ کا کام جاری تھا کہ رات کو ایک آدمی ملٹری سیکرٹری کے پاس آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے جھٹ سوال کر دیا؛ تو وہی نقاب پوش تو نہیں ہے؟

اس نے کہا: نہیں صاحب میں تو آپ کو اس کے متعلق بتانے آیا ہوں کہ وہ کون ہے ذرا مجھے سپہ سالار کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ ملٹری سیکرٹری نے اسے فوراً مسلمہ بن عبدالملک اموی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ تو اس نے اپنے سپہ سالار سے گزارش کی:

اے سالار محترم: اس نقاب پوش کی چند شرائط ہیں اگر آپ اس کے ساتھ پختہ عہد کریں اور ان شرائط پر پورا اتریں تو وہ آپ کے پاس از خود ہی حاضر ہو جائے گا۔

حضرت مسلمہ بن عبدالملک اموی نے اس سے شرائط پوچھیں تو اس نے بتایا:

۱۔ ایک تو آپ نے اس کے متعلق کبھی نہ پوچھنا کہ وہ کون ہے اور اس کا نام کیا ہے۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ مال غنیمت میں سے اسے خصوصی حصہ نہ دینا۔

۳۔ تیسری شرط یہ ہے کہ خلفیۃ المسلمین کی طرف اس کے متعلق کوئی خط وغیرہ نہ لکھنا۔ مبادا کہ وہ اسے کوئی خصوصی اہمیت دینا شروع کر دے۔

اللہ اکبر! یہ تھا ان کا اخلاص، جس کی بدولت مسلمانوں کی فتوحات کا سیل رواں تھمتا نہ تھا۔ وہ لوگ اپنی جرأت و بہادری، جانبازی و سرفروشی کی شہرت کے دلدادہ نہ تھے بلکہ وہ نیکی کر کے لرزاں و ترساں رہتے کہ ان کے کارناموں کی دنیا میں کہیں شہرت نہ ہو جائے اور اس وجہ سے کہیں ان کی نیکیاں برباد نہ ہو جائیں۔ وہ حُبِ شہرت و جاہ کا شکار ہو کر کہیں جہنم کا ایندھن نہ بن جائیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ سب سے پہلے جن تین قسم کے انسانوں کو جہنم کے ایک گڑھے میں پھینک کر اس گڑھے کو تنور کی طرح بھڑکایا جائے گا ان میں سے ایک قسم ان قراء اور علماء کی ہوگی جو اس نیت سے خوش الحانی اور تکلف سے قرأت کرتے ہیں اور خطابت کے جوہر دکھاتے ہیں کہ دنیا میں ان کی قرأت اور خطابت کی دھوم مچ جائے۔ دوسری قسم ان سخیوں اور فیاضوں کی ہوگی جو اس نیت سے مال و دولت خرچ کرتے ہیں کہ دنیا میں ان کی سخاوت اور فیاضی کا چرچا ہو جائے اور تیسری قسم ان جانبازوں کی ہوگی جنھوں نے میدان جنگ میں دادشجاعت اس نیت

سے دی کہ دنیا میں ان کی بہادری اور ناموری کے چرچے عام ہو جائیں۔

اس بنا پر اس دور کے عالموں اور قاریوں، سخیوں اور فیاضوں، مجاہدوں اور جانبازوں کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ ان کے اعمال پردہ اخفاء میں رہیں۔اس لیے وہ نیکیاں بھی اس طرح چھپ چھپا کر کیا کرتے تھے جیسے آج کل ہم لوگ چھپ کر برائیاں کرتے ہیں۔ان ریا کاروں سے زیادہ قابل رحم وہ جرنیل ہیں جو جنگ کے موقع پر دشمن سے مذاکرات کی بھیک مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔اور اُدھر ۲۳ مارچ کو بغیر کسی قابل فخر کارنامے کے تمغے وصول کرتے ہیں اور جگ ہنسائی کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتے۔

بہر حال لشکر اسلام کے سپہ سالار حضرت مسلمہ بن عبدالملک اموی نے ان شرائط پر پابند رہنے کا عہد کر لیا تو اس نے بڑی شرمساری سے صرف اتنا کہا: ''وہ میں ہی تھا، اور بڑی تیزی سے واپس مڑ گیا۔''

نہ تو مسلمہ بن عبدالملک کو پتہ چلا کہ یہ کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے۔کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور نہ اس کے کیمپ والوں کو ہی پتہ چل سکا کہ ان کا ساتھی کس مقصد کے لیے کس کے پاس گیا تھا۔

حضرت مسلمہ بن عبدالملک فرماتے تھے: اس کے بعد میں جب بھی نماز پڑھتا ہوں تو دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ تو قیامت کے دن مجھے اس بے لوث اور گمنام مجاہد اسلام کا پڑوس نصیب فرما دینا۔

......☆......

[1] اس قصے کا اصل المطالعة العربية (متوسط) مطبوعہ الریاض میں ہے۔

شہید کی بیوہ کا اعزاز[1]

ابوالعباس عیسیٰ بن محمد طہمانی بیان کرتے ہیں:

اللہ تعالیٰ جس قدر چاہتا ہے اپنی قدرت کی نشانیاں ظاہر کرتا ہے اور ان کے ذریعے اسلام کی عزت اور شوکت میں اضافہ کرتا ہے۔ ان میں ایک جو بات ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی اور ہر پہلو سے اس کی تحقیق کی تو وہ مبنی بر حقیقت ثابت ہوئی۔ وہ یہ ہے کہ میں خوارزم کے شہر ''عان'' میں گیا جو خوارزم سے نصف دن کی مسافت پر ہے۔ وہاں مجھے بتایا گیا کہ یہاں ایک شہید کی بیوہ ہے جو عبداللہ بن طاہر کے دور سے بغیر کھائے پیئے زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے خواب میں کوئی چیز کھائی ہے جس کی وجہ سے دنیاوی اکل و شرب کی طلب ختم ہوگئی ہے۔ چنانچہ میں نے اسے دیکھا اور اس سے کھانے پینے سے بے نیازی کا سبب بھی پوچھا تو اس نے مجھے بتا دیا، پوری تفصیل سے سنایا:

آپ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد اس بی بی سے میری ملاقات دس سال بعد ہوئی وہ کہیں پیدل جا رہی تھی اور میں سواری پر تھا۔ میں نے اسے اپنی سواری پیش کی لیکن اس نے میری پیشکش قبول نہ کی اور پیدل ہی چلتی رہی۔ وہ باوجود عمر رسیدہ ہونے کے بیس پچیس سال کی نظر آ رہی تھی چہرے پر جھریاں تھیں نہ قد و قامت میں خم تھا۔ ایک مرتبہ ہمارے ہاں تشریف لائی۔ اس وقت ہم کھانا کھا رہے تھے۔ وہ

اپنی ناک پر ہاتھ رکھ کر ایک طرف بیٹھ گئی جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو میں نے اس سے دریافت کیا:

”بی بی! کیا تمھارے جسم سے باد فاسد خارج ہوتی ہے؟اس نے جواب دیا: نہیں

میں نے پوچھا: کیا تمہیں مخصوص ایام آتے ہیں؟

کہا: ”یہ عارضہ عرصہ سے منقطع ہے۔“

میں نے پوچھا: ”کیا تجھے مردوں سے متعلق عورتوں کی سی خواہش پیدا ہوتی ہے؟“

اس نے کہا: کیا مجھ جیسی خاتون سے اس طرح کی بات پوچھتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی!

میں نے معذرتاً کہا: کوئی حرج نہیں، بسا اوقات کسی کے پوچھنے پر بتانا پڑ جاتا ہے

اس نے کہا: بالکل نہیں

میں نے پوچھا: کیا تجھے نیند آتی ہے؟

اس نے کہا: ہاں مجھے نیند آتی ہے۔

میں نے کہا تمہیں نیند میں کیا کچھ نظر آتا ہے؟

اس نے بتایا: جو کچھ دیگر لوگوں کو نظر آتا ہے۔

میں نے پوچھا: کیا کھانا نہ کھانے کی وجہ سے بدن میں کمزوری محسوس نہیں ہوتی؟

اس نے بتایا کہ جب سے میں نے وہ کھانا کھایا ہے آج تک بھوک کا احساس بھی نہیں ہوا۔

یہ بی بی صدقہ قبول کر لیتی تھی۔اس لیے میں نے پوچھا:

صدقہ وخیرات کو کس استعمال میں لاتی ہو؟

اس نے بتایا: میں اپنے اور اپنے بچوں کے کپڑے خرید لیتی ہوں۔

میں نے پوچھا: کیا تجھے ٹھنڈک اور سردی لگتی ہے؟

اس نے بتایا: ہاں سردی لگتی ہے

میں نے پوچھا: کیا پیدل چلتے وقت تجھے تھکاوٹ لاحق ہو جاتی ہے؟

اس نے بتایا: ”ہاں، کیا میں انسانوں میں سے نہیں ہوں؟“

میں نے پوچھا: کیا تو نمازوں کے لیے وضو کرتی ہے؟

اس نے کہا: ”ہاں“

میں نے پوچھا: کیوں؟

اس نے جواب دیا کہ مجھے فقہائے کرام نے وضو کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ نیند بھی وضو توڑ دیتی ہے۔

عبداللہ بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ میں بھی بچپن سے اس بی بی کا تذکرہ سنتا تھا اور میں نے اپنے طور پر اس کے معاملے کی تحقیق بھی کی لیکن مجھے کوئی ایسا عذر نہ ملا جس سے اس کے دعویٰ کو جھٹلا سکوں کیونکہ وہ بی بی اپنے عمل اور کردار کے اعتبار سے مثالی خاتون تھی۔

چنانچہ ایک مرتبہ علاقہ بھر کے لوگوں نے اس بی بی سے اصل صورتحال معلوم کرنے کے لیے میری ڈیوٹی لگائی۔ میں بذات خود اس بی بی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس سے سوال کیا تو اس نے بتایا: میرا نام رحمت بنت ابراہیم ہے۔ میرا شوہر بڑھئی تھا اور اپنے ہاتھ سے کما کر روزانہ گھر لایا کرتا تھا۔ اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ آج سے کئی سال قبل وادی جیحوں کے پار وسطی ترکستان کے غز ترکوں کا خونخوار اور لٹیرا حکمران اقتائی خاں تھا جو ہمسایہ ریاستوں پر شب خون مار کر مال و اسباب لوٹ لیا کرتا تھا۔ آس پاس کے کمزور امراء اس کی لوٹ مار کے خوف سے سہمے رہتے اور اسے خراج بھیجا کرتے تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ اس خونخوار درندے نے تہذیب و تمدن سے مالا مال مملکت

خوارزم پر شب خون مارنے کے لیے تین ہزار لٹیرے بھیج دیئے جو دریائے جیحون کے گلیشیر کو عبور کر کے خوارزم کی سرحد میں داخل ہو کر قلعہ جرجانیہ کے باب حصین کے پاس مورچہ زن ہو گئے۔ والی خراسان عبداللہ بن طاہر کے مقامی منتظم کے پاس مدافعت کے لیے مطلوبہ قوت موجود نہ تھی اس لیے اس نے ان لیٹروں کا مقابلہ کرنے کے لیے عبداللہ بن طاہر کی خدمت میں ایک وفد بھیج دیا کہ وہ مطلوبہ کمک فراہم کرے۔ اس دوران نوجوان مجاہدوں نے قلعے کی فصیل سے باہر نکل کر کفار پر حملہ کر کے انھیں تتر بتر کر دیا۔ اگلے دن وہ دوبارہ منظم ہو کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ مسلمان مجاہدین بھی جان توڑ کر لڑے اور بھوک، پیاس اور تھکاوٹ کے باوجود دشمن کو ایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ اس دوران کافی سارے لوگ زخمی ہو گئے۔ جب رات ہوئی تو دونوں فریق ستانے کی غرض سے اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔

جب اگلا دن ہوا تو عبداللہ بن طاہر کا کمانڈر میکائیل اپنی افواج لے کر میدان کارزار میں پہنچ گیا۔ پھر اس گھمسان کا رن پڑا کہ میدانِ جنگ زخمیوں اور مقتولوں سے بھر گیا۔ اس روز شام کے وقت چار صد لاشیں قلعے میں لائی گئیں۔ یہ منظر دیکھ کر قلعے میں کہرام مچ گیا۔ چاروں طرف سے آہ و بکا جاری ہو گئی۔ خواتین رونے پیٹنے لگیں اور بچے سہم کر دیواروں سے لگ گئے۔

ان مقتولوں میں میرا نوجوان شوہر بھی تھا۔ جب اس کی لاش میرے سامنے رکھی گئی تو میں بھی نوجوان مسکین عورتوں کی طرح آہ و فغاں کرنے لگی کیونکہ میری زندگی کا ظاہری سہارا وہی تھا جو بچوں کے لیے کما کر لاتا تھا۔ میرے عزیز و اقارب اور ہمسائے جمع ہو گئے اور مجھے حوصلہ دینے لگے، لیکن میرے ضبط کے بند ٹوٹ چکے تھے اور آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔ بچے مارے بھوک کے بلک بلک کر رو رہے تھے اور گھر میں انھیں کھلانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے اس قدر صدمہ ہوا

جو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میں چار پائی پر لیٹ کر رو رہی تھی کہ مجھ پر نیند طاری ہو گئی۔ میں نے اپنے آپ کو خواب میں یوں دیکھا کہ پتھروں اور کانٹوں والی خوبصورت زمین میں اپنے شوہر کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہوں۔ اسی دوران مجھے کسی آدمی نے پکار کر کہا: دائیں طرف کا راستہ اختیار کر۔

چنانچہ میں دائیں طرف چلنے لگی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ میرے سامنے سرسبز گھاس والی زرخیز زمین ہے اور اس میں اس قدر خوبصورت محلات اور بالا خانے ہیں کہ ان کی خوبصورتی بیان سے باہر ہے اور ان کے درمیان ایسی نہریں ہیں جو زمین کے اوپر بہہ رہی ہیں یعنی زمین میں کھدی ہوئی نہیں ہیں۔ میں چلتی چلتی ایک سبز پوش جماعت کے پاس جا پہنچی جو دستر خوانوں پر کھانا کھانے میں مصروف تھی اور ان پر نور و جمال چھایا ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو یہ لوگ وہی تھے جو گزشتہ روز کے معرکے میں شہید ہوئے تھے۔ میں نے اپنے شوہر کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اسی دوران مجھے کسی نے آواز دی: رحمت! رحمت!

میں اس آواز کی طرف لپکی تو کیا دیکھتی ہوں کہ میرا شوہر شہداء کے ساتھ کھانے میں مصروف ہے اور اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہا ہے۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: یہ مسکین عورت اتنے عرصہ سے بھوکی ہے، کیا تم مجھے اسے کچھ کھلانے کی اجازت دیتے ہو؟

تو انہوں نے اجازت دے دی۔ چنانچہ میرے شوہر نے مجھے ایک ٹکڑا پیش کیا جو برف سے بڑھ کر سفید، شہد سے بڑھ کر شیریں اور مکھن سے زیادہ نرم تھا۔ میں نے وہ کھانے کا ٹکڑا جب کھا لیا تو میرے شوہر نے کہا: اب تو چلی جا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے تجھے زندگی بھر بھوک اور پیاس سے بے نیاز کر دیا ہے۔''

جب میں نیند سے بیدار ہوئی تو شکم سیر تھی۔ اس وقت سے لیکر آج تک مجھے

کھانے پینے کی ضرورت نہیں پڑی۔

محدّث طبھانی لکھتے ہیں: جب ابوالعباس احمد بن محمد بن طلحہ والی خوارزم کے سامنے اس پاکباز بی بی کا تذکرہ کیا گیا تو اس نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا: یہ ناممکن ہے، ایسا نہیں ہو سکتا۔

میں نے عرض کیا؛ اس بات کی تحقیق کرنا آسان ہے: وہ عورت زندہ موجود ہے اور مسافت بھی زیادہ نہیں۔ اسے اپنے ہاں آنے کی دعوت دیجئے اور خود تسلی کر لیجئے۔ اس نے مجھے اپنی طرف سے اپنے علاقائی عامل کی طرف خط لکھنے کا حکم دیا۔

چنانچہ وہاں کے عامل نے والئ خوارزم کے حکم کے مطابق نہایت ادب و احترام سے اس عورت کو خوارزم میں احمد بن محمد کے گھر پہنچا دیا۔

چنانچہ والئ خوارزم نے اپنی والدہ سے گزارش کی کہ وہ بذات خود اس خاتون کی خدمت تواضع کرے اور سونے لیٹنے کے اوقات میں اس کا پتہ رکھے کہ وہ کہیں چھپ کر کھاتی پیتی تو نہیں ہے؟ چنانچہ وہ اس کی ماں کے پاس دو ماہ رہی اور ان کے گھر سے اس عرصہ میں کہیں نہ گئی۔

جب ابوالعباس احمد کی والدہ نے بتایا کہ واقعی یہ اللہ کی بندی کھاتی پیتی نظر نہیں آئی تو اس کا تعجب پہلے سے بھی بڑھ گیا۔ وہ مان گیا کہ: اللہ کی قدرت کا انکار نہیں کیا جا سکتا پھر اس نے اسے عزت و آبرو کے ساتھ اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ اللہ کی نیک بندی اللہ کو پیاری ہو گئی۔

اللہ اسے اسکے شوہر کے پاس جگہ عطا فرمائے آمین۔

......☆......

[1] یہ قصہ تاریخ الاسلام و وفیات مشاہیر الاعلام مولفہ امام ذہبی میں موجود ہے اس کے متعلق امام ذہبی فرماتے ہیں: وھی حکایة صحیحة ثابتة

بجلی کا کڑکا[1]

٦٠٧ھ کا وہ دن بھی یادگار ہے جس دن اہل شام اپنے خون سے اپنی تاریخ لکھ رہے تھے۔ اس روز جنگ صلیب وہلال زوروں پر تھی صلیبی افواج اسلحہ سے لیس ہو کر ارض فلسطین پر آفت کی طرح وارد ہوئیں اور طاعون کی طرح نابلوس وعکا کے شہروں میں پھیل گئی تھیں۔

صلیبی فوج تہذیب وتمدن کو غارت کرتی ہوئی ملک کے باشندوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہی تھی۔ اہل فلسطین ان کا مقابلہ تو کرتے لیکن ایک ایک کر کے بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیئے جاتے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دیار فلسطین نوجوانوں سے خالی ہو جائیں گے اور بوڑھے، بچے، عورتیں یا بزدل مال دار باقی رہ جائیں گے۔ جنھیں جہاد فی سبیل اللہ میں کوئی رغبت نہیں۔

میدان جنگ میں برسرپیکار لوگوں میں ایک جرأت مند خاتون میسون کے چار بھائی بھی شامل تھے۔ یہ غیرت مند خاتون اپنے گھر میں بیٹھی اپنے وطن اور بھائیوں کے بارے میں غور وفکر کر رہی تھی کہ وہ اپنے وطن عزیز کے لیے کیا کرے؟ جسے بیرونی دشمنوں اور اندرونی غداروں نے خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ وہ صبح وشام ان لوگوں پر کڑھتی رہتی جو دنیاوی دولت کی محبت میں اپنی تجارتوں، ملازمتوں اور دیگر پیشوں میں اندھے ہو چکے تھے۔ عزت اور سرخروئی کی زندگی کی بجائے ذلت اور نامردی کی غلامانہ زندگی پر ریجھے ہوئے تھے اور اس حقیقت کو بھول گئے تھے کہ وہ ان

شیر دل جواں مردوں کی اولادیں ہیں جنھوں نے ارضِ فلسطین میں شجاعتوں اور بسالتوں کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔

وہ ان مردوں کے دلوں میں شجاعت و بسالت کی روح پھونکنے کے لیے شب و روز سوچتی رہتی جو یقین کیے بیٹھے تھے کہ اب ان پر اللہ کی تقدیر نافذ ہے اور جہانبانی و حکمرانی کفار کا حق بن چکی ہے۔ لہٰذا جد وجہد اور سعی و عمل بیکار ہے اور یہ کہ مسلمانوں کے عروج کے دن کبھی واپس نہیں آ سکتے۔ وہ لوگوں کو خوابِ خرگوش سے بیدار کر کے انھیں باور کرانا چاہتی تھی کہ زندگی کسی خالی پیٹ کا نام نہیں، جسے بھرا جائے اور نہ ایسی شہوت کا نام ہے جسے پورا کیا جائے۔ بلکہ زندگی تو عزت و شرف اور سر بلندی و کامرانی کا نام ہے اور زندگی تو یہ ہے کہ انسان اپنے دین و ایمان اور وطن کے لیے لڑ جائے اور مسلمان یہ سوچ لے کہ جب تک فلسطین میں کوئی بھی عیسائی و یہودی ہے تب تک مسلم نوجوان پر اپنی بیوی سے اور مال دار پر اپنی دولت سے یا نرم و گرم بستر پر نیند سے لطف اندوز ہونا حرام ہے۔

وہ انھی سوچوں میں گم تھی کہ کسی نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور خلافِ واقعہ اطلاع دی کہ تیرے چاروں بھائی میدان جنگ میں کام آ گئے۔ یہ اندوہناک خبر میسون پر بجلی بن کر گری اور قریب تھا کہ وہ حواس کھو بیٹھتی لیکن اس کے دل میں ایمان و یقین کی چنگاری بھڑک اٹھی، جس نے اسے شیرنی کی طرح انتقام لینے کے لیے گرما دیا۔ پہلے تو وطن عزیز کی فکر تھی اور اب اس جذبے میں بھائیوں کا انتقام بھی شامل ہو گیا۔ ان جذبوں نے اس کے اعصاب میں بارود بھر دیا تاکہ وہ کڑکنے والے بادلوں کی طرح سوئے ہوؤں کو جگا دے یا انھیں ہمیشہ کی نیند سلا دے۔

میسون نے محسوس کر لیا کہ اس کے اعضاء میں ایسی قوت ہے جو پورے دمشق کو ہلا دے اور گلے میں ایسی آواز ہے جو مردوں کو جگا دے۔ دل میں وہ عزم ہے جو

لشکروں کو لڑا دے اور قلعوں کو گرا دے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی عورت کے دل میں ایمان پیدا ہو جائے تو وہ ایسے بہادر جوان پیدا کرتی ہے جو کبھی شکست نہیں کھاتے اس نے میدان عمل کی تلاش میں چاروں طرف نظریں گھمائیں لیکن اسے کوئی عزیز یا رشتہ دار نظر نہ آیا جو اس کا ساتھ دے چنانچہ اس نے آسمان کی طرف نظریں دوڑائیں تو اسے معلوم ہوا کہ تائید الٰہی نے اسے ایک کارنامے کے لیے منتخب کر لیا ہے جو ہمیشہ یادگار رہے گا، جس سے مردوں کو پتہ چل جائے گا کہ مردانگی اور شجاعت کیا ہے!

سب کچھ محسوس ہونے کے باوجود اسے سمجھ میں نہ آتا کہ عملاً کیا کرے۔ اسی سوچ و بچار میں وہ اپنے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ وہ چاہتی تو انہی ریشمی بالوں سے لوگوں کے دین وایمان خطرے میں ڈال دیتی لیکن اس غیرت مند خاتون نے کوئی اور ہی کارنامہ انجام دینا تھا۔ اسی دوران اسے اندھیرے میں کوندنے والی بجلی کی طرح امید کی کرن نظر آئی کہ یہی بال اس کا ہتھیار ہیں جن کے ذریعے وہ لشکروں کو میدان جنگ میں اتار سکتی ہے اور ممولوں کو شہبازوں سے لڑا سکتی ہے۔

وہ اپنی پڑوسنوں کے پاس گئی اور ان سے اپنے بھائیوں کا تذکرہ کرنے لگی۔ انہوں نے سمجھا کہ غم ہلکا کرنے کے لیے آئی ہے لیکن اس نے ایثار وقربانی اور سر فروشی کی ایسی داستان چھیڑی کہ وہ سب کی سب بے خود ہو گئیں اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار ہو گئیں۔

اس خاتون نے کہا ہم مرد تو نہیں جو لشکروں کی قیادت کریں اور تلوار چلائیں لیکن جب مرد بزدل ہو جائیں تو ہم میدان عمل میں اتر سکتی ہیں۔ بہنو! میرے یہ بال میری قیمتی متاع ہیں۔ میں انھیں جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لینے والے گھوڑوں کی رسیوں اور لگاموں کے لیے پیش کرتی ہوں تا کہ ان کے ذریعے مردوں (جہاد سے جی چرانے والے انسانوں) کو جگا سکوں۔

یہ کہہ کر اس نے سر کے بال کاٹ لیے اس کی سہیلیوں نے بھی ایسا ہی کیا اور ان سے خونریز معرکوں میں حصہ لینے والے گھوڑوں کی لگامیں اور رسیاں بنائیں اور جامع اموی کے خطیب سبط ابن جوزی کے پاس بھیج دیں۔ وہ انھیں جمعۃ المبارک کے روز اپنے ساتھ مسجد میں لے گیا۔ وہ مارے غیرت وحمیت کے کانپ رہا تھا اور اپنی نشست پر ٹھہر نہیں سکتا تھا اور منبر پر چڑھنے کے انتظار میں اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اذان شروع ہوئی اور وہ فوراً منبر پر آ کر بیٹھ گیا۔ لگامیں اور رسیاں اس کے سامنے تھیں۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک رہے تھے۔ لوگ ایک دوسرے کی طرف حیرت انگیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

جونہی اذان ختم ہوئی وہ کھڑا ہوا اور خطبہ دینے لگا۔ اس کا خطبہ درحقیقت وہ آگ تھی جس سے پتھر موم ہو گئے۔ اور جگر پاش پاش ہو گئے۔ ان جادو اثر کلمات کے متعلق خطیب کو خود معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ یہ اس کی زبان پر کہاں سے آ رہے ہیں کیونکہ اس کے دل نے یہ الفاظ عالم یقین سے اخذ کیے اور اس کی زبان پر ڈال دیے۔ کوئی آدمی انھیں روایت کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا کیونکہ یہ روح کا روحوں سے خطاب تھا۔ یہ خطاب ایسی بلیغ کرامت بن گئی جو ہر زمانے میں کسی محدث کی زبان اور ادیب حق گو کے قلم پر ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے خرق عادت خطبے کو ایسی روح عطا کرتا ہے جو روحوں کو کھینچتی ہے اور ایسا ہاتھ بنا دیتا ہے جو اعصاب کو کھینچ لیتا ہے۔

چنانچہ لوگوں نے اس کے جادو اثر خطبے کے الفاظ اپنے طور پر یوں بیان کیے ہیں:

> ”اے وہ قوم! جسے اس کے مذہب نے جہاد کا حکم دیا تو اس نے پوری دنیا فتح کر ڈالی اور بندوں کو صراط مستقیم پر چلا دیا۔ اب وہ بزدلوں کی طرح گھروں میں دبک کر بیٹھ گئی ہے تبھی تو دشمنوں نے اس کے ملک ہتھیا لیے اور انھیں دین اسلام سے برگشتہ کر دیا۔

☆......اے وہ قوم! جس کے اسلاف نے سچائی اپنا کر دنیا پر عدل و انصاف کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ اب وہ باطل سے دبک کر اپنے ہی ملکوں اور وطنوں میں محکوم ہوگئی ہے۔

☆......لوگو! تم اپنے عروج اور شاندار ماضی کو کیوں بھول گئے؟ تم نے عزت و وقار کا راستہ کیوں ترک کر دیا۔ تم اللہ کی راہ میں جہاد سے ہٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے تم پر ذلت و مسکنت مسلط کر دی۔ تم نے کس بنا پر سمجھ لیا کہ آج کے بعد عزت و وقار مشرکوں کے لیے ہے حالانکہ رب العزت نے فرمایا ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (المنافقون:۸)

”عزت اللہ تعالیٰ کی، اس کے رسول کی اور مومنوں کی ہے مگر منافق نہیں جانتے۔“

☆......لوگو! کس قدر ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ اللہ کے دشمن اور تمھارے دشمن تمھارے سامنے اس زمین پر حکمرانی کر رہے ہوں جس کی آبیاری تمھارے آباء و اجداد نے اپنے خون سے کی تھی۔ کیا یہ اندوہناک منظر تمھارے دلوں میں ٹیس پیدا نہیں کرتا کہ کفار نے تمھیں اسی زمین پر غلام بنا لیا، جس پر تم نے حکمرانی کرنی تھی۔

☆......مسلمانو! تم تو دنیا کے سردار تھے۔ کیا تمھارے اندر غیرت ختم ہوگئی؟ تمھاری حمیتِ ایمان گم ہوگئی کہ دشمنوں نے تمھارے بھائیوں کو گھیر رکھا ہے اور وہ انھیں نت نئے عذاب میں مبتلا کر رہے ہیں۔

☆لوگو......! کیا پورے ملک میں کوئی مسلمان نہیں رہ گیا؟ کیا پورے ملک سے عربی ختم ہوگئے؟ کیا پورے ملک میں کوئی انسان نہیں رہا؟

مسلمان...... مسلمان کی مدد کرتا ہے!

عرب...... عرب کی مدد کرتا ہے!

انسان...... انسان پر رحم کھاتا ہے!

جو کوئی فلسطینیوں کی مدد کے لیے نہ اٹھے وہ نہ مسلمان ہے نہ عرب اور نہ انسان۔

تم یہاں کھانے پینے میں مشغول ہو اور ناز و نعمت کے مزے اڑا رہے ہو جبکہ تمھارے بھائی جنگ کے شعلوں میں گھس کر آگ کے انگاروں پر لوٹ رہے ہیں۔

اے مسلمانو......! گھمسان کا رن پڑا ہے۔ جہاد کا منادی آواز دے رہا ہے۔ آسمان کے دروازے کھل گئے ہیں۔ اگر تم میدان کے مرد نہیں ہو تو راستہ چھوڑ دو۔ عورتوں کو جنگ کرنے دو اور تم جا کر چوڑیاں پہن لو! او پگڑیوں اور ڈاڑھیوں والی عورتو!

اگر ایسا نہیں ہے...... تو آؤ گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ۔ یہ ان گھوڑوں کی رسیاں اور لگامیں ہیں۔ او بے حس مسلمانو! جانتے ہو کہ یہ رسیاں اور لگامیں کس چیز سے بنی ہیں؟

یہ ان عورتوں کے ریشم و حریر جیسے بالوں سے بنی ہیں جنھیں شرم و حیا کی وجہ سے سورج کی آنکھ نے نہ دیکھا۔ واللہ! ان کے علاوہ ان کے پاس کچھ نہیں جس کے ذریعے وہ فلسطینیوں کی مدد کریں۔

انہوں نے یہ بال محض اس لیے کاٹ ڈالے کہ رسم محبت ختم ہو گئی اور جہاد مقدس شروع ہو چکا ہے۔ اللہ کے دین کے غلبے کے لیے وطن اور عزت کے استحکام کے لیے اگر تم ریشم جیسے بالوں کی بنی ہوئی رسیوں اور لگاموں کو لے کر گھوڑوں پر سوار نہیں ہو سکتے تو انھیں اپنی میڈیاں بنا لو! یہ عورتوں کے سروں کے بال ہیں۔ کیا تمھارے اندر شعور کا قحط پڑ گیا ہے؟

یہ کہہ کر اس نے وہ بال منبر سے لوگوں کے سروں پر پھینک دیئے اور چلا کر کہا: اے قبتہ النسر پھٹ جا! مسجد کے ستونو! گر پڑو! اے رجوم تو ٹوٹ جا کیونکہ مردوں کی مردانگی ختم ہو گئی!"

یہ سنتے ہی سامعین پُر جوش ہوگئے اور اُن کے دلوں میں بے تابانہ
غیرت وحمیت موجزن ہوگئی۔ اور وہ شہادت کی طلب میں بے تابانہ
اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اس خطبہ سے مردہ دلوں میں روح دوڑنے لگی۔ ان کی رگوں میں آباؤ اجداد کی روائتی شجاعت وبسالت لوٹ آئی۔ وہ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے میدان میں اترے اور انہوں نے شیروں کی طرح حملہ کرکے دشمنوں کو دبوچ کر عکا میں محصور کر دیا اور اتنا سخت محاصرہ کیا کہ انھیں ہلاکت نظر آنے لگی۔ اس طرح غیرت وحمیت والی خاتون کے ذریعے مسلمانوں کو فتح حاصل ہوگئی۔ سبط ابن جوزی کو اللہ تعالیٰ نے حیات جاوید عطا کی اور خاتون کے چاروں بھائی صحیح سلامت غازی بن گئے۔

دنیا مان گئی کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے غلام سو تو جاتے ہیں لیکن مرنہیں جاتے۔ اور دشمنان اسلام کسی مسلمان ملک پر چند سال حکومت تو کرسکتے ہیں لیکن مسلمانوں کا دین وایمان سلب نہیں کرسکتے۔ اور نہ ہی انہیں ہمیشہ کے لیے غلام بنا سکتے ہیں۔

......☆......

[1] اس قصے کا ماخذ بھی قصص من التاریخ مطبوعہ دمشق ہے۔

رحمدل فاتحین[1]

ماریٹ مضبوط اعصاب والی خوبرو اور نوجوان عورت تھی۔ حوادثات عالم سے اس کا دل قطعاً نہ گھبراتا تھا اور نہ وہ خوف اور گھبراہٹ کے نام سے ہی واقف تھی۔ لیکن حطین کے معرکے سے یورپین نوجوانوں کے دل دہل گئے اور ان کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اس خوفناک معرکے نے جنگجو یورپیوں کو چکی کے پاٹوں میں پسنے والے دانوں کی طرح پیس کر رکھ دیا اور دنیا بھر کے سورماؤں کو یوں چکرا دیا کہ انھیں پاؤں پر ٹھہرنے کی سکت نہ رہی۔ ان حالات میں حسین عورتوں کا ثابت قدم رہنا کیسے ممکن ہوتا۔

ماریٹ کا شوہر بیت المقدس سے مسلمانوں کو ہٹانے کے لیے نکلا تھا لیکن شام تک واپس نہ آیا اور نہ یہ ہی پتہ چلا کہ اس پر کیا گزری؟ چنانچہ وہ گھبراہٹ کے عالم میں گھر کی چار دیواری میں گھومنے لگی۔ اسے اپنے خاوند کے متعلق خوفناک خطرات چین سے بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ کبھی وہ اپنے شیرخوار بچے کو سینے سے چمٹا کر بوس و کنار کرتی اور کبھی اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی اور کبھی اپنے خاوند کی ہلاکت کے خطرے سے اس کا دل دہل جاتا۔ بچے کی یتیمی کا تصور اسے خوفزدہ کر دیتا اور وہ آنسو بہانے لگتی، جسے دیکھ کر بچہ بھی رونے لگتا۔

......☆......

ماریٹ کا خاوند اپنی قوم کا نامی گرامی شہسوار اور بڑا بہادر انسان تھا۔ اس کے

سامنے اطالویوں، انگریزوں، جرمنوں کی نہایت خوبصورت دوشیزائیں موجود تھیں لیکن وہ سب کی سب بیت المقدس کی اس عورت کے مقابلے میں ہیچ تھیں، جس کا حسن و جمال چاند کو شرم رہا تھا۔ جب دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے سے چار ہوئیں تو دونوں ہی ایک دوسرے کے دل میں اتر گئے اور رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ پھر جنت نظیر گھر میں ہنسی خوشی رہنے لگے۔

ماریٹ کا شوہر مذہبی طور پر ایسا کٹر انسان تھا کہ صلیب کی محبت کو اپنی طبعی محبت پر ترجیح دیتا اور خواہش مند رہتا کہ صلیبیوں کا پرچم سر بلند رہے۔ چنانچہ جہاں کہیں صلیب و ہلال کا معرکہ رونما ہوتا، یہ سب سے پہلے پہنچتا اور بیوی کی محبت مذہب کی محبت کے آڑے نہ آتی۔

دروازہ کھٹکا تو ماریٹ کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ موہوم خطرہ موت اور خوشخبری کے درمیان تصوراتی کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو اس کا خاوند صحیح سلامت اندر داخل ہوا۔ اس نے ماریٹ کو بازوؤں میں لے کر سینے سے لگا لیا اور فتح کی خوشخبری دینے لگا۔ وہ بتانے لگا کہ یسوع مسیح نے اپنے منکروں کو واپس دھکیل دیا ہے اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر یوں بھاگے کہ چھپنے کو جگہ نہ ملی۔ ماریٹ تیرے اس وطن میں ہمیشہ مسیحیت کا پرچم ہی لہرائے گا۔

ماریٹ کاش کہ تو اس منظر کو دیکھتی جب ہمارے نوجوان شہر کی فصیلوں سے دشمنوں پر پتھر پھینک رہے تھے! کاش کہ القدس کے باقی ماندہ نوجوان موجود ہوتے تو انھیں بھی پتہ چلتا کہ جنگ کس طرح لڑی جاتی ہے۔ صلیب کیوں نہ مقدس رہے گی؟ مسیحیت کا جھنڈا کیوں نہ سر بلند رہے گا؟

......☆......

میاں بیوی جشن منانے کے لیے گرجا گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں

ماریٹ کا شوہر مسلمانوں کی وحشت اور درندگی کے افسانے سنانے لگا کہ یہ لوگ دشمنوں کا خون پی لیتے اور گوشت کھا جاتے ہیں۔ ان کا بادشاہ صلاح الدین ایوبی بڑا خونخوار اور ظالم حکمران ہے۔ اس کے علاوہ وہ سب کچھ بیان کرنے لگا جو ان کے مذہبی پیشواؤں اور پادریوں نے مسلمانوں کے خلاف پھیلا رکھا تھا۔

جوں جوں ماریٹ کے کانوں میں یہ داستانیں پہنچتیں، اس کا دل بیٹھنے لگتا۔ وہ اپنے بچے کو سینے سے لگا کر بھینچتی اور دعا مانگتی کہ خداوند یسوع مسیح اسے اور اس کے باپ کو ان درندوں سے پناہ میں رکھے۔

جشن فتح منانے کے بعد واپس گھر لوٹے تو ماریٹ کے تصور میں دنیائے کائنات صلیب کے سامنے سرنگوں ہو گئی اور حالات و واقعات نے میسحیت کی خواہشات کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ وہ عالم تصور میں دیکھنے لگی کہ مساجد کے مینار، زمین بوس ہیں اور عیسائیت کا پرچم لہرا رہا ہے۔ وہ سمجھنے لگی کہ آج کے بعد کسی مسجد کے مینار سے اذان کی آواز نہ سنی جا سکے گی اور اب میرا خاوند صلیبی افواج کا اعلیٰ کمانڈر بن جائے گا۔ انھی حسین تصورات میں اسے نیند آ جاتی ہے لیکن چند لمحات میں تصورات کے عالی شان محلات یوں ریزہ ریزہ ہو گئے، جیسے طاقتور شاہین کے پر سے چڑیا کا کمزور گھونسلا ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اس کے کانوں میں مردوں اور عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی چیخیں پڑ رہی ہیں۔ وہ دہشت زدہ ہو کر بستر سے اچھلی اور بیٹے کو اٹھا کر خاوند کے بستر کی طرف لپکی لیکن وہ موجود نہ تھا۔ یہ گھر سے نکلی اور لوگوں سے اصل صورت حال پوچھنے لگی۔ انہوں نے بتایا کہ صلاح الدین آیا ہے اور اس نے القدس کا چکر لگا کر جبل زیتون پر پڑاؤ ڈالا ہے اور شہر پر اتنا زور دار حملہ کیا ہے کہ سیسہ پلائی ہوئی فصیل کی بنیادیں ہل گئیں اور اس کی افواج قاہرہ نے توپوں اور منجنیقوں سے یوں گولہ باری کی ہے کہ گویا آگ کا لاوا اوپر سے نیچے

کی طرف آ رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شیاطین بھی اس کے ساتھ حملہ میں شریک ہیں۔

......☆......

ماریٹ پر اعتماد تھی کہ ہمارا دفاع مضبوط ہے۔ ساٹھ ہزار جنگجو جوان اس شہر کی حفاظت پر مامور ہیں یہ ملک مکمل صدی سے ہمارے کنٹرول میں ہے۔ ہماری افواج کی قیادت سینٹ پال کر رہا ہے جو مذہبی جوش و خروش سے دشمن کے سامنے نبرد آزما ہے۔ لیکن صورت حال مایوس کن ہوگئی اور دل خوف سے دہلنے لگا۔ ہر خبر پہلی سے بھی خطرناک معلوم ہوتی اور اطلاع ملتی کہ دفاع کے حصار منہدم ہوتے جا رہے ہیں۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد اطلاع ملی کہ القدس کے در و دیوار پر سفید پرچم لہرا رہے ہیں اور صلیبیوں نے مسلمان سپہ سالار کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا ہے اور مسلمانوں سے معاہدہ کر لیا ہے کہ ان میں جو کوئی یہاں رہنا چاہے، اسے سلطان صلاح الدین کا محکوم بن کر رہنا ہوگا۔ اسے مسلمانوں کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے اور جو کوئی جانا چاہتا ہے وہ معاہدے کے مطابق دینار دے کر نکل سکتا ہے۔

چنانچہ جو لوگ القدس سے جانا چاہتے تھے وہ مردوں، عورتوں اور بچوں کی طرف سے دس دس، پانچ پانچ اور دو دو دینار ادا کر کے جانے لگے۔ لیکن ماریٹ اپنے بچے کو سینے سے لگا کر خاوند کی تلاش میں نکل پڑی۔ رات کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ یہ شہر کی فصیل کے ارد گرد گھومنے لگی۔ اسے اسلامی افواج اس شان سے داخل ہوتی نظر آئیں کہ روشن قندیلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں اور وہ فتح کا طبل بجا رہے تھے۔ یہ اپنے بچے کو لے کر میدان جنگ میں چلی گئی، جہاں صلیبی پرچموں میں لپٹی لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہ گلی سڑی لاشوں اور ان کے بکھرے ہوئے اعضاء سے دہشت زدہ ہو کر واپس جانا چاہتی تھی کہ خاوند کی محبت غالب آ گئی اور یہ آگے بڑھ

کر اسے تلاش کرنے لگی۔ دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے سورماؤں اور جنگجو مردوں کی لاشیں تلاش کر رہے تھے لیکن اندھیرے میں پہچاننا مشکل ہو رہا تھا اور پھر لاشیں بھی گل سڑ چکی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

یسوع اور کنواری مریم کے منکروں کی فتح کوئی کم درجہ کی مصیبت نہ تھی، جس نے صلیبی حکومت کے قیام و دوام کے خواب چکنا چور کر دیئے تھے اور اس پر خاوند کی گمشدگی دہرا عذاب بن گئی۔ اسے مختلف قسم کے وسوسوں نے گھیر لیا۔ وہ سوچنے لگی کہ پتہ نہیں اس کے خوبصورت بدن کے ساتھ کیا گزری اور اس کے ستاروں کی طرح چمکنے والے دانتوں کا کیا بنا؟ وہ کون سا آسمان ہے جو اسے سایہ کئے ہوئے ہے اور کون سی وہ زمین ہے جو اسے سموئے ہوئے ہے۔ جوں جوں یاد کرتی اس کا دل پسیج جاتا اور وہ آنکھیں بند کر کے تصورات کی آگ پر آنسوؤں کے قطرے بہا دیتی۔ غم کی وجہ سے اس کا دل پگھل رہا تھا اور جو چیز بے حد پریشان کر رہی تھی وہ یہ کہ اس مصیبت میں کوئی دلاسا دینے والا نہیں مل رہا تھا جو اس پر نظر شفقت ڈالے کیونکہ اس رات ہر ایک اپنے اپنے غم میں ڈوبا ہوا تھا اور نفسا نفسی کا عالم طاری تھا۔

وہ سوچنے لگی کہ صد (۱۰۰) سالہ صلیبی اقتدار کس طرح سمندر کی جھاگ ثابت ہوا جو آناً فاناً ختم ہو گیا اور وہ معرکہ جس کی ابتداء فتح و کامرانی اور محبت و وصال سے شروع ہوئی تھی کیونکر نامرادی اور شکست میں بدل گئی۔ جس ملک کو حاصل کرنے کے لیے پورا یورپ زور لگا رہا تھا کہ کس طرح ایک امیر کے ہاتھوں قبضہ سے نکل گیا۔ جب ایک مسلمان امیر تمام مسیحی حکمرانوں پر اتنا بھاری ثابت ہوا تو اس وقت کیا حال ہوگا جب تمام مسلمان سلاطین اکٹھے ہو جائیں گے۔

وہ سوچنے لگی کہ ایک چھوٹی سی مملکت کا یہ حال ہے تو اس وقت کس طرح کوئی طاقت مسلمانوں کے سامنے ٹھہر سکتی تھی۔ جب چین سے فرانس تک ایک ہی خلافت

قائم تھی۔

یہ مختلف لوگوں سے اپنے خاوند کے متعلق دریافت کرتی رہی لیکن کسی نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ ایک کریم النفس ملا بھی تو اس نے صرف اتنا کہا کہ میں نہیں جانتا۔ چاند آہستہ آہستہ بادلوں میں آنکھ مچولی کرتا ہوا کرہ ارضی پر روشنی ڈالنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ ٹوٹی ہوئی تلواروں اور تیروں کے درمیان زرہوں میں ڈھکی ہوئی لاشیں خاک وخون میں بکھری پڑی ہیں اور جن چہروں سے القدس کی سرزمین پر رونق تھی، وہ آج پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ یہ اپنے خاوند کو تلاش کرتی ہوئی ایک بوڑھے کے پاس سے گزری جو اس کے خاوند کا جاننے والا تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے میدان سے نکالا اور اپنے ساتھ گھر لے جانے لگا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا: ابا جان! آپ نے کہیں میرا خاوند دیکھا ہے؟

اس نے مایوس کن خبر دینے کی بجائے ادھر ادھر کی باتیں بتائیں تاکہ یہ مزید خوف زدہ نہ ہو۔ اس نے پھر سوال کیا:

ابا جان! اب یہ فاتحین ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ کیا وہ میرے بچے کو میرے سامنے کھا جائیں گے؟

اس نے جواب دیا:

تمہیں کس نے یہ جھوٹی باتیں بتائیں۔ مسلمان بڑے معزز اور رحم دل لوگ ہیں۔ ان کا بادشاہ صلاح الدین تمام حکمرانوں سے بڑھ کر رحم دل ہے۔ پھر وہ مسلمانوں کے کریمانہ اوصاف بیان کرنے لگا تو یہ منہ کھولتی رہ گئی۔ اس نے پھر بتایا کہ اگر وہ ہمیں ذبح بھی کر دیتے تو زیادتی نہ ہوتی بلکہ عین انصاف ہوتا کیونکہ ایک صدی پیشتر جب ہم یہاں داخل ہوئے تھے تو ہم نے مسلمانوں کو ان کے گھروں، گلیوں اور مسجدوں میں ذبح کیا تھا۔ اس دن ہم نے ستر ہزار (۷۰۰۰۰) بے گناہ

مسلمان بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل کیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ہم سے بچنے کے لیے فصیلوں سے زمین پر چھلانگیں لگا رہے تھے۔ اس دن ہماری درندگی پر کسی نے انکار نہ کیا اور نہ کسی کا دل پسیجا۔

......☆......

صبح ہوئی تو ماریٹ کو یوں محسوس ہوا کہ اس کا جگر جل رہا ہے اور جدائی کا خنجر اس کی پسلیوں کو چھید رہا ہے اور کوئی گتھی سلجھ نہیں رہی۔ وہ گھبرا کر اپنی پڑوسنوں کے پاس چلی گئی جو بھیانک صورت حال کا غور سے مشاہدہ کر رہی تھیں کہ اچانک القدس نعرہ تکبیر سے گونجنے لگا مسلمانوں اور عیسائیوں کے گروہ اکٹھے ہو گئے۔ مسلمان نعرہ تکبیر لگاتے اور یہ روتے اور واویلا کرتے۔ تمام عورتوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان قبۃ الصخرۃ پر چڑھا اور اس صلیب کو اتارنے لگا جو ایک صدی سے صخرہ پر نصب تھی اور گمان تھا کہ قیامت تک رہے گی۔

ان کے پاس مسلمانوں کے حسن سلوک کی وہ خبریں پہنچیں جن پر یقین کی بجائے تعجب آرہا تھا کہ مسلمانوں نے کسی کو تکلیف نہیں دی اور نہ کسی کے مال کو ہاتھ لگایا ہے بلکہ جو عیسائی شہر سے جانا چاہتے ہیں وہ معاہدے کے مطابق دینار ادا کر کے جا رہے ہیں بلکہ اپنا پسندیدہ مال بھی اٹھا رہے ہیں اور مسلمان فاتحین، عیسائی مفتوحوں سے ان کا زائد از ضرورت سامان قیمتاً خرید رہے ہیں اور عیسائی امن و سلامتی سے آجا رہے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جنگ کے دھنی مسلمان حالت امن میں بڑے متمدن اور باوقار لوگ ہیں۔ ان میں سوائے امن وسلامتی اور صلح وآشتی کے کچھ نظر نہیں آرہا اور یہ کہ مسلمانوں نے نصاریٰ کی بدعات کے خاتمے کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا اور مسلمانوں نے نورالدین شہید کا منبر حرم میں رکھ کر اس پر خطبہ دیا۔

ان کو عینی شاہد نے بتایا کہ میں بلا روک ٹوک مسلمانوں کے اجتماع میں شریک ہوا۔ وہ سب کے سب بغیر کسی امتیاز کے مسجد کے صحن میں بیٹھے تھے۔ مجھے ان کے سکون، وقار اور اللہ تعالیٰ کے سامنے خشوع وخضوع نے تعجب میں ڈال دیا کہ یہ لوگ جو میدان جنگ میں سرکش شیطان معلوم ہوتے تھے، مسجد میں کس طرح خدا رسیدہ راہب بن گئے ہیں اور ان کے خطیب نے جو خطبہ دیا ہے، مجھے یوں لگتا ہے کہ اگر یہ خطبہ ریگستان کے ٹیلے سن لیں تو حرکت کرنے لگیں اور تبدیل ہو کر شہسوار بن جائیں اور زمین پھاڑ کر رکھ دیں۔ اگر گم سم پتھر سن لیں تو ان میں زندگی سرایت کر جائے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ لوگ جب تک ایسے مسلمان رہیں گے، انھیں پوری دنیا مل کر بھی شکست نہیں دے سکتی۔

کیونکہ ان کے قلوب میں ایمان کی قوت موجود ہے جو تمام قوتوں سے بھاری ہے۔ ان کو کوئی چیز ڈرا نہیں سکتی کیونکہ لوگ موت سے ڈرتے ہیں اور یہ مسلمان موت (شہادت) کو محبوب سمجھتے ہیں۔ ہماری قوم کو اس ملک پر قبضے کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے کیونکہ اس قوم کا ہر فرد ہی صلاح الدین ایوبی ہے اور بہادری میں اپنی مثال آپ ہے۔ لہذا ہمیں بلا فائدہ جانیں ضائع نہیں کرنی چاہئیں۔

......☆......

ماریٹ نے اپنی قوم کے ایک گروہ کو دیکھا جو اسلام کے عادلانہ اور مساویانہ قانون میں رہنے کو ترجیح دے رہا ہے اور دوسرا فریق کوچ پر اصرار کر رہا ہے۔ اس نے کوچ کرنے والے فریق کے ساتھ جانا پسند کیا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس شہر میں گزرے ہوئے پر لطف لمحات اسے تڑپاتے رہیں۔

ماریٹ نے اس شہر کو الوداع کہا جو اسے تمام کرہ ارضی سے پیارا تھا جو کبھی اس کی قوم کے قبضہ میں تھا اور آج دشمن کے قبضہ میں۔ اور اب وہ اس شہر میں وہ اپنے

محبوب خاوند کو گم کر کے جا رہی ہے۔ جونہی خاوند کی یاد آئی تو سوچنے لگی پتہ نہیں کہ وہ بیچارہ کس وحشی درندہ کی خوراک بنا ہے یا کونسے پرندے کا پیٹ، اس کی قبر بنا ہے۔ پرانی یادوں نے اسے ایسا ستایا کہ وہ بلند آواز سے رونے لگی۔ اسے دیکھ کر باقی عورتیں بھی رونے لگیں، جن کے خاوند، یا عزیز واقارب قتل، یا قید ہو چکے تھے۔

ان لمحات میں انھیں ایک فوجی دستے نے روک لیا اور ایک جگہ چلنے کو کہا۔ وہ مارے خوف و دہشت کے اس طرف چلنے لگیں۔ جب وہ ایک فوجی دستے کے پاس پہنچیں تو انھیں ایک بزرگ صورت شہسوار نظر آیا۔ یہ نہایت اطمینان سے اسے دیکھنے لگیں۔ جب ان کے کانوں میں یہ آواز پڑی کہ یہی سلطان صلاح الدین ہے تو ان کے دل پسلیوں میں چلے گئے۔ ماریٹ نظریں چرا کر کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر نور، ہیبت اور رعب و جلال کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ جب یہ اس کے پاس پہنچیں تو اس نے پوچھا: کیوں روتی جا رہی تھیں؟ ایک عورت نے بتایا کہ ہمارے عزیز واقارب آپ کی قید میں ہیں اور ہمارے خاوند...... یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ان کے ساتھ ہی نرم دل فاتح بھی رونے لگا اور اس نے ان کے قیدی چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ انھیں حسب ضرورت مال و اسباب اور سامان خورونوش اور سواریاں دے کر روانہ کر دیا۔

......☆......

جب ماریٹ نے اپنے محبوب خاوند کو صحیح سلامت دیکھا تو سب مصیبتیں اور تھکاوٹیں دور ہو گئیں۔ بدبختی اور شکست کے صدمات بھول گئے۔ خوشی سے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ لوگوں کے سامنے ہی اپنے خاوند سے لپٹ گئی۔ اسے یہ خیال بھی نہ آیا کہ لوگ کیا کہیں گے۔

صلاح الدین کے عفو و کرم نے ہر مرد و زن کو اس کے عزیزوں کے ساتھ ملا

دیا۔ اب یہ سارے مل کر طرابلس کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ لوگ راستے پر چل نہیں رہے تھے بلکہ راستہ ان کو لیکر چلنے لگا۔ اب ان کے سینوں میں خوشی اور ناامیدی، میدان جنگ کی شکست اور قیدیوں کی رہائی میں کامیابی، فاتحین سے بغض اور ان کی نیکی کے شکریے جیسے جذبات کا تلاطم برپا تھا۔

ماریٹ کے دل میں اس حسن سلوک کے اعتراف کا داعیہ پیدا ہوا اور اسے اس محسن سلطان میں وہ مروت اور شرافت نظر آئی جو اپنی قوم کے مردوں میں مفقود تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس سے محبت کرنے لگے لیکن مذہبی تعصب آڑے آیا۔ وہ اس عظیم انسان کی کمزوریاں تلاش کرنے لگی کہ اسے کوئی خامی نظر آجائے جو بغض کا جواز بن جائے۔ پھر وہ سلطان صلاح الدین اور اپنے روحانی پیشوا پاپائے اعظم کے کردار کا موازنہ کرنے لگی جو گرجاؤں کے خزانے خالی کر کے تمام سونا چاندی اپنے ساتھ لے جا رہا تھا اور اس کے پاس اتنا اثاثہ اور اتنے درہم و دینار تھے کہ قافلہ کے ہر مرد و زن اس سے گزراوقات کر سکتے تھے لیکن وہ کسی ضعیف مرد و عورت کو ایک پائی بھی نہ دے رہا تھا جس سے وہ اس سے ایک دن کا کھانا خرید سکیں۔

وہ یاد کرنے لگی کے صلاح الدین نے باوجود معاہدے کے عیسائیوں کو اپنا مال و اسباب اٹھا کر لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ پھر وہ اپنی قوم کی وعدہ خلافیاں، معاہدوں کی بے حرمتی یاد کرنے لگی اور آرزو کرنے لگی کہ کاش وہ مسلمان ہوتی۔

سینوں میں موجزن ہونے والے جذبات کی لہریں عجیب وغریب منظر پیش کر رہی تھیں۔ جن میں ماؤں کی مامتا اور ان کا ایثار بھی تھا۔ اغنیاء کی دولت اور ان کی سنگدلی بھی تھی۔ صبر بھی تھا اور آہ و فغاں بھی، سچائی بھی تھی اور جھوٹی نمود بھی۔ اس میں یسوع مسیح کے نائب اور خلیفہ پوپ اعظم کی زاہدانہ زندگی کا بھانڈا بھی پھوٹ

رہا تھا، جو مال تو اس لیے جمع کرتا کہ غرباء و مساکین کی مدد کرے لیکن وہ اکیلا ہی کھاتا جا رہا تھا۔ لق و دق صحرا میں چلتا ہوا یہ قافلہ بے سرو سامانی کی حالت میں طرابلس پہنچا۔ کئی ساتھی بھوک اور پیاس سے زندگی کی بازی ہار چکے تھے۔

......☆......

جب یہ قافلہ طرابلس کے مین گیٹ پر پہنچا تو عیسائی امیر نے دروازہ بند کروا دیا تا کہ آنے والے اندر داخل نہ ہو سکیں۔ پھر اس نے قافلے کو لوٹنے کے لیے ڈاکو بھیج دیئے جن کے مقابلے کے لیے قافلہ کے جوان نکلے تا کہ اپنا مال و اسباب بچا سکیں۔ لیکن ڈاکوؤں نے ان کو قتل کر دیا مقتولوں میں ماریٹ کا شوہر بھی تھا۔

......☆......

باقی بچا کھچا قافلہ واپس بیابان میں یوں پھرنے لگا جیسے سمندر کی لہروں میں کشتی پھرتی ہے۔ اکثر لوگ تو واپس ارض اسلام میں لوٹ آئے اور امن و سلامتی اور آزادی سے رہنے لگے اور کچھ لوگ انطاکیہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ماریٹ بھی گم سم ان کے ساتھ چلتی پھرتی رہی۔ اس کا شعور جواب دے گیا۔ جب وہ انطاکیہ پہنچے تو انطاکیہ والوں نے انھیں بھگا دیا۔ پھر وہ واپس ارض اسلام میں آ گئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس دنیا میں امت محمدیہؐ کے علاوہ کوئی شریف اور نبیل قوم نہ ہو گی۔ البتہ ماریٹ تھک ہار کر اپنی جگہ پر لیٹ گئی کیونکہ اس کے ہاتھ پاؤں تھکاوٹ کی وجہ سے پھول چکے تھے اور چلنے کی طاقت نہ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد انطاکیہ سے اس کا ہم مذہب عیسائی نوجوان آیا اور اس سے غم خواری کرتا ہوا اپنے خیمے میں لے گیا جو ساحل سمندر پر واقع تھا۔ یہ وہاں پہنچتے ہی تھکاوٹ کی وجہ سے لیٹ گئی۔

تھوڑی دیر بعد اسے اپنے اردگرد ہونے والے شور و شغب نے اسے جگا دیا۔

اس نے سنا کہ ایک آدمی اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے:

ہم تجھے اس عورت کے پاس اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ یہ خوبصورت عورت ہمیں ملی ہے۔ پہلا جواب دیتا ہے: ”یہ میرا شکار ہے، میں نے اسے شکار کیا ہے۔“

وہ سمجھ گئی کہ اختلاف میرے متعلق ہی ہے اور میری عزت و آبرو پر جھگڑا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے ماضی کو یاد کرتی ہے کہ ایک تو خاوند مارا گیا، ساتھی تتر بتر ہو گئے اور آج عزت بھی برباد ہونے کو ہے۔ وہ غضبناک لہجے میں بولی:

”افسوس اہل یورپ! کیا یہ ہے تمھارا دین؟ اور یہ ہے تمھاری انسانیت؟ اور یہ ہے تمھاری شرافت اور مروت؟“

وہ دونوں قہقہے لگا کر ہنستے ہیں۔ اس کا غصہ بھڑک اٹھتا ہے اور چلا کر کہتی ہے:

میں تم سے کس زبان میں گفتگو کروں؟ کیا میں تمہیں [illegible] ہمائش کروں جبکہ تم ملحد اور کافر ہو۔ کیا میں تمہیں انسانیت کی زبان [illegible] بھاؤں جبکہ تم درندے ہو، جنھوں نے بنی آدم کی کھال پہنی ہوئی ہے یا مروت اور شرافت کی زبان میں خطاب کروں جبکہ تم اس کی حدود کو پامال کر چکے ہو اور وہ تمھارے اندر نظر نہیں آ رہی! تم پر ہلاکت ٹوٹ پڑے، تمہیں شرم نہیں آتی کہ یہ مسلمان تمھارے دشمن ہو کر بھی تمھاری عورتوں کی آبرو پر ڈاکہ نہیں ڈالتے اور شفقت و مہربانی سے پیش آتے ہیں اور تمھاری عزتوں کے تم سے زیادہ محافظ ہیں وہ تم سے زیادہ شرافت اور فضیلت والے ہیں۔ وہ یسوع مسیح کی ہدایات پر تم سے بدرجہا بڑھ کر عمل کرنے والے ہیں۔

اللہ کی قسم! تم میں نہ تو شرم و حیا نام کی کوئی چیز ہے اور نہ شرافت و مروّت ہی کا مادہ ہے! نہ تم مسیح کے امتی ہو نہ محمد (ﷺ) کے! بلکہ تم شیطان کے چیلے ہو اور محمد (ﷺ) کے امتی، مسیح اور محمد (ﷺ) دونوں کے امتی ہیں۔ وہ شرافت اور بزرگی

کے پیکر اور انسانیت کا نچوڑ ہیں۔ تم ان پر کبھی غالب نہیں آ سکتے، مستقبل ان کا ہے۔ فتح ونصرت ان کا مقدر ہے۔ تم ان سے ارض مقدس نہیں لے سکتے۔ وہ تم سے یسوع کے زیادہ وفادار ہیں۔ ان میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور تم! تم پر لعنت ہو۔ بربادی اور رسوائی تمھارا مقدار ہے۔

وہ دونوں پہلے سے زیادہ ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ چاروں طرف نظر دوڑاتی ہے کہ شاید کوئی مددگار مل جائے۔ مگر کہاں؟ جس شہر میں مسلمان نہ ہو، وہاں عزت کی پاسبانی کیونکر ہو سکتی ہے۔ وہ دونوں سرخ آنکھوں کے ساتھ اس پر جھپٹنے والے تھے کہ اس نے اپنے بچے کو سمندر میں پھینک کر خود بھی چھلانگ لگا دی۔ خاموش سمندر سے پانی کے دو چھل ابھرے جن میں مظلومہ کے سینے سے نکلی ہوئی سرخ لعنت نمودار ہوئی اور ان ظالم سامراجیوں پر پڑ گئی۔ وقت گزر گیا اور گزر رہا ہے لیکن سفاکیوں اور درندگیوں کی سیاہی عیسائی سامراج کے چہرے پر جیسی تھی ویسی اب بھی ہے دھل نہیں سکتی۔ (گوانتانا موبے اور ابوغریب جیسی جیلوں میں اب بھی اس کے مظاہرے دیکھے جا رہے ہیں۔)

......☆......

[1] اس واقعہ کا مآخذ بھی قصص من التاریخ مؤلفہ طنطاوی ہی ہے۔

ایمان کی قوّت

دمشق کا یہ بزرگ سردار اپنے قد کاٹھ اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے عدیم المثال سردار تھا یہ محض شکل وصورت کے اعتبار سے بزرگ نہ تھا بلکہ قلب ونظر کے اعتبار سے بھی فرشتہ سیرت انسان تھا اللہ نے اسے جہاں دولت دنیا سے نوازا تھا وہاں دادودہش کا حوصلہ بھی وافر مقدار میں عطا فرمایا تھا اس کے اسی وصف جمیل نے اسے اہل دمشق کی آنکھوں کا تارا بنا دیا تھا۔ چنانچہ وہ اس پر دل و جان سے فدا ہوتے تھے جب کبھی وہ سفر کے لئے روانہ ہوتا تو بیسوں انسان اسے الوداع کرنے جاتے اور جب وہ واپس لوٹتا تو انسانوں کا جم غفیر دیوانہ وار اس کے استقبال کے لئے نکلتا۔ اس کا ڈیرہ ہر وقت ملاقاتیوں سے بھرا رہتا اور خدّاموں اور غلاموں کو ان کی ضیافت سے فرصت ہی نہ ملتی تھی لیکن اس کی یہ قدر و منزلت اس کے حاسدین کو ایک آنکھ نہ بھائی اور انہوں نے امیر المؤمنین ہارون الرشید کے دربار میں یہ بات پہنچا دی کہ دمشق میں بنوامیہ کا ایک بزرگ سردار موجود ہے جو ہزاروں ایکڑ زرعی جاگیر اور سینکڑوں ایکڑ باغات کا مالک ہے اس کے ڈیرے میں صبح وشام بڑی رونق اور چہل پہل ہوتی ہے اور وہ نہایت کشادہ دل اور کشادہ ہاتھ ہے اس کے بیٹے اور پوتے، خدّام اور غلام گھوڑوں اور خچروں پر سوار ہوکر جہاد روم میں شرکت کرتے ہیں اور بنوامیہ کے کسی فرد کا اس قدر مالدار اور با اثر ہونا خطرے سے خالی نہیں اور ممکن ہے کہ وہ کسی وقت علم بغاوت بلند کردے اور ملک شام کو تمہارے ہاتھوں سے

چھین لے کیونکہ وہ ان شاہینوں کا چشم و چراغ ہے جو مشرق میں ایک صدی حکومت کرنے کے بعد ہسپانیہ میں جاہ و جلال سے حکومت کر رہے ہیں لٰہذا اس کی خبر لینی چاہئے ورنہ کسی وقت بھی کھڑاک ہو سکتا ہے۔

جونہی ہارون الرشید نے یہ بات سنی تو اس کی نیند حرام ہو گئی اور اس نے فوراً اپنے پولیس آفیسر منازہ کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ ابھی دمشق کی طرف نکلو اور اس آدمی کو بیڑیاں پہنا کر میرے پاس لاؤ اور اسے اونٹ کے ہودج میں ایک طرف بٹھانا اور خود دوسری طرف بیٹھنا اور اس کے گھر کا جائزہ لینا اور جو کچھ وہ کہے وہ حرف بحرف یاد رکھنا اور یہاں آ کر مجھے بتانا۔

پولیس آفیسر نے اموی بزرگ کی گرفتاری کا شاہی وارنٹ لیا اور اپنی پولیس کا خصوصی دستہ لے کر اپنے مشن کی طرف نکل پڑا اور عراق کے وسیع و عریض صحراؤں کو طے کرتا ہوا شام کے سرسبز و شاداب علاقوں میں داخل ہو گیا اس راستے میں اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے بے شمار عجائبات نظر آئے لیکن اس نے انہیں نظر بھر کر نہ دیکھا کیونکہ اس کی نظر اپنے اہم مشن کی تکمیل پر تھی وہ اسی فکر میں ڈوبا ہوا تھا کہ پتہ نہیں اتنے بڑے سردار بزرگ کی گرفتاری کس طرح عمل میں آئے گی۔ مبادا اس عمل میں ہولناک تصادم نہ ہو جائے کیونکہ رعیت کے کسی بے گناہ شخص کو رسوا کن طریقے سے گرفتار کرنے سے انسانی جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور لوگ مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے معاملہ کچھ سے کچھ بن جاتا ہے لیکن جو کچھ ہو سو ہو گرفتار تو بہر حال کرنا ہی ہے کیونکہ اس کو گرفتار کرنا امیر المؤمنین کا تاکیدی حکم ہے وہ یہ سوچتا ہوا دمشق میں داخل ہو گیا اور پوچھتا پچھاتا ہوا اموی سردار کے ڈیرے پر جا پہنچا اور بغیر پوچھے ہی اس کے ڈیرے میں داخل ہو گیا۔

جب اس کی قوم نے اسے دیکھا تو اس کے ساتھیوں سے اس کے متعلق پوچھا

کہ یہ کون ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ یہ خلیفہ بغداد امیر المؤمنین ہارون الرشید کی ذاتی گارڈ کا انچارج ہے تو وہ خاموشی سے پیچھے ہٹ گئے اور وہ صحن کے درمیان میں پہنچا تو اسے وہاں لوگوں کا جم غفیر بیٹھا ہوا نظر آیا، جب انہیں اس کا تعارف کروایا گیا تو وہ اٹھے اور اس کا خیر مقدم کیا اور اسے عزت واحترام سے بٹھایا اور اس سے آمد کا مقصد دریافت کیا تو اس نے اپنا مقصد بتانے کی بجائے اموی سردار کے متعلق پوچھا انہوں نے بتایا کہ ہم اس کی اولاد ہیں اور وہ حمام میں غسل کر رہا ہے۔ اس نے کہا کہ اسے کہو کہ جلدی کرے چنانچہ ان میں سے ایک آدمی اس کی طرف گیا اور اسے غسل سے جلدی فارغ ہونے کا پیغام دے آیا۔ اس دوران پولیس آفیسر اس کی حویلی کے احوال کا جائزہ لینے لگا اور اس کی شان وشوکت اور اس میں لوگوں کی گہما گہمی دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ جوں جوں اموی سردار کی آمد میں تاخیر ہوتی گئی اس کا خوف اور قلق بڑھتا گیا کہ مبادا وہ کہیں چھپ نہ جائے۔ تا آنکہ ایک پُر وقار اور وجیہہ شخص صحن میں داخل ہوا اور اس کے دائیں بائیں ۳۰، ۴۰ سال کے پختہ عقلمندوں اور ۲۰، ۳۰ سال کے جوانوں اور نوعمر بچوں کی جماعت تھی اسے دیکھ کر پولیس آفیسر کو یقین آ گیا کہ یہی وہ اموی بزرگ سردار ہے جسے میں نے گرفتار کرنا ہے اور یہ سب کے سب ان کے بیٹے اور پوتے ہیں۔

چنانچہ وہ السلام علیکم کہہ کر پولیس آفیسر کے پاس آیا اور اس سے امیر المؤمنین کی خیریت دریافت کی اور دیگر احوال پوچھتا رہا ابھی وہ اپنی باتوں میں تھا کہ اس کے خدام پھلوں بھری ٹوکریاں لے آئے اور انہیں کاٹ کاٹ کر رکابیوں میں رکھنے لگے۔ اس نے سیکورٹی افیسر کو کھانے کی دعوت دی جو اس نے قبول نہ کی اور اپنی نشست پر خاموشی سے بیٹھا رہا۔ اور اموی سردار اپنے ساتھیوں سمیت پھل تناول کرنے میں مشغول ہو گیا جب وہ پھل کھا چکا تو اس کے خدام اور غلام کھانے کا دسترخوان بچھانے میں مصروف ہو گئے اور انہوں نے مختلف رنگوں اور ذائقوں سے

بھرپور ایسا کھانا پیش کیا جو حکمران کے علاوہ کسی کو زیب نہ دیتا تھا اس نے پولیس آفیسر کو ایک مرتبہ پھر کھانا تناول کرنے کی دعوت دی جو اس نے قبول نہ کی اور اس نے بھی اصرار نہ کیا اور ساتھیوں سمیت کھانے میں مشغول ہو گیا جب وہ کھانے سے فارغ ہوا تو نماز میں مشغول ہو گیا اور قابل رشک اطمینان سے نماز پڑھی اور ہاتھ اٹھا کر پُرسوز انداز میں دعا و مناجات میں مشغول ہو گیا جب وہ دعا و مناجات سے فارغ ہوا تو اس سے پوچھا کہ بتاؤ کیسے آنا ہوا؟

اس نے امیر المؤمنین کا لکھا ہوا گرفتاری کا وارنٹ دکھایا جو اس نے نہایت اطمینان سے پڑھا اور پھر اپنی اولاد کو واپس چلے جانے کا حکم دیا اور کہا:

یہ امیر المؤمنین کا فرمان ہے میں اسے پڑھ کر ایک لمحہ بھر تاخیر کا روادار نہیں ہوں۔ لائیے اپنی ہتھ کڑیاں اور بیڑیاں اور مجھے پہنا دیجئے۔ چنانچہ سیکورٹی آفیسر نے ہتھ کڑیاں اور بیڑیاں منگوائیں اور اسے پہنا کر اونٹ کے ہودج میں ایک طرف بٹھا دیا اور خود دوسری طرف بیٹھ گیا جب وہ اسے لے کر دمشق سے باہر آیا تو وہ خندہ پیشانی سے پولیس آفیسر سے باتیں کرنے لگا جب وہ غوطہ کے باغات میں سے گذرے تو اس نے پولیس آفیسر سے کہا۔ یہ باغات دیکھ رہے ہو؟ ان میں مختلف اقسام کے پھل اور جدا جدا خوشبوؤں اور رنگوں کے پھول ہیں جب وہ اپنے پھلوں اور پھولوں سے بھرے باغات کی تعریف سے فارغ ہوا تو اپنے کھیتوں کا حسن و رعنائی بیان کرنے لگا جوں جوں وہ اپنے کھیتوں اور باغوں اور بستیوں کی تعریف کرتا پولیس آفیسر کو اس پر غصہ آتا لیکن مروتاً خاموش رہ جاتا لیکن ایک موقع پر اس نے حیرانی سے کہہ ہی دیا کہ:

اے اللہ کے بندے اپنی جاگیروں اور باغوں اور کھیتوں کی تعریف چھوڑ اور اپنے انجام کی فکر کر۔ امیر المؤمنین کو تیری اسی مالداری اور آسودہ حالی نے پریشان کر دیا ہے اور اس نے تجھے توہین آمیز طریقے سے گرفتار کر کے اپنے سامنے پیش

کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ہم انہیں کے حکم کے مطابق تجھے تیرے اہل و عیال اور حاشیہ نشینوں کی موجودگی میں گرفتار کر کے لا رہے ہیں۔ تجھے اس بات کی فکر ہی نہیں کہ تیرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

پولیس آفیسر کی بات سن کر اس نے إنا للہ وإنا إلیہ راجعون پڑھا اور کہا: اے منازہ، تیرے بارے میں میری فراست غلط ہوگئی، میں نے تو سمجھا تھا کہ امیر المؤمنین نے تجھے اچھی طرح کامل العقل سمجھ کر اس مقام پر فائز کیا ہے لیکن تیری بات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تو بھی عوام کالانعام کی سی باتیں کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ مددگار ہے۔

یہ جو تو نے کہا ہے کہ امیر المؤمنین نے مجھے اس حال میں تجھے اپنے دربار میں پیش کرنے کا حکم دیا ہے تو سن لے۔

مجھے اس خالق اور مالک پر مکمل بھروسہ ہے جس کے قبضہ وقدرت میں میرا مقدّر ہے۔ امیر المؤمنین نہ اپنے نفع ونقصان کے مالک ہیں نہ کسی اور کے۔ وہ اپنے آپ کو یا کسی اور کو اتنا ہی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں جتنا اللہ چاہے اس سے بڑھ کر کچھ نہیں کر سکتے۔ امیر المؤمنین کے بارے میں میں نے کسی ایسے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا جس کی وجہ سے میں غمزدہ ہو جاؤں جب انہیں میرے معاملے کا پتہ چل جائے گا کہ میں کسی بھی صورت میں ان کے حق میں بُرا نہیں ہوں اور حاسدوں اور دشمنوں نے میرے بارے میں حسداً ان کے کان بھرے ہیں اور مجھ پر وہ بہتان لگائے ہیں جن کی میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تو وہ میرے خون کو حلال نہیں سمجھیں گے اور مجھے عزت واحترام سے واپس بھیج دیں گے اور اگر اللہ کے علم میں یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ مجھے امیر المؤمنین کے ہاتھوں نقصان پہنچنا ہے اور انہوں نے میرا خون بہانا ہی ہے تو سارے انسان اور جن اور فرشتے مل کر بھی مجھے نہیں بچا سکتے۔ تو میں اس فیصلے سے جو اللہ میرے بارے میں لکھ کر فارغ ہو چکا ہے۔ کیوں غم کھاؤں اور کیوں

اس کی فکر کروں؟ مجھے اس اللہ کے بارے میں حسن ظن ہے جس نے تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے اور اسے رزق عطا کیا ہے اور زندگی اور موت اسی کے ہاتھ میں ہے اور جو ذات دنیا و آخرت کی مالک ہے اس کی رضا پر راضی رہنا اس پر صبر کرنا بہتر ہے اور میں تو سمجھتا تھا کہ تیرا اس بات پر پختہ ایمان ہے اور اب جبکہ مجھے تیری سمجھ داری کا پتہ چل گیا ہے۔ میں (انشاء اللہ) امیر المؤمنین کے سامنے پیش ہونے تک تجھ سے بات نہ کروں گا۔ اس کے بعد بزرگ سردار نے اپنے منہ پر مہر سکوت لگائی اور کوفہ پہنچنے تک سوائے سبحان اللہ الحمدللہ، لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہتے یا ضروری حاجت کے لئے پانی مانگنے کے اور کوئی بات نہ کی۔

چنانچہ جب پولیس آفیسر کوفہ میں داخل ہوا اور اسے ایک جگہ پر بٹھا کر امیر المؤمنین کے دربار میں پیش ہوا تو اس نے امیر المؤمنین کو اس کی شرافت و جاہت اور مال و دولت کی فراوانی اور اسے گرفتار کرنے اور اسے کوفہ تک لانے کی اوّل تا آخر کہانی سنائی تو ہارون الرشید بول اٹھا۔ اللہ کی قسم یہ آدمی سچا ہے اور اللہ کی نعمت کی فراوانی کی وجہ محسود ہے اور اس کے حاسدین نے آتش حسد میں جل کر اس کے بارے بے سروپا باتیں کی ہیں اللہ کی قسم ہم نے بلاوجہ اسے تکلیف دی اور اسے پریشان کیا اور اس کے اہل و عیال کو خوف زدہ کیا، اٹھ اور فوراً اس کی ہتھ کڑیاں کھول دے اور بیڑیاں اتار دے اور اسے عزت و احترام سے میرے پاس لا۔

سیکورٹی آفیسر اٹھا اور اس نے بزرگ سردار کی ہتھ کڑیاں اور بیڑیاں کھول دیں اور اسے ہارون الرشید کے دربار میں پیش کر دیا۔ ہارون نے جب بذات خود اس کے معصوم چہرے کا ملاحظہ کیا تو اس پر وارفتگی کی کیفیت طاری ہوگئی اور اس کا چہرہ سونے کی طرح تمتمانے لگا۔ بزرگ سردار نے قریب آ کر سلام کیا جس کا ہارون نے بڑی محبت سے جواب دیا اور اس کے حال احوال پوچھنا شروع کر دیئے اور کہا:

ہمیں آپ کی مالداری اور سرداری کی اطلاعات پہنچی تھیں اور ہمارے سامنے ایسی باتوں کا تذکرہ ہوا تھا جو ہمارے لئے تشویش ناک تھیں اس لئے ہم نے پسند کیا کہ آپ کو بلا کر ان باتوں کی اصلیت معلوم کی جاسکے اور ہم آپ کا جواب بھی سن سکیں اور آپ کے ساتھ کوئی نیکی کرسکیں۔ لہٰذا اب آپ اپنی ضروریات بیان کیجئے۔ بزرگ سردار نے پہلے تو ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کے لئے دعائے خیر کی اور ایک ایک بات کا شاندار اور تسلی بخش جواب دیا اور آخر میں درخواست کی کہ مجھے میرے مُلک اور گھر بار اور اہل وعیال میں سلامتی کے ساتھ واپس بھجوا دیا جائے۔

ہارون نے کہا: ایسا کرنا تو ہمارے ذمے ہے اور ہم اس فرض کو بجا لائیں گے لیکن آپ اپنی وجاہت اور شرافت سے متعلقہ ضروریات سے آگاہ کیجئے جنہیں پورا کرکے ہم آپ کے معاون بن سکیں کیونکہ آپ جیسے آدمی کو اپنی سرداری سے متعلقہ چیزوں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔

اس نے جواب دیا: اے امیر المؤمنین آپ کے افسران انصاف پرور ہیں اور ان کے عدل و انصاف نے مجھے کسی طرح کے سوال سے بے نیاز کردیا ہے اور امیر المؤمنین کی حکومت کے سائے میں میرے اور میرے اہل وطن کے معاملات ٹھیک طریقے سے چل رہے ہیں۔

ہارون الرشید نے کہا: تمہیں اپنے مُلک میں امن و امان سے جانے کی اجازت ہے اگر کبھی آپ کو ہماری ضرورت پڑے تو خط لکھ دینا تعمیل کردی جائے گی۔ اے منازہ اسے فوری طور پر وہاں پہنچاؤ، جہاں سے لائے تھے۔ چنانچہ اموی سردار کو عزت و احترام سے واپس پہنچا دیا گیا اور حاسدین کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔

حاسد اپنے حسد کی آگ میں خود ہی جلا کرے
وہ شمع کیوں بجھے جسے روشن خدا کرے

عالم ربّانی کی بے نیازی[1]

شام کے دارالحکومت دمشق میں یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ عثمانی خلیفہ کو للکارنے والا جرنیل اور شام کا فاتح ابراہیم پاشا اپنے لاؤلشکر سمیت حضرت علامہ سعید حلبی کی زیارت کو آرہا ہے۔

مصری افواج کا سپہ سالار ابراہیم پاشا بڑا سخت گیر اور ظالم انسان تھا۔ توحید پرستوں کا ازلی دشمن اور صلیبیوں کا آلہ کار۔ اسی ظالم نے حجاز مقدس میں اسلامی حکومت کو ختم کیا، درعیہ کے شہداء کی پاکیزہ لاشوں کو توپوں سے اڑایا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے ان کی بے حرمتی کی تھی اور جو کام صلیبیوں سے نہ ہو سکا وہ اس ظالم نے کر دکھایا۔

شیخ کے تلامذہ اور عقیدت مند آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے کہ درپیش صورت حال میں کیا کیا جائے؟ ابراہیم پاشا بڑا ظالم حکمران ہے اور حضرت العلام شیخ سعید ایک عالم ربانی ہیں۔ کسی دنیا دار کی خوشامد کرنا ان کے خمیر میں داخل نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ حضرت کی خودداری اور بے نیازی کی بنا پر کمینگی پر اتر آئے۔ کیونکہ اکثر لوگ مال و دولت اور زرق برق پوشاکوں اور عمدہ گاڑیوں کو دیکھ کر انسان کی قدر و منزلت کا اندازہ لگاتے ہیں لیکن حضرت سعید کا معاملہ ان کے برعکس تھا۔ وہ آدمی کی قدر منزلت کا اندازہ جاہ و منصب اور عہدہ و حکمرانی سے نہیں بلکہ ذاتی سیرت و کردار اور ایمان و تقوی سے لگاتے تھے۔

کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے؟ چند احباب کی رائے یہ تھی کہ ابراہیم پاشا سے گزارش کی جائے کہ وہ یہ ارادہ ترک کر دے لیکن بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ پاشا اپنے محل میں ہے اور چاروں طرف سیکورٹی فورس اور مسلح باڈی گارڈ تعینات ہیں۔ وہ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دیتے۔

ایک تجویز پیش ہوئی کہ حضرت شیخ کی خدمت میں عرض کی جائے، وہ دفع شر کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے پاشا کا استقبال کریں! لیکن شیخ کو یہ مشورہ کون دے؟

حضرت العلام شیخ سعید کا رعب و دبدبہ اور ہیبت بادشاہوں سے کہیں زیادہ تھی۔ بادشاہوں کے گرد سیکورٹی تعینات ہے تو شیخ کے گرد فرشتے ہیں جو علم کی فضیلت کی وجہ سے اس پر سایہ کیے رکھتے ہیں۔ بالآخر انہوں نے معاملہ حضرت شیخ اور ابراہیم پاشا پر چھوڑ دیا۔ حکومتی کارندے راستوں کو سجانے لگے اور دونوں طرف جھنڈے گاڑ کر اعلیٰ اقسام کے پھول منگوانے لگے تاکہ انھیں ابراہیم پر نچھاور کر سکیں۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد وہ عوام کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر اور سرکاری پروٹوکول کے ساتھ شیخ کی طرف چلنے لگا۔ جب وہ مسجد کے دروازے پر پہنچا تو مسجد کا چھوٹا سا دروازہ زبان حال سے یوں گویا ہوا:

> ”پاشا! واپس چلا جا۔ یا اپنی خدائی پیچھے ہٹا دے اور اللہ تعالیٰ کے گھر میں خاکسار اور عاجز بن کر داخل ہو۔ کیا تجھے شرم نہیں آتی کہ تو زرق برق پوشاکوں میں ملبوس ہو کر اور پھر ہزاروں غلاموں کو ساتھ لے کر اللہ تعالیٰ کے گھر میں ٹھکا دکھانا چاہتا ہے۔“

اسلام توحید اور مساوات کا علمبردار ہے جب کہ جاہلیت، شرک اور طبقاتی کشمکش کی ذمے دار ہے۔ گویا دونوں آگ اور پانی کی طرح متضاد ہیں۔ جب

جوہری فرمانے لگے:

''لوگو! میں تمھارا استاذ ہوں اور یہ میرے استاذ ہیں۔ پھر انہوں نے تفصیل سے اپنی خطا اور اس کی سلیقہ مندی کا قصہ سنایا۔ پھر فرمایا جو بات میں نے کل کے وعظ میں کہی تھی کہ: ((اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ طَلَّقَ وَظَاھَرَ وَآلٰی)) اس میں، میں نے ظَاھَرَ کہہ کر غلطی کی تھی اور میں سرعام اس سے رجوع کر کے اللہ کے سامنے توبہ کرتا ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے اس نوجوان کے لیے بڑی طویل دعا کی۔ مخلوق خدا اس پر آمین کہہ رہی تھی۔

......☆......
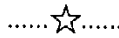
[1] یہ قصہ احکام القرآن امام ابوبکر بن العربی مالکی میں موجود ہے۔

غار والوں کی کہانی[1]

ایک حقیقت تمثیلی انداز میں

منظر: (پہاڑوں کے درمیان تنگ اور ٹیڑھا سا راستہ ہے۔ گھنگھور گھٹاؤں اور بادلوں نے دن کو تاریک رات میں تبدیل کر دیا ہے۔ بادل گرج اور کڑک رہے ہیں، بجلیاں کوندرہی ہیں اور موسلا دھار بارش برس رہی ہے۔ تین آدمی اس دوران پہاڑی ڈھلوان سے اتر کر وادیوں کی طرف جا رہے ہیں۔ بادلوں کی گرج اور کڑک سے خوف زدہ ہو کر، کبھی آسمان کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی اس سیلابی ریلے کی طرف، جو پہاڑوں سے بہتا ہوا ان کے پیچھے آ رہا ہے۔ دو آدمی تو ڈوبنے کے خطرے سے نجات حاصل کرنے کے لیے دوڑ رہے ہیں اور تیسرا آدمی کچھ سوچتا ہوا، تیز تیز چل رہا ہے)

سعد: فاروق پیچھے مڑ کر کیا دیکھتے ہو؟ تیز دوڑو تاکہ محفوظ ٹھکانے میں پناہ حاصل کریں۔

فاروق: (تھوڑی دیر سوچ کر) ہمارا ساتھی سعود پیچھے رہ گیا ہے۔

سعد: وہ کیا کر رہا ہے؟ بہت سست آدمی ہے۔ چھوڑو اسے اور اپنی جان کی فکر کرو۔

فاروق: سعد بھائی! یہ کوئی مناسب بات ہے کہ ہم اپنے ساتھی کو راستہ میں چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ (بلند آواز سے) سعود! ارے سعود!

سعود: (دور سے آواز سنائی دیتی ہے) فاروق بھائی کیا بات ہے؟

فاروق: کہاں کھو گیا ہے بھاگ او بھاگ اور ہمارے ساتھ مل۔

سعود: ذرا ٹھہرو میں آیا۔

سعد: ٹھہرو! وہ ابھی آتا ہے بیچارہ بڑی تیزی سے بھاگتا ہوا آرہا ہے۔

سعود: (ہانپتے ہوئے) ساتھیو! میرا خیال ہے کہ ہم لوگ یہاں رک جائیں اور بارش تھمنے کے بعد روانہ ہوں۔

سعد: خوب رائے دی۔ سیلابی ریلا آئے اور ہمیں غرق کر دے۔ صاحب تو ہمیں غرق کرنا چاہتا ہے۔

سعود: نہیں، بلکہ تو ہمیں راستے میں ڈبونا چاہتا ہے۔ بھلا ہم اس ہنگامی صورت حال میں کس طرح سیلابی ریلے سے بھاگ کر نکل سکتے ہیں۔ البتہ کسی تدبیر سے بچ ضرور سکتے ہیں۔

سعد: کس طرح بچ سکتے ہیں؟

سعود: اس طرح کہ ہم پہاڑ کے دامن میں غار کے اندر پناہ حاصل کریں۔ (سیلابی ریلا فرائے بھرتا ہوا سنائی دیتا ہے)

فاروق: ہائے اللہ! آواز تو سنو! سیلابی ریلا تو آیا!

سعود: جلدی کرو غار کے اندر چلو کہیں ہم ڈوب نہ جائیں۔

سعد: بھئی یہ چٹان! جو غار کے دہانے پر لڑھکتی معلوم ہوتی ہے۔

سعود: تو پھر کیا ہے؟

سعد: تمہیں خوف نہیں آتا، اگر یہ گر پڑی تو غار کا منہ بند ہو جائے گا اور ہم زندہ درگور ہو جائیں گے۔

سعود: صدیوں سے یہ چٹان یونہی کھڑی ہے۔ اسے کوئی آج ہی گرنا ہے!

سعد: کیا ضمانت ہے کہ آج بھی نہ گرے اور ویسی ہی کھڑی رہے؟

سعود: (مذاق اڑاتے ہوئے) چلو سب ختم تو ہو جائیں گے نا اور تیری رفاقت سے

جان چھوٹ جائے گی۔

فاروق: یہ جان بچانے کا وقت ہے جھگڑنے کا نہیں۔ بحث ختم کرو، اللہ بہتر کرے گا چلو غار میں۔

(تینوں تیزی سے اوپر چڑھ کر غار میں داخل ہو جاتے ہیں)

غار کے منہ کی طرف سے تھوڑی بہت روشنی آ رہی ہے اور سیلاب کی گھڑگھڑاہٹ بڑھ رہی ہے۔

سعود: ہاں بھئی سعد کتنا اچھا ہوا۔ اگر ہم تیری مان لیتے تو اس خوفناک سیلاب میں ڈوب مرتے۔

سعد: اگر یہ چٹان غار کے دہانے پر گر پڑی تو؟

سعود: (تمسخرانہ انداز میں) تب ہم تیری رائے درست مان لیں گے۔

فاروق: افسوس ہے تم پر۔ اللہ کا ذکر کرو اور دعا مانگو کہ اللہ خیر کرے اور انجام بخیر ہو، بحث کیوں کرتے ہو؟

(غار کے دہانے کی طرف سے تھرتھراہٹ سنائی دیتی ہے)

فاروق: ہائے اللہ یہ کیا ہو گیا۔

سعد: چٹان لڑھک رہی ہے۔

سعود: یا اللہ خیر۔

سعد: (چٹان کو غار کے دہانے پر دھڑام سے گرتے دیکھ کر) ہائے یہ تو واقعی گر پڑی۔

(غار کا دہانہ بند ہو جاتا ہے، روشنی ختم ہو جاتی ہے اور گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے)

فاروق: لاحول ولا قوۃ إلا باللہ. إنا للہ وإنا إلیہ راجعون.

سعد: کیا میں نے خدشہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ یہ لڑھکتی نظر آ رہی ہے۔ سعود! تمھاری غلط تدبیر نے ہمیں یہاں پھنسایا، کوئی تدبیر کرو اَب نکلنے کی۔

سعود: اگر صورت حال یوں ہی رہی تو ہلاکت یقینی ہے۔

سعد: اور اب کیا غیر یقینی ہے؟

سعود: یہ تیری نحوست ہے۔تو نے ہی نحوست پھیلائی تھی کہ کہیں گر نہ پڑے۔

سعد: تو کیا اسے میری نحوست نے اکھاڑا ہے؟

سعود: ہاں۔

فاروق: بھائیو یہ بحث و تکرار بند کرو۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہم پر اسی جھگڑے کی شامت پڑ گئی ہے۔

سعد: مجھے نشانہ بنانے کا کوئی حق نہیں، یہ شامت یقیناً کسی دوسرے کی وجہ سے پڑی ہے۔

فاروق: سعد! اللہ کے لیے اب یہ بحث ختم کرو۔ سعود بولتے نہیں! کہاں چلے گئے ہو؟

سعود: (چٹان دھکیلتے ہوئے) میں کوئی چارہ کر رہا ہوں۔

سعد: زور لگاؤ زور، تمھارے دھکیلنے کیہی کسر تھی۔

سعود: سعد مذاق کیوں کرتے ہو۔

سعد: یہ مذاق والا کام نہیں تو اور کیا کر رہے ہو۔ اس چٹان کو تو سو آدمی مل کر بھی نہیں ہٹا سکتے ہم تین کیسے ہٹا سکیں گے؟

فاروق: سعود ادھر آؤ اور میرے پاس بیٹھو۔ اگر اللہ تعالیٰ نے رحم نہ فرمایا تو ہلاکت یقینی ہے۔ سعد اپنا ہاتھ ادھر کرو۔

سعد: یہ ہے میرا ہاتھ۔

فاروق: (سعد کا ہاتھ سعود کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے) پہلے مصافحہ کرو اور باہم ایک دوسرے سے معافی مانگو کیونکہ ناچاقی کے ہوتے ہوئے اللہ بھی رحم نہیں کرتا۔

سعد: مجھے معاف کر دو سعود!

سعود: میں نے معاف کیا، سعد تم بھی معاف کر دو۔

فاروق: الحمدللہ! میری سنو، میں نے اللہ والوں سے سنا ہے کہ جب کوئی آدمی مصیبت کے وقت اللہ کے سامنے اپنے کسی نیک عمل کا وسیلہ پیش کرے تو اللہ تعالیٰ مہربانی فرماتا ہے۔ہمیں چاہئے کہ اپنے اپنے کسی نیک عمل کو یاد کریں اور اس کے بعد اللہ کو پکاریں۔

سعد: فاروق! تم نیک آدمی ہو اس لیے پہلے تم ہی کوئی نیک عمل پیش کرو۔

فاروق: یہ تو اللہ جانتا ہے کہ کون نیک ہے۔ میں تو انتہائی گنہگار ہوں۔ میرے پلے سوائے اس کے کوئی عمل نہیں کہ میں بوڑھے والدین سے اچھا سلوک کیا کرتا تھا۔

سعود: بیان کرو نا! بھئی کہ بوڑھے والدین سے اچھا سلوک کرنا بڑا نیک عمل ہے۔

فاروق: میری عادت تھی کہ میں روزانہ بکریاں چراتا اور شام کو گھر لوٹتا تھا۔بکریوں کا دودھ دوہ کر پہلے اپنے بوڑھے والدین کو پلاتا اور پھر اپنے بیوی بچوں کو۔ایک روز میں بکریاں چراتا چراتا بہت دور نکل گیا اور رات گئے واپس آیا تو مجھے میری بیوی بھوک سے نڈھال ملی۔

فاروق کے گھر کا منظر

(فاروق دودھ کا پیالہ ہاتھوں میں تھامے کھڑا ہے۔سامنے بیوی ہے جو پوچھتی ہے)

بیوی: فاروق آج کہاں چلے گئے تھے؟

فاروق: آج بکریاں چراتے چراتے دور نکل گیا تھا۔میرے والدین کہاں ہیں؟

بیوی: وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے ہیں۔

فاروق: ہائے افسوس! بغیر کھانا کھائے سو گئے۔

بیوی: لاؤ دودھ بچے رو رو کر بدحال ہو چکے ہیں۔

فاروق: اللہ کی بندی والدین کو پلائے بغیر ہی، نہیں! ہرگز نہیں۔

بیوی: وہ تو سو چکے ہیں جبکہ بچے بھوک کی وجہ سے رو رہے ہیں۔ پہلے بچوں کو پلا لو جب وہ جاگیں گے تو پھر انھیں پلا دینا۔

فاروق: نہیں ایسا نہیں کروں گا۔

بیوی: تو پھر انھیں جگا کر پلا دو۔

فاروق: میں ان کی نیند کیوں خراب کروں۔

بیوی: پھر کیا کرو گے؟

فاروق: کھڑا رہتا ہوں، جب از خود جاگیں گے تو پلاؤں گا۔

بیوی: تو بچوں کا کیا کروں؟

فاروق: انھیں بہلاؤ تاکہ وہ سو جائیں۔

(آیئے واپس غار کی طرف)

سعود: پھر تیرے والدین کب جاگے؟

فاروق: طلوع فجر پر۔

سعد: تو ساری رات دودھ لے کر کھڑا رہا۔

فاروق: ہاں اور بچے میرے قدموں میں روتے روتے سو گئے۔

سعود: پھر تو نے والدین کو دودھ پلا کر ہی اپنے بچوں کو پلایا؟

فاروق: ہاں۔

سعود: یار ایسی خدمت تو نہ کبھی سنی اور نہ دیکھی۔ مبارک ہو، آفرین ہو تجھ پر۔

فاروق (آنسو بہاتا ہوا ہاتھ اٹھاتا ہے اور کہتا ہے) اے اللہ اگر تو جانتا ہے کہ میرا یہ عمل خالصتاً تیری خوشنودی کی خاطر تھا تو، تو ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دے۔

سعد: سعود دیکھو چٹان ذرا سی سرک گئی اور روشنی اندر آ گئی ہے۔

سعود: میرے اللہ کریم تیرا شکر ہے۔
سعود: لیکن ہم باہر تو اب بھی نہیں نکل سکتے کیونکہ سوراخ بہت تنگ ہے۔
فاروق: اب آپ کی باری ہے۔ تم بھی کوئی ایسا عمل یاد کرو جو زندگی کے کسی حصہ میں فقط اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا ہو۔
سعود: سعد بھائی تم بھی کوئی عمل پیش کرو اور اللہ سے دعا کرو۔
سعد: نہیں بھائی سعود! میرے پلے کوئی ایسا عمل نہیں جو بارگاہِ الٰہی میں پیش کروں لہٰذا تم ہی کوئی نیکی یاد کرو۔
سعود: نہیں، بلکہ تم ہی کوئی نیک عمل پیش کرو اور چھوٹی سی نیکی کو بھی معمولی نہ سمجھو کوئی بھی نیکی یاد کرو اور اسے حقیر نہ جانو۔ اللہ کسی نیک عمل کو حقیر نہیں سمجھتا۔
سعد: ایک بات یاد آ گئی ہے جو نیکی تو نہیں بلکہ برائی سے بچاؤ ہے لیکن بیان کرنے سے شرم آتی ہے۔
فاروق: افسوس ہے تجھ پر، تجھے پتہ نہیں کہ برائی سے بچنا بھی نیکی ہے، شرم کس بات کی۔
سعد: اس کے تذکرے سے۔ میری قریبی عزیزہ کی عزت کا مسئلہ ہے۔
فاروق: ہمارا وعدہ رہا ہم اس بات کو کسی کے سامنے ذکر نہیں کریں گے۔
سعد: میرے چچا کی ایک بیٹی تھی۔ میں اس سے اتنی محبت کرتا تھا کہ بیان سے باہر ہے لیکن میں تنگدست اور فقیر انسان تھا۔ میری ناداری کی وجہ سے میرے چچا نے مجھے اس کا رشتہ نہ دیا۔ لیکن اس کی محبت میرے رگ و ریشہ میں بس گئی تھی۔ چنانچہ میں نے حصول مراد کے لیے خوب محنت کی حتی کہ میں اپنی بستی کا دولت مند شخص بن گیا۔ ایک روز مجھے شیطان نے ورغلایا، میں نے اسے روپے پیسے کا لالچ دے کر گناہ کی دعوت دی جو اس نے ٹھکرا دی۔ البتہ ایک سال اسے قحط سالی اور فاقہ کشی نے گھیر لیا اور وہ میرے پاس امداد کے لیے آئی۔

(سعد کے گھر کا منظر)

سعد: مرحبا پیاری محبوبہ! سنایئے کیسے آنا ہوا؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ چچا زاد کی محبت کھینچ لائی ہوگی۔ آیئے اپنے شایان شان نرم و نازک قالین پر تشریف رکھیے۔

خاتون: گھریلو حالات بہت خراب ہیں۔ چند دینار چاہئیں جن سے ضرورت پوری ہو جائے۔

سعد: لذت وصال کا وعدہ بھی کرتی ہو؟

خاتون: ہاں اگر تو اس پر اصرار کرتا ہے تو!

سعد: میں نے ساٹھ دینار کہے تھے لیکن اب ایک سو بیس دینار دوں گا۔ مزید درکار ہوں تو بتاؤ؟

خاتون: نہیں اتنے ہی کافی ہیں۔

سعد: (دیناروں کی تھیلی پکڑاتے ہوئے) اے میری عرصہ دراز کی آرزو یہ لو تھیلی۔

خاتون: اللہ تجھے خوش رکھے۔ تیری اس نیکی سے میری اولاد اور میرے شوہر کی زندگی بچ جائے گی۔

سعد: براہِ مہربانی میرے سامنے اپنے شوہر کا ذکر نہ کرو۔

خاتون: افسوس اے چچا زاد! اگر تجھے اس کے نام سے غیرت آتی ہے تو کیا اسے یہ دینار دیکھ کر نہ آئے گی۔

سعد: کیا اس نے اجازت دی تھی؟

خاتون: ہاں اور اس وقت وہ رو رہا تھا کیونکہ بچے فاقہ سے مر رہے تھے۔

(سعد کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ مغلوب شہوت ہو کر اپنا ہاتھ اس کی کلائی پر رکھ دیتا ہے)

سعد: یہ روپے میں واپس نہیں لوں گا۔ آؤ میرے پاس آؤ تاکہ تھوڑی سی لذت وصل بھی حاصل ہو۔

(بے چاری خاتون اس کی آرزو پوری کرنے کی حامی بھر کر رونے اور لرزنے لگتی ہے)

سعد: روتی اور کپکپاتی کیوں ہو؟

خاتون: اللہ کے خوف سے اور تو بھی اللہ سے ڈر اور میری مجبوری پر ترس کھا اور حرام کاری سے بچ اور مجھے بھی بچا۔

سعد: تو مجبوری کی حالت میں اللہ کا خوف کر رہی ہے۔ اِناللہ میرے جیسا بد بخت بھلا کون ہوگا جو اس حال میں بھی اللہ سے نہ ڈرے۔ اٹھ جا! میں تیرے کپڑے کو بھی ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔

خاتون: پھر یہ دینار لے لو۔

سعد: کیوں؟ جاؤ یہ بھی لے جاؤ میں نے یہ دینار تمہیں اللہ کے لیے بخش دیئے۔

خاتون: اور میرا خاوند سمجھے گا کہ.........

سعد: چھوڑ و اس بات کو مجھے تیرے خاوند کا نہیں بلکہ اللہ رب العالمین کا خوف ہے۔ اسے یقین دلانا کہ اللہ نے تیری عزت کو سلامت رکھا ہے۔

(غار میں)

سعود: اور پھر وہ تیرا مال لے گئی؟

سعد: ہاں اور اس وقت میرا دل آتش شوق سے پگھل رہا تھا۔

(ہاتھ اٹھا کر روتے ہوئے فریاد کرتا ہے) اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے فقط تیرے خوف سے اسے چھوڑ دیا تھا اور دینار بھی اسے بخش دیئے تھے تو تو اس چٹان کو غار کے دہانے سے ہٹا دے اور ہمیں نجات دے دے۔

سعود: فاروق ذرا ادھر دیکھنا چٹان سرک پڑی ہے۔ سعد تجھے مبارک ہو۔

فاروق: اللہ کریم تیرا شکر ہے۔

سعود: اب تو آسمان بھی نظر آنے لگا ہے۔

فاروق: البتہ آدمی یہاں سے نکل نہیں سکتا۔ کیونکہ جگہ اب بھی تنگ ہے اللہ کرے کہ چٹان مزید کچھ سرک جائے۔

سعد: سعود بھائی اب تو!

فاروق: ہاں سعود بھائی اب تیری باری ہے۔

سعود: میرا ایک عمل ہے جو میں نے اپنے اللہ کے لیے کیا تھا اور ارادہ تھا کہ کسی سے بیان نہ کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ عمل پوشیدہ ہی رہے۔

سعد: نہیں بھائی! ایسا نہ کرو بلکہ ضرور بیان کرو۔ دیکھتے نہیں ہو کتنی بڑی مصیبت ہے۔ اگر تو اس کو یاد کر کے دعا نہ مانگے تو ہم اس مصیبت سے نجات کیسے پائیں گے؟

سعود: میں کسی دور میں کاشت کاری کرتا تھا۔ میں نے اپنے کام کے لیے چند مزدور رکھے جنھوں نے سارا دن کام کیا۔ جب شام ہوئی تو میں نے مزدوروں کو مزدوری دے کر رخصت کر دیا۔ مگر ایک مزدور کے ساتھ تلخی کر بیٹھا جو مجھ سے ناراض ہو کر بغیر مزدوری لیے چلا گیا۔ بعد میں مجھے اپنے کیے پر پشیمانی ہوئی۔ میں اس کی تلاش میں نکل پڑا لیکن وہ نہ مل سکا۔ میں نے اس کی مزدوری کو اپنی تجارت میں شامل کر لیا اس نیت سے کہ وہ جب کبھی ملا اس کا حصہ اسے دے کر اپنا قصور معاف کراؤں گا۔ اس تجارت میں اللہ تعالیٰ نے برکت دی اور میرے ساتھ اس کا مال بھی بڑھ گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اسے کسی مصیبت نے گھیرا اور وہ خود ہی اپنی سابقہ مزدوری لینے آ گیا۔

(عرصہ دراز کے بعد سعود کے کھیتوں میں سلمان کی آمد کا منظر)

سلمان: سعود کیا مجھے جانتے ہو؟

سعود: تو کون ہے؟ تو سلمان نہیں ہے؟

سلمان: ہاں میں سلمان ہی ہوں۔ یار تجھے میرا نام ابھی تک یاد ہے۔

سعود: بھئی تو اتنی دیر کہاں رہا۔ میں تجھے تلاش کرتے کرتے تھک گیا۔

سلمان: میری مزدوری کا صاع مجھے دے دیجئے۔ میں مصیبت کا مارا دوبارہ آیا ہوں۔ تھوڑی سی رقم کے حصول کے لیے لمبی مدت کے بعد اپنے حق کا سوال کرنا نا مناسب محسوس کرتا تھا لیکن مجبوریاں بہت کچھ کرا دیتی ہیں۔

سعود: یہ گائیں، بکریاں اور چرواہے دیکھ رہے ہو؟

سلمان: ہاں یار! تو بہت امیر ہو گیا ہے۔

سعود: یہ سب تیرا مال ہے، جسے میں امانت سمجھ کر سنبھالتا رہا ہوں۔ یہ لے جاؤ اور مجھے اس امانت کے بوجھ سے سبکدوش کرو۔

سلمان: مذاق نہ کرو سعود۔ میں مصیبتوں کا ستایا ہوا ہوں۔ ایسے تمسخر اور ٹھٹھے کی وجہ سے میرا آنے کو جی بھی نہیں چاہتا تھا لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔

سعود: اللہ کی قسم مذاق نہیں بلکہ یہ سب کچھ تیرا ہی ہے۔

سلمان: واقعی سچ کہہ رہے ہو؟

سعود: بالکل سچ ہے، اللہ کی قسم!

سلمان: یار تو کس قدر دیانت دار ہے، آدھا خود رکھ لو۔

سعود: نہیں سلمان، اللہ تعالیٰ تیرے مال میں برکت کرے۔

سلمان: شاید تجھے ضرورت پڑ جائے۔

سعود: افسوس اے سلمان! اگر اللہ تعالیٰ مجھے محتاج کر دیتا تو میں کس طرح آپ کے مال کی حفاظت کرتا۔

(غار کی طرف)

سعد: اور پھر وہ سب بکریاں اور گائیں لے گیا؟

سعود: ہاں اور مجھ سے میری بیوی مہینہ بھر ناراض رہی کہ تو نے سلمان سے آدھا مال کیوں نہ لیا اور میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کشائش اور فراوانی بخشنے والا ہے۔

فاروق: بھائی آپ کا عمل تو ہمارے اعمال سے بڑھ گیا۔ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس مبارک عمل کی برکت سے مصیبت دور کر دے۔

سعود: (روتے ہوئے ہاتھ اٹھاتا ہے اور کہتا ہے) اے اللہ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ سب کچھ تجھے راضی کرنے کی خاطر کیا تھا تو اس سینکڑوں من وزنی چٹان کو غار کے دہانے سے ہٹا دے۔

سعد: (خوشی سے چلاتے ہوئے) دیکھو چٹان ہٹ گئی اور راستہ بن گیا۔ الحمدللہ! الحمدللہ!

فاروق: اللہ کریم تیرا بہت بہت شکریہ جو تو نے ہمیں زندہ درگور ہونے سے بچا لیا۔

تینوں خوشی سے اچھلتے ہوئے باہر آ کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں اور خوشی خوشی اپنی بستیوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔

......☆......

[1] اس تمثیلیے کا اصل صحیح بخاری مع فتح الباری کتاب احادیث الانبیاء میں ہے۔ کرداروں کے نام ہم نے خود تجویز کیے ہیں۔

ثریٰ سے ثریا تک[1]

ایک مرتبہ خلیفۃ المسلمین ہارون الرشید کی خدمت میں پستہ بادام کا فالودہ پیش کیا گیا جو انہوں نے نوش فرمالیا۔ فالودہ اس قدر خوش ذائقہ اور شریں تھا کہ ہارون الرشید کی طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ جی میں آیا؛ کیوں نہ ہو کہ ایسا لذیذ اور مفرح مشروب، ذہین وفطین عالم کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

ہارون الرشید علماء وادباء کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے اپنے بیٹوں کی تربیت بھی اس طرح کی تھی کہ وہ علمائے کرام کے جوتے اٹھانے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ وہ خود بھی علمائے کرام کی دعوتیں کرتا، اپنے ہاتھ سے ان کے ہاتھوں پر پانی انڈیل کران کے ہاتھ دھلواتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے دور کے مشہور فقیہ قاضی ابو یوسف یعقوب بن ابراهیم کو دعوت طعام دی اور ان کی خدمت میں وہی مشروب پیش کر کے اسے نوش کرنے کی درخواست کی۔ جب قاضی صاحب نے اس قدر جانفزا اور خوشگوار مشروب نوش کیا تو ان کا دل مسرت سے لبریز ہو گیا۔ انہوں نے اس مشروب کے متعلق تعریفی کلمات ارشاد فرمائے۔

خلیفۃ المسلمین نے انھیں بتایا کہ یہ پستہ بادام کا فالودہ ہے اور خاص طور پر میرے لیے تیار کیا گیا ہے۔ آئندہ یہ فالودہ میرے لیے تو ہفتہ میں ایک مرتبہ اور آپکے لیے روزانہ تیار کیا جائے گا۔

قاضی ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم نے یہ بات سنی تو کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

جب خلیفۃ المسلمین نے اس طرح بے ساختہ ہنسنے کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ دراصل مجھے یہ جان کر کہ یہ پستہ بادام کا فالودہ ہے، اپنے استاذ محترم کی بات یاد آگئی، جسے اللہ تعالیٰ نے سچ کر دکھایا ہے۔

بات یہ ہے کہ میرے بچپن میں میرے والد ماجد کی وفات اور گھر میں ناداری کی وجہ سے فاقوں تک کی نوبت پہنچنے لگی۔ میری والدہ نے اس صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لیے مجھے ایک دھوبی کے ہاں مزدوری کے لیے بھیج دیا۔ چنانچہ میں روزانہ دھوبی کے ہاں مزدوری کے لیے چلا جاتا۔ راستہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس طلباء کو حصول علم میں مشغول دیکھتا تو میں بھی کبھی کبھار ان کی مجلس میں بیٹھ کر درس سننے لگتا۔ مجھے ان کے درس سے لطف حاصل ہوتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے کام میں ناغہ کرنا اور ادھر درس میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ جب میری والدہ کو اس بات کی اطلاع ہوتی تو وہ مجھے وہاں لینے آجاتی اور مجھے کام پر جانے کی ہدایت کرتی تاکہ گھر کی دال روٹی چلتی رہے۔ جب امام ابوحنیفہؒ نے یہ صورت حال دیکھی تو میری والدہ کو سمجھایا کہ بچے کو پڑھنے دو اور جس طرح ہو سکے صبر شکر کے ساتھ گزارا کرو لیکن اس نے اپنی ناداری اور گھر میں فاقہ کشی کا عذر پیش کیا اور گزارش کی کہ آپ مہربانی فرمائیں اور میرے بیٹے کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دیں تاکہ یہ دھوبی کی مزدوری کر کے پیٹ پالنے کا سامان کر سکے۔ چنانچہ میں اسکے ساتھ چلا گیا اور سارا دن دھوبی کے ہاں مزدوری کرتا رہا۔ اگلے روز پھر درس میں آکر بیٹھ گیا۔ امام ابوحنیفہ نے مجھے دیکھ کر اپنے پاس بلایا اور چپکے سے حکم دیا کہ تو روزانہ یہاں پڑھنے آجایا کر ہم تجھے روزانہ مزدوری جتنی رقم دے دیا کریں گے جس سے تمھارے گھر کا خرچہ چلتا رہے گا۔

چنانچہ چند روز ایسا ہوا تو وہ دھوبی سیدھا ہمارے گھر پہنچا اور میری والدہ سے

کہنے لگا۔

بی بی آپ کا بچہ کام پر نہیں آ رہا، اگر میں نے کوئی دوسرا بچہ کام پر رکھ لیا تو ناراض نہ ہونا۔

یہ سن کر میری والدہ پھر حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس گئی اور دھوبی کی بات بتائی اور مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے فرمایا:

بی بی! اس بچے کو علم حاصل کرنے دے ان شاء اللہ کسی دن اسی علم کی بدولت اللہ تعالیٰ تیرے بچے کو پستہ بادام کا فالودہ پلائے گا۔

چنانچہ میری والدہ یہ بات سن کر بادل نخواستہ واپس گھر آ گئی اور سوچنے لگی کہ ہماری قسمت میں پستہ بادام کا فالودہ کہاں یہ تو امام صاحب کی محض طفل تسلی ہے۔

اس کے بعد حضرت الامام نے ہمیں گزارا الاونس دیکر پڑھانا شروع کر دیا اور آج اللہ تعالیٰ نے ان کی بات پوری کر دکھائی۔

قاضی ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم بچپن میں نادار ضرور تھے لیکن بلا کے ذہین وفطین تھے۔ ان کی اسی خوبی کو حضرت امام ابوحنیفہ نے اپنی فراست مومنانہ سے بھانپ لیا تھا اور لائق شاگرد کی ایسی تربیت کی کہ وہ اس دور کی سب سے بڑی سلطنت اسلامیہ کے چیف جسٹس اور قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بلا کا ذہین ہو جب تک اساتذہ کا احترام نہ کرے اور ان کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل نہ کرے وہ کسی بھی منصب اور عہدے پر نہیں پہنچ سکتا۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ آداب کا بہت خیال رکھا کرتے تھے درس حدیث کے لیے بیٹھنے سے پہلے غسل کرتے اور اجلے دھلے کپڑے پہن کر خوشبو استعمال کرتے اور درس حدیث میں اس شان سے بیٹھتے کہ سبحان اللہ:

ایک مرتبہ انکو دوران درس بچھو نے سات مرتبہ کاٹا لیکن یہ حدیث کے احترام

میں نہایت صبر سے تکلیف برداشت کرتے رہے اور درس حدیث ختم کر کے طلباء سے کہا کہ میری قمیض سے بچھو نکالو اس نے مجھے کاٹ کھایا ہے۔

آپ نے صرف طلبا کو ہی نہیں بلکہ حکام کو بھی علم اور اہل علم کا احترام سکھاتے تھے حضرت عبدالرحمٰن بن قاسم مالکی فرماتے ہیں کہ: میں بیس سال تک امام مالک کے پاس رہا۔ دو سال علم سیکھا اور اٹھارہ سال ادب سیکھتا رہا بعد میں جب ادب کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوا تو خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں وہ دو سال بھی ادب سیکھنے پر صرف کر دیتا۔

اس دور میں ائمہ دین محض علم پڑھا کر مدرسہ سے فارغ نہ کرتے تھے بلکہ طلباء کو ادب بھی سکھاتے تھے۔ ان کے سکھائے ہوئے ادب کی وجہ سے ان کے شاگرد تحت الثریٰ سے عوجِ ثریا تک جا پہنچتے تھے۔

چنانچہ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے قاضی ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم کوفی کو چند آداب سکھائے اور انھیں ان پر کاربند رہنے کی ہدایت کی۔ انہوں نے ان پر عمل کیا تو چیف جسٹس کے عہدے پر فائز ہو گئے اور عزت و آبرو سے زندگی بسر کرتے رہے۔

وہ آداب یہ ہیں:

۱۔ عام لوگوں کے سامنے گفتگو نہ کرنا اِلاَّ یہ کہ وہ تجھ سے از خود کوئی بات پوچھیں (تو اس بات کا جواب دے دینا)

۲۔ نوخیز لڑکوں سے گپ شپ نہ کرنا، کیونکہ وہ فتنہ کا دروازہ ہیں۔ نہ سیر سپاٹے اور گھومنے پھرنے کے لیے بازار کا رخ کرنا۔

۳۔ اپنے سے بڑی عمر کے ان پڑھ لوگوں میں شامل ہو کر راستے میں نہ چلنا کیونکہ اگر تو ان کے پیچھے چلا تو تیرے علم کی توہین ہو گی اور آگے بڑھا تو تجھے بے

ادب سمجھا جائے گا کیونکہ وہ عمر میں تجھ سے بڑے ہوں گے اور حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: ''جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور بڑوں کی عزت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔''

۴۔ کثرت سے نہ ہنسنا، کیونکہ اس طرح دل مردہ ہو جاتا ہے۔

۵۔ راہ چلتے وقت دائیں بائیں نہ جھانکنا بلکہ زمین پر نظر رکھنا۔ (اِلَّا یہ کہ مجبوراً دیکھنا پڑ جائے)

۶۔ کسی کے سامنے اپنی تنگ دستی کا اظہار نہ کرنا اور حتی الوسع بے نیازی اور قلت رغبت اور قلت حرص کا اظہار کرنا۔

۷۔ کنجوسی اور بخل سے بچنا کیونکہ اس سے مُرُوْءَت (مردانگی) ختم ہو جاتی ہے۔ طمع خور اور کذّاب بھی نہ بننا (اور نہ جاسوس، چغل خور، دھوکے باز اور پردہ در بننا)

۸۔ اس دنیا کو حقیر سمجھنا جو اہل علم کے ہاں حقیر ہے۔ جائز کاموں میں روپے پیسے کے معاملے میں کنجوسی نہ دکھانا۔

۹۔ باہمت انسان بننا کیونکہ کم ہمت انسان کی کوئی وقعت نہیں ہوتی اور وہ لوگوں کی نگاہوں میں گر جاتا ہے۔

۱۰۔ جو مسلمان تجھ سے مشورہ کرے تو اللہ کی خوشنودی پر نظر رکھ کر اسے صحیح مشورہ دینا۔

۱۱۔ لوگوں کے راز افشا نہ کرنا (اِلَّا یہ کہ اس میں کسی مسلمان کا نقصان نہ ہو)

۱۲۔ بادشاہ یا امیر آدمی کے پڑوس میں گھر نہ خریدنا۔ اپنے پڑوسی کے عیبوں پر پردہ ڈالنا کیونکہ یہ بھی امانت ہے (اِلَّا یہ کہ وہ علانیۃً بدکار ہو)

۱۳۔ خواہش پرستوں کے پاس دعوت الیٰ اللہ کی نیت کے بغیر نہ بیٹھنا اور گالی گلوچ

نہ کرنا۔

۱۴۔ اپنے طور طریقے اور اپنی دنیا پر مطمئن نہ ہونا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کے متعلق پوچھنا ہے۔

۱۵۔ ہر مہینے چند دنوں کے روزے ضرور رکھنا تاکہ دوسرے بھی تجھے دیکھ کر روزے رکھنا شروع کر دیں۔

۱۶۔ نمازوں کے بعد اللہ کے ذکر و شکر اور تلاوت قرآن کے لیے وقت نکالنا۔

۱۷۔ اس نیت سے لوگوں میں اللہ کا ذکر کثرت سے کرنا کہ وہ بھی تیری پیروی میں کثرت سے ذکر الٰہی کریں (ان کے ذکر کا تجھے بھی ثواب ہوگا کیونکہ تو ان کی نیکی کا سبب بنا)

۱۸۔ قلت حرکت اور سکون کی عادت اختیار کرنا تاکہ لوگوں میں تیرے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے اور تیری مستقل مزاجی کا اظہار ہو۔ یہ عمل تیرے روشن ضمیر ہونے پر بھی دلالت کرے گا۔

۱۹۔ گفتگو کے وقت منہ پھاڑ پھاڑ کر بولنے اور آواز بلند کرنے سے گریز کرنا کیونکہ یہ انداز قلتِ عقل پر دلالت کرتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَآءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ﴾ (الحجرات: ۴)

''بلاشبہ (اے ہمارے پیارے نبی!) جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے آواز دیتے ہیں اُن میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔''

۲۰۔ خوف کی حالت میں نظری مسائل کی مجلس میں گفتگو نہ کرنا کیونکہ اس حالت میں زبان میں ثقل اور الفاظ میں خلل پیدا ہوتا ہے۔

۲۱۔ جب تو (چند روز کے لیے) کسی ایسے شہر میں جائے جہاں اہل علم موجود ہوں تو

وہاں عام لوگوں کی طرح دن بسر کرنا تاکہ انھیں یہ خوف نہ ہو کہ تو ان کا منصب اور مقام چھیننا چاہتا ہے۔ ورنہ وہ متحد ہو کر تیرے خلاف محاذ بنا لیں گے اور تیرے علم اور عقیدے پر طعن کریں گے اور تو مفت میں بدنام ہو کر نکلے گا۔

۲۲۔ ان کے اساتذہ کی تنقیص نہ کرنا ورنہ وہ تجھے بدتمیز اور بے ادب سمجھیں گے۔

۲۳۔ اگر وہ تجھ سے فتویٰ طلب کریں تو واضح دلیل سے انھیں فتویٰ دینا۔ انھیں اپنے ساتھ مناظرہ کا موقعہ نہ دینا۔

۲۴۔ لوگوں سے محتاط رہنا۔ اللہ سے خلوت میں بھی ایسے ہی ڈرنا جیسے جلوت میں ڈرتا ہے کیونکہ علم سے اس وقت تک کما حقہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا جب تک کہ انسان کا باطن اس کے ظاہر کے مطابق نہ ہو۔

۲۵۔ سکون و اطمینان سے چلنا (کیونکہ اللہ کے بندے زمین پر سکون سے چلتے ہیں)۔

۲۶۔ اپنے کاموں میں جلد بازی اور تیزی نہ کھانا (اِلَّا یہ کہ وہ کام جن کے جلدی بجا لانے کی تاکید حضرت رسول کریمؐ نے کی ہے)

۲۷۔ عام گزرگاہ پر نہ بیٹھنا۔ اگر مجبوراً بیٹھنا ہو تو مسجد میں جا بیٹھنا۔ نہ ہی بازاروں اور مسجدوں میں بیٹھ کر کھانا (اِلَّا یہ کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو)

۲۸۔ عام لوگوں جتنی عبادت پر کفایت نہ کرنا بلکہ ان سے زیادہ عبادت کرنا کیونکہ جب تو بھی اتنی ہی عبادت کرے گا جتنی وہ کرتے ہیں تو وہ سمجھیں گے کہ تجھے عبادت کا شوق نہیں اور تیرے علم نے تجھے اتنا ہی نفع دیا جتنا انھیں ان کی جہالت نے۔

۲۹۔ جب بادشاہ تجھے کسی منصب پر فائز کرے تو اس منصب کو اس وقت تک قبول نہ کرنا جب تک تجھے یقین نہ ہو جائے کہ اس نے محض علم کی بنا پر تجھے اس

منصب پر فائز کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔

۳۰۔ جب تجھے کسی انسان کے شریر ہونے کا پتہ چل جائے تو اس کے شر کا چرچا نہ کر بلکہ اس کی خیر کا چرچا کر اور اس کی خیریت طلب کر، البتہ دین کے معاملے میں اس کے شر کو برداشت نہ کر، بلکہ لوگوں کو بتا تاکہ وہ اس کے پیچھے اندھے کنویں میں نہ گریں۔ فرمان رسول ﷺ ہے کہ: فاجر آدمی کے فسق و فجور کا چرچا کرو تاکہ لوگ اس سے بچیں، اس کے دنیاوی ٹھاٹھ باٹھ اور طمطراق کی پرواہ نہ کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ تمھارا حامی و ناصر ہوگا۔ اگر تو نے ایسا کر دکھایا تو وہ تجھ سے ہیبت کھائیں گے اور دین میں بدعت جاری نہ کریں گے۔

۳۱۔ جب موذن اذان دے تو سب سے پہلے مسجد میں داخل ہونے کی تیاری کر تاکہ عام لوگ تجھ سے سبقت نہ لے جائیں۔

۳۲۔ اپنا دنیاوی کاروبار کسی دیانت دار آدمی کے سپرد کر کے خود علم میں مشغول رہنا۔ اصول مناظرہ سے عاری اور جاہ وحشمت کے پجاری مولویوں سے مناظرہ نہ کرنا کیونکہ انھیں تیرے حق پر ہونے کی شرم نہیں وہ تو صرف تیری رسوائی چاہتے ہیں۔ نہ ہی گھسے پٹے مسائل پر بحث کرنا۔

۳۳۔ جب تو کسی قوم میں موجود ہو تو از خود ان کی امامت نہ کرنا۔

۳۴۔ جب تو امراء و کبراء کی مجلس میں داخل ہو تو اس وقت تک نمایاں نشست پر نہ بیٹھ جب تک وہ تجھے خود نہ بٹھائیں ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ تیرے ساتھ بد اخلاقی کریں۔ (اور تجھے اس نشست سے اٹھا دیں)

نوٹ: اس طرح کی حرکت پر میں نے دو مولویوں کو رسوا ہوتے دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ نگران وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف سیلاب زدگان میں رقوم تقسیم کرنے کے لیے گورنمنٹ ہائی سکول حویلی لکھا میں آئے تو ایک بدعتی مولوی از خود ہی وہاں تیار

کردہ اسٹیج پر براجمان ہو بیٹھا۔ یہ دیکھ کر اے سی صاحب دیپالپور نے اسے اٹھا کر نواز شریف کی استقبالی لائن میں کھڑا کر دیا اور اسے دوسرے لوگوں کی طرح استقبال کرنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ وہ مولوی قطار میں کھڑا ہوکر دست بستہ غلام کی طرح حاکم صوبہ کا استقبال کرتا نظر آیا۔

دوسری مرتبہ میونسپل کمیٹی کے اجلاس میں مجھے بھی شمولیت کی دعوت تھی۔ میں وہاں پہنچا تو لان میں کوئی کرسی خالی نہ تھی لہٰذا پیچھے کھڑا ہو گیا، لیکن جونہی شیخ محمد صادق ممبر بلدیہ کی نظر مجھ پر پڑی تو اس نے اپنی کرسی میرے لئے خالی کر دی اور مجھے صدر مجلس میں بٹھا لیا اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گئے یہ دیکھ کر ایک سبز عمامہ والا مولوی صاحب پچھلی نشستوں سے اٹھ کر از خود ہی اسٹیج سیکرٹری کی کرسی پر آن بیٹھا۔ انتظامیہ نے اسے وہاں سے زبردستی اٹھا دیا اور سخت سست بھی کہا۔ چنانچہ وہ بھیگی بلی کی طرح ایک طرف کھڑے ہو گیا۔

امام جعفر ہاشمیؒ کی اپنے بیٹے موسیٰؒ بن جعفر کو وصیتیں:

فرمایا: ''اے میرے بیٹے میری وصیت پر عمل کر اور اسے یاد رکھ۔ اگر تو نے اسے یاد رکھا تو خوش نصیبی سے زندگی بسر کرے گا اور عزت کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو گا۔

۱۔ میرے بیٹے! جو شخص اللہ کے تقسیم کردہ رزق پر قناعت کرے گا وہ غنی اور بے نیاز رہے گا اور جو کوئی دوسرے کے مال و متاع کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھے گا وہ تنگدست اور بھوکا مرے گا۔

۲۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی نہیں ہوتا وہ دراصل اللہ تعالیٰ کو قضاء وقدر میں بے انصاف ٹھہراتا ہے۔ (نعوذ باللہ)

۳۔ جو شخص اپنی غلطی کو رائی برابر سمجھتا ہے وہ دوسرے کی رائی برابر غلطی کو پہاڑ برابر سمجھتا ہے۔

۴۔ جو شخص دوسروں کو بے عزت کرنے کے لیے ان کے پردے چاک کرتا ہے، خود اس کے گھر کے پردے بھی چاک ہو جاتے ہیں۔

۵۔ جو شخص بغاوت کی تلوار سونت لیتا ہے وہ اسی تلوار سے قتل ہوتا ہے۔

۶۔ جو شخص اپنے بھائی کے آگے کنواں کھودتا ہے وہ خود ہی اس میں گرتا ہے۔

۷۔ جو شخص بیوقوفوں کی محفل میں بیٹھے گا وہ ذلیل وخوار ہو کر اٹھے گا۔

۸۔ جو شخص علماء کی مجلس میں بیٹھے گا وہ معزز بن کر اٹھے گا۔

۹۔ جو شخص تہمت والی جگہوں میں داخل ہوگا وہ متہم ہو کر نکلے گا

۱۰۔ میرے بیٹے! اپنے متعلق حق اور سچ بات کہہ اور چغلی سے بچ کیونکہ اس سے لوگوں کے دلوں میں کینہ پرورش پاتا ہے اور سخاوت کا پھل چکھنا ہو تو سخی گھرانے کا رخ کر (بخیل اور کمینے مالدار کے پاس نہ جا)

......☆......

[1] اس قصے کو مجلہ الاکابر ۲۰۰۲ء گوجرانوالہ نے بھی شائع کیا ہے۔ (اس کی اصل تاریخ بغداد میں ہے)

علم کے حقیقی فوائد

حضرت حاتم اصم خراسانی رحمہ اللہ اپنے دور کے ظاہری علوم یعنی تفسیر و حدیث قراءت و تجوید، جدل و مناظرہ، ہیئت و فلسفہ میں دسترس حاصل کرنے کے بعد کسی دارالعلوم میں مسند تدریس پر فائز ہونے کی بجائے علم کی خوشبو سونگھنے اور اس کی لذت سے لطف اندوز ہونے کے لیے حضرت شقیق بلخی کی صحبت میں چلے گئے۔ وہاں تیس سال تک صدق و صفا، تسلیم و رضاء، زہد و ورع، ایثار و قربانی، تواضع و انکساری، ہمدردی و غمگساری، مہر و وفاء، صبر و حلم، عفو و کرم، طیب الکلام و افشاء السلام کا درس لیتے رہے۔ ایک دن ان کے شیخ محترم نے ان سے پوچھا: اے حاتم! تمہیں میرے حلقہ درس میں شامل ہوئے تیس برس گزر گئے ہیں بتاؤ! اس عرصے میں تم نے علم سے کیا کیا فوائد حاصل کیے ہیں۔ انہوں نے کیا خوب جواب دیا:

حضرت! میں نے علم سے آٹھ فوائد حاصل کیے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے لیے کافی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کی وجہ سے مجھے نجات مل جائے گی۔

پہلا فائدہ

میں نے مخلوق کی حالت پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ہر انسان کا کوئی نہ کوئی محبوب اور معشوق ہے، جس سے وہ محبت اور عشق کرتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی محبوب تو مرض الموت تک اس کی محبت کا دم بھرتا ہے اور کوئی قبر کے کنارے تک ساتھ رہتا

ہے۔ پھر اسے قبر کی تاریک کوٹھری میں بند کر کے واپس آ جاتا ہے۔ لیکن گھڑی بھر اس کے ساتھ نہیں لیٹتا، لہٰذا میں نے سوچا کہ میں اس کو اپنا محبوب بناؤں جو قبر میں میرے ساتھ داخل ہو اور وہاں میری وحشت اور تنہائی کو دور کرے۔ میرا غمگسار اور ساتھی بنے۔ چنانچہ میں نے اعمال صالحہ کو اپنا محبوب بنا لیا کیونکہ ان کے علاوہ کوئی بھی قبر میں داخل ہوتا اور نہ اندر کسی طرح کی روشنی کا ہی اہتمام کرتا ہے۔

دوسرا فائدہ

میں نے مخلوق کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی چاہتوں کو پورا کرنے کے لیے ہر طرح کے جائز اور ناجائز ذرائع استعمال کرتی ہے۔ تو میں نے اللہ کے اس فرمان پر غور کیا:

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ ﴾ (النازعات: ۴۰، ۴۱)

''اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اس نے اپنے نفس کو خواہشات سے روکے رکھا تو بلا شک وشبہ جنت اس کا ٹھکانا ہوگا۔''

تو میں نے یقین کر لیا کہ قرآن کریم سچا اور برحق ہے۔ اس لیے میں نے اپنے نفس پر کنٹرول کر لیا اور اسے خواہشات کی تکمیل سے روک دیا۔ اسے صبر کا عادی بنا لیا چنانچے وہ اللہ کی فرمانبرداری واطاعت پر راضی ہو گیا ہے۔

تیسرا فائدہ

میں نے لوگوں کو دیکھا ہے، وہ روپے، پیسے اور درہم و دینار جمع کرنے اور انھیں سنبھال سنبھال کر رکھنے میں مصروف ہیں مبادا وہ ہاتھ سے نکل جائیں۔ تو میں

نے اللہ مالک الملک کے اس فرمان پر غور کیا:

﴿ مَا عِنۡدَکُمۡ یَنۡفَدُ وَ مَا عِنۡدَ اللّٰہِ بَاقٍ ؕ ﴾ (النحل:۹۶)

''جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا۔''

لہٰذا میں نے اپنی محنت سے حاصل ہونے والے منافع کو اللہ کی خوشنودی کے لیے مساکین پر خرچ کرنا شروع کر دیا، تاکہ وہ اللہ کے پاس میرا ذخیرہ آخرت بنے۔

چوتھا فائدہ

میں نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ عوام کالانعام کو اپنے گرد اکٹھا کرنے اور ان سے اپنے ڈیرے آباد کرنے میں عزت و وقار خیال کرتے ہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رعب و داب اور جاہ وجلال، مال و دولت، بیٹوں اور پوتوں کی کثرت سے حاصل ہوتا ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ٹھاٹھ باٹھ اور طمطراق لوگوں کو خاک و خون میں تڑپانے اور ان کی دولت ہتھیانے سے حاصل ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ شان وشوکت کا راز اپنی دولت کو فضول خرچیوں میں اڑانے میں پنہاں ہے تو میں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر غور کیا[

﴿ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ ﴾ [الحجرات:۱۳]

''کہ تم میں سے اللہ کے ہاں عزت دار وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا کا خوف رکھنے والا ہے۔''

فرمان سچا اور برحق ہے اس لیے میں نے خوف الٰہی اور تقویٰ کو پسند کر لیا ہے۔

پانچواں فائدہ

میں نے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کی مذمت اور

غیبت کرتے ہیں۔ جب میں نے ان کی اس روش پر غور کیا تو پتہ چلا کہ ان میں جو شخص کسی دوسرے شخص کے پاس علم و فضل، جاہ و منصب اور مال و دولت کی فراوانی دیکھتا ہے تو اس سے حسد شروع کر دیتا ہے۔ تب میں نے اللہ کے اس فرمان پر غور کیا:

﴿ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا ط﴾ (الزخرف:۳۲)

''......ہم ہی نے دنیا کی زندگانی میں ان کے لیے وسائل معاش تقسیم کیے ہیں۔ اور ہم نے ان کے ایک دوسرے پر درجے بلند کیے تا کہ وہ ایک دوسرے سے خدمت لے سکیں۔''

لہٰذا میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی نے یہ تقسیم کر رکھی ہے اور میں اپنی قسمت پر راضی ہو گیا ہوں اور میں نے لوگوں کے ساتھ حسد کرنا چھوڑ دیا ہے۔

چھٹا فائدہ

میں نے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے مقاصد پورے نہ ہونے کی بنا پر ایک دوسرے سے عداوت رکھتے ہیں تو میں نے اس آیت پر غور کرنا شروع کر دیا:

﴿ إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا﴾ (فاطر:٦)

''کہ لوگو شیطان تمھارا دشمن ہے لہٰذا تم اسے اپنا دشمن سمجھو۔''

میں نے شیطان سے دشمنی کر لی ہے اور اس کے علاوہ دوسروں سے دشمنی ختم کر لی ہے۔

ساتواں فائدہ

میں نے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ روٹی کے حصول کی حرص میں لنگوٹ کس کر بھاگ رہے ہیں اور حلال وحرام کی پروا بھی نہیں کرتے۔اس کی حرص میں اپنی قدرو منزلت اور عزت وآبرو بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر غور کیا:

﴿ وَ مَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾ (ھود:٦)

”کہ زمین پر چلنے پھرنے والی ساری مخلوق کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔“

لہٰذا میں نے یقین کر لیا کہ میرا رزق اللہ کے ذمے ہے اس لیے میں رزق کی فکر چھوڑ کر اس کی عبادت میں مصروف رہتا ہوں اور کسی مخلوق سے طمع نہیں رکھتا۔

آٹھواں فائدہ

میں نے دیکھا ہر انسان یا تو درہم و دینار اور مال و دولت پر بھروسہ کرتا ہے یا بادشاہ اور امیر سے توقع رکھتا ہے۔کوئی صنعت وحرفت پر بھروسہ کرتا ہے اور کوئی اپنے جیسی محتاج مخلوق سے امید وابستہ کر لیتا ہے۔میں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر غور کیا:

﴿ وَ مَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴾ (الطلاق:٣)

”جو شخص اللہ (تبارک وتعالیٰ) پر بھروسہ کرے تو وہ اسے کافی ہے یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے حکم تک پہنچنے والا ہے اس نے ہر چیز کے لیے اندازہ کر رکھا ہے۔“

لہٰذا میں نے اپنے اللہ پر توکل کر لیا ہے اور مجھے اس کے علاوہ کسی پر بھروسہ

نہیں۔ وہ میرا سب سے بہتر کارساز ہے۔

یہ سن کر حضرت شقیق بلخی فرمانے لگے: اے حاتم! اللہ تجھے صراط مستقیم پر گامزن رکھے۔ میں نے تورات، انجیل، زبور اور فرقان حمید کی تعلیمات پر غور کیا تو مجھے یہی چیز نظر آئی۔ جس نے ان باتوں پر عمل کیا اس نے چاروں کتابوں پر عمل کرلیا۔

سبحان اللہ! کیسا مزا ہے ان باتوں کا جو قرآن سے استنباط کی گئی ہیں۔ ان باتوں پر عمل کرنے والے کی زندگی کیونکر قابل رشک نہ ہوگی اور لوگوں کو ان کے ذکر خیر سے لذت کیوں نہ حاصل ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ صدیاں بیت جانے کے باوجود لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں اور ان کے اعمال کے تذکروں سے ان کی زبانیں تر رہتی ہیں۔ آپ کے کریمانہ طور طریق کا اندازہ اس واقعہ سے لگایئے کہ آپ حقیقت میں بہرے نہ تھے، لیکن ہوا اس طرح کہ ایک خاتون ان سے کوئی مسئلہ دریافت کرنے آئی اور ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی۔ وہ ابھی بولنے نہ پائی تھی کہ دفعتاً اس کے پیٹ سے بآواز بلند گوز خارج ہوگیا جس کی بنا پر سے وہ شرم میں ڈوب گئی اور بات نہ کرسکی۔

آپ نے گوز خارج ہونے کی آواز تو سن لی لیکن اس خاتون کو محسوس اس طرح کرایا گویا اس کے گوز کی آواز آپ کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ چنانچہ آپ نے اسے یہ کہہ کر ذرا سا آگے بڑھنے کا حکم دیا کہ بی بی میں بہرا ہوں اور دھیمی آواز سن نہیں سکتا، اس لیے ذرا اونچی آواز سے بات کرنا۔

خاتون یہ سمجھ کر کہ شاید اس نے ریح شکم کی آواز نہ سنی ہو، ذرا سا آگے بڑھی اور ابھی بات شروع کرنے والی تھی کہ شرم غالب آ گئی اور وہ ہلکا سا کھانس کر چپ ہوگئی۔ اور بول نہ سکی۔ آپ نے یہ دیکھ کر دوبارہ بلند آواز سے کہا:

بی بی ذرا سا اور آگے بڑھو اور ذرا بلند آواز سے بات کرو تا کہ مجھے پتہ چل

سکے کہ تم کیا پوچھنا چاہتی ہو۔

خاتون کے دل میں یہ بات آئی کہ اس شیخ کو واقعی میرے گوز کی آواز سنائی نہ دی ہوگی، اس لیے بلا جھجک مسئلہ پوچھ لینا چاہیے لہٰذا اس نے دل مضبوط کیا اور ذرا سا آگے بڑھی۔ مگر مسئلہ پوچھتے وقت پھر شرما گئی اور دو چار لفظ بول کر خاموش ہوگئی۔

آپ نے بلند آواز سے پھر ارشاد فرمایا: بی بی ذرا میرے کان کے قریب ہو کر بلند آواز سے بولو تا کہ میں سن کر تمھارے سوال کا جواب دے سکوں۔

اب تو خاتون کے دل میں یقین پیدا ہو گیا کہ واقعی اس شیخ نے میرے گوز (ریح شکم) کی آواز نہیں سنی۔ اس نے بلا جھجک بلند آواز سے مسئلہ پیش کیا اور آپ نے مکمل تسلی سے اس کا جواب دیا۔ وہ مطمئن ہو کر وہاں سے چلی گئی اور جب تک وہ زندہ رہی انہوں نے اپنے آپ کو بہرا بنائے رکھا مبادا وہ اصل صورتحال کے انکشاف پر دوبارہ شرمندہ نہ ہو جائے۔ جب وہ خاتون اس دنیا سے چلی گئی تو آپ نے ساتھیوں کے اصرار پر اصل صورتحال بتادی اور فرمایا: میں الحمدللہ صحیح سنتا ہوں۔ لیکن محض اس بی بی کی وجہ سے حقیقت حال سے پردہ نہ اٹھاتا تھا۔

......☆......

لاثانی طرزِ تفتیش

ہمارے اسلاف کرام یعنی صحابہ وتابعین عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنے بے مثال ایمان وعمل، خلوص وتوکل، امانت ودیانت، صداقت وشرافت، فہم وفراست کی بدولت جس منصب پر فائز ہوتے اس کی ذمہ داریاں اس قدر خوبی سے سرانجام دیتے کہ دنیا عش عش کر اُٹھتی، مثلاً دنیا میں بہت سے لوگ منصبِ قضا پر فائز ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے، لیکن ان میں سے کوئی بھی انسان امیر المؤمنین سیدنا علی المرتضیٰؓ جیسا قاضی ومنصف نہ بن سکا۔ آپ ہمارے دور کے تفتیشیوں کی طرح ملزموں کی چمڑیاں ادھیڑ کران سے اقرار نہ کرواتے تھے اور نہ ہی اپنے سامنے پیش ہونے والے مقدمات میں مدّعی کے دعویٰ اور اس کے گواہوں کی گواہی اور مدّعیٰ علیہ کی قسم پر انحصار کرتے تھے بلکہ آپ حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے دقیق فہم وفراست سے کام لیتے اور بے مثال طرزِ تفتیش سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتے تھے اگر ہمارے دور کے تفتیشی افسران اپنے آپ کو جہنم کے پُل پر کھڑا تصور کر کے ان کے طرزِ تفتیش کی پیروی کرنا شروع کر دیں تو بہت سے بے گناہ انسان، مذہبی متعصب اور کرپٹ منصفین کے ظالمانہ فیصلوں کی بھینٹ چڑھنے سے بچ جائیں گے۔ امیر المؤمنین سیدنا علی المرتضیٰؓ نہ صرف یہ کہ مقدمات کی تفتیش کرنے کے ماہر تھے بلکہ آپ حق کے ساتھ فیصلہ کرنے میں بھی بے نظیر شخصیت تھے۔ مندرجہ ذیل واقعات آپ کے لاثانی طرزِ تفتیش اور بے مثال عدل وانصاف پر شاہد عدل ہیں۔

عراق کا ایک بزرگ جس نے رزق حلال کمانے کے لئے تجارت جیسا مبارک پیشہ اپنایا ہوا تھا وہ اردگرد کے دیہاتوں سے مختلف اجناس خرید کر گودام بھر لیتا اور پھر ہر علاقے کی ضرورت کے مطابق اس کی منڈیوں میں اجناس سپلائی کرتا اور جائز منافع حاصل کر کے اپنے بیوی بچوں کی کفالت کرتا چنانچہ ایک سال اس نے حسبِ عادت مختلف اجناس خریدیں اور کرائے کے اونٹوں پر لدوا کر اپنے ہم وطن تاجروں کے ہمراہ تجارتی سفر پر روانہ ہوگیا اور لق ودق صحرا اور سنسان جنگلات عبور کرتا ہوا دیگر شہروں کی منڈیوں میں جا پہنچا اور وہاں اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اپنا مال فروخت کیا اس کی تجارت میں اللہ نے برکت کی اور اسے بہت سے منافع حاصل ہوا جب اس کے ساتھیوں نے اس کا وافر منافع دیکھا تو ان کی نیت بدل گئی اور انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے اسے ٹھکانے لگا دیا اور اس کے رأس المال (اصل رقم) اور منافع کی رقم آپس میں بانٹ لی اور واپس آ گئے اور اپنے اپنے گھروں میں آرام سے رہنے لگے۔

مرحوم تاجر کے نوجوان بیٹے نے جب انہیں دیکھا تو ان سے اپنے باپ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے اسے جواب دیا کہ وہ فلاں شہر میں فوت ہوگیا تھا اور ہم نے اسے نہلا، کفنا کر اور جنازہ پڑھوا کر وہاں کے مقامی قبرستان میں دفن کر دیا تھا۔ جب اس نے اپنے باپ کے رأس المال اور منافع کے متعلق پوچھا تو اُنہوں نے جواب دیا کہ ہمیں اس کے مال کی کچھ خبر نہیں کہ اس نے کون سی منڈی میں فروخت کیا اور اس سے حاصل ہونے والی رقم کہاں رکھی؟ ہمیں تو مقامی لوگوں کے ذریعے اس کی فوتیدگی کی اطلاع ملی تو ہم نے یہ احسان کیا کہ اسے اسلامی دستور کے مطابق اللہ کے سپرد کیا اور واپس آ گئے۔

نوجوان کو ان کی بات پر یقین نہ آیا چنانچہ اس نے قاضی کوفہ شریح بن حارث کندی

کی عدالت میں استغاثہ دائر کر دیا کہ ہمارے باپ کی گمشدگی کا کھوج لگانے کے لئے ان تاجروں کی تفتیش کی جائے اور ہمیں اصل صورت حال سے آگاہ کیا جائے۔

قاضی شریح بن حارث کندی نے متوفی کے نوجوان بیٹے کی درخواست پر انہیں طلب کیا تو وہ عدالت میں پیش ہو گئے اور اپنی صفائی میں قسمیں کھا کر بَری ہو گئے۔ نوجوان کو ان کی قسموں پر خاموش ہونا پڑا لیکن اس کا دل مطمئن نہ ہوا اور اس نے امیر المؤمنین سیدنا علی المرتضیٰؓ کی عدالت عالیہ میں اپیل دائر کر دی تو آپؓ نے انہیں بذریعہ پولیس طلب کر لیا اور ہر ملزم پر دو دو پولیس مین متعین کر دیئے اور انہیں حکم دیا کہ انہیں الگ الگ کمروں میں بند کر دیا جائے اور ان کو آپس میں بات نہ کرنے دی جائے۔ اس کے بعد آپ نے اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں ان ملزموں کو ایک ایک کر کے بلایا اور ان سے پوچھا:

۱ اس نوجوان کا باپ تمہارے ساتھ کس دن نکلا تھا؟

۲ اور تم راستے میں کہاں ٹھہرے تھے؟

۳ تمہارا سفر کیسا رہا؟

۴ وہ کون سی بیماری سے فوت ہوا؟

۵ اس کا مال کہاں فروخت ہوا اور اس کا کیا بنا؟

۶ اسے غسل کس نے دیا؟

۷ اس کی نماز جنازہ کس نے پڑھائی اور اس میں کون کون شریک ہوئے؟

۸ اسے قبر میں کن لوگوں نے اتارا؟

۹ اور اس کی قبر کون سے قبرستان میں ہے؟

پہلے ملزم نے ان سوالات کے جو جو جوابات دیئے وہ آپ نے اپنے کاتب کو حرف بحرف لکھوا دیئے۔ اس کے بعد آپ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر آواز

بلند اللہ اکبر کا نعرہ لگایا تو جدا جدا کمروں میں بند ہر ایک ملزم نے نعرے کی آواز سن کر اندازہ لگایا کہ ان کے ساتھی نے اصل بات کا اقرار کرلیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس ملزم کو اس کے کمرے میں بند کروا دیا۔ پھر دوسرے کو بلوایا اور اس سے مذکورہ بالا سوالات کئے اور اس نے جو جوابات دیئے وہ آپؓ نے اپنے کاتب سے حرف بحرف لکھوا دیئے۔ اس کے بعد آپ اسے واپس بھجوا کر اسی کمرے میں بند کروا دیا۔ پھر تیسرے کو بلوا لیا اور اس سے مذکورہ بالا سوالات کئے اور اس کے جوابات بھی حرف بحرف لکھوا لئے۔ اس کے بعد آپؓ نے اسے بھی اس کے کمرے میں واپس بھجوا دیا اور اس طرح یکے بعد دیگرے ہر ملزم کو بلوایا اور اس سے مذکورہ بالا سوالات کئے اور ہر ایک کے جوابات اپنے کاتب سے حرف بحرف لکھوا لئے۔

اس کے بعد آپ نے ان کے جوابات کا ایک دوسرے کے جواب سے موازنہ کیا تو پتہ چل گیا کہ ہر بعد والے ملزم نے پہلے ملزم سے مختلف جواب دیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے پہلے ملزم کو بلایا اور اسے دھمکی دی اور کہا:

اے اللہ کے دشمن! مجھے تیرے ساتھیوں کی تفتیش سے تیرے جھوٹ اور دھوکے کا پتہ چل گیا ہے اور تجھے سچائی کے سوا کوئی چیز سزا سے بچا نہیں سکتی۔ یہ کہہ کر آپؓ نے اور آپ کے ساتھیوں نے بلند آواز سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور اسے واپس اسی کے کمرے میں بند کروا دیا۔ جب اس کے ساتھی ملزموں نے یہ نعرہ سنا تو انہیں اس بات میں شک نہ رہا کہ ان کے ساتھی نے اصل سازش بے نقاب کر دی ہے۔ اس کے بعد آپؓ نے ایک اور ملزم کو اپنے سامنے بلوایا اور اسے سنگین سزا کی دھمکی دی تو اس نے صحیح بات کا اقرار کرتے ہوئے کہا:

''اے امیر المؤمنین میں تو اپنے ساتھیوں کی اس گھناؤنی سازش میں مجبوراً شریک ہوا تھا۔''

اس ملزم کے بیان کے بعد جب دیگر ملزموں کو باری باری بلایا گیا اور انہیں سزا کی دھمکی دی گئی تو سب نے صحیح صورت حال کا اقرار کر لیا تو آپ نے قید خانے میں بند پہلے ملزم کو تیسری بار اپنے سامنے بلوایا اور اس سے کہا کہ تیرے سب ساتھیوں نے اصل واقعے کا اقرار کر لیا ہے، لہٰذا تو بھی سچ بول دے ورنہ تیرا حشر بُرا ہوگا۔

چنانچہ اس نے بھی اپنے ساتھیوں کی طرح اپنے جرم کا اقرار کر لیا تو آپ نے ان سے مقتول تاجر کا مال وصول کر کے وارثوں کو دے دیا اور ان کے مقتول کا قصاص لیا۔

امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں ایک انصاری لڑکے نے ان کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا کہ میرا باپ جہاد میں شہید ہو گیا تھا اور میری ماں مجھے اپنا بیٹا تسلیم نہیں کر رہی۔ آپؓ نے اس کی ماں کو عدالت میں طلب کر لیا اور اس سے لڑکے کے دعویٰ کے متعلق پوچھا تو اس نے لڑکے کے دعویٰ کو جھٹلا دیا اور کہا میری تو شادی ہی نہیں ہوئی، اس لئے میرے ہاں بیٹا کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ جب آپؓ نے اس لڑکے سے اس کے دعویٰ کا ثبوت طلب کیا تو وہ ثبوت پیش نہ کر سکا۔ تب آپ نے اس کی ماں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی صفائی پیش کرے تو وہ چند آدمیوں کو لے آئی جنہوں نے گواہی دی کہ اس عورت نے شادی ہی نہیں کی ہے اور لڑکے نے اس پر جھوٹا دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ آپ نے مقدمہ خارج کر دیا اور لڑکے پر قذف کی سزا نافذ کرنے کا حکم دے دیا۔ اسی دوران سیدنا علی المرتضیٰؓ کا اِدھر سے گزر ہوا تو آپ نے ان کے قضیے کی روئیداد سن کر انہیں اپنے پاس مسجد نبویؐ میں بٹھا لیا اور عورت سے اس کے لڑکے کے دعویٰ کے متعلق پوچھا تو اس نے آپ کے سامنے بھی اپنی شادی کی نفی کر دی اور لڑکے کو اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ آپؓ نے حق بات تک رسائی حاصل کرنے کی غرض سے نفسیاتی حربہ استعمال کیا اور اس

لڑکے سے کہا کہ تو بھی اسے اپنی ماں تسلیم کرنے سے انکار کردے۔ اس نے کہا:

اے رسول کریم ﷺ کے چچازاد میں کیسے انکار کردوں، یہ تو میری ماں ہے۔

آپؓ نے فرمایا: ایک مرتبہ میری بات مان اور تو بھی اس کو اپنی ماں کہنے سے باز آجا اور یہ سمجھ لے کہ گویا میں تیرا باپ ہوں اور حسنؓ، حسینؓ تیرے بھائی ہیں۔ چنانچہ اس نے آپؓ کی بات مان لی اور اس عورت کو اپنی ماں کہنے سے انکار کردیا۔ اس کے بعد آپؓ نے عورت کے سرپرستوں سے کہا کہ اس کے بارے میں میرا فیصلہ آپ کو قبول ہوگا؟ انہوں نے کہا: ہاں، ہمیں قبول ہوگا۔ آپؓ نے فرمایا: میں تمام حاضرین کو گواہ بنا کر اعلان کرتا ہوں کہ میں نے اس لڑکے کا اس اجنبی عورت سے نکاح کردیا ہے۔ اے قنبر، ہمارے گھر جا اور فلاں جگہ پر ایک تھیلی پڑی ہے، وہ لے آ۔ وہ گیا اور تھیلی لا کر آپؓ کی خدمت میں پیش کردی۔ آپ نے اس سے ۴۸۰ درہم نکال کر عورت کو بطور حق مہر ادا کردیئے اور لڑکے سے کہا کہ اسے لے جا اور ہمارے پاس اس حال میں آنا کہ تیرے اوپر شب زفاف کا نشان ہو۔ جب آپ یہ فیصلہ کرکے واپس مڑے تو عورت کہنے لگی:

اے ابوالحسن: اللہ کی قسم! میں اس آگ کے قریب نہ جاؤں گی، بخدا یہ لڑکا میرا بیٹا ہے۔

آپ نے فرمایا: وہ کیسے؟

اس نے کہا: اصل بات یہ ہے اس کا باپ ایک لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور میرے بھائیوں نے اس سے میرا نکاح کردیا تھا جبکہ میں یہ چاہتی تھی کہ میرا نکاح کسی آزاد خاتون کے بیٹے سے ہو، تاہم میں اپنے بھائیوں کے سامنے دم نہ مارسکی اور خاموش ہوگئی۔ پھر میں اس سے حاملہ ہوگئی اور اس بچے کو جنم دیا۔ بعد ازاں اس کا باپ ایک غزوے میں شہید ہوگیا اور میں نے اس لڑکے کو اس کے باپ کے قبیلے

میں بھیج دیا اور یہ وہیں پلا بڑھا۔اور میں نے اسے اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔

آپ نے ازراہ تفنن فرمایا: میں ابوالحسن ہوں۔(یعنی دودھ کادودھ اور پانی کا پانی کرسکتا ہوں)

چنانچہ آپ نے اس کا نسب اس کی ماں سے ثابت کیا اوراسے اس کی ماں سے ملادیا۔

ایک مرتبہ یمن میں چند شکاریوں نے جنگلی شیر کو شکار کرنے کے لئے زمین میں کنواں کھود دیا اور بڑی تدبیر کے ساتھ شیر کواس میں گرالیا اورانہوں نے لوگوں کو اس طرف آنے اوراسے دیکھنے سے منع کردیا،لیکن لوگ باز نہ آئے اوراسے دیکھنے کے لئے کنویں کی منڈیر پر جمع ہوگئے اور اندر جھانکنے لگے۔اسی دوران دھکم پیل شروع ہوگئی اورایک شخص کنویں میں لڑھک پڑا۔اس نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے دوسرے شخص کی ٹانگ پکڑلی۔خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ بھی کنویں میں لڑھکنے لگا تواس نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے تیسرے شخص کی پنڈلی پکڑلی تو وہ بھی کنویں میں لڑھک پڑا۔اس نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے چوتھے شخص کی ٹانگ پکڑلی تو وہ بھی کنویں میں لڑھک پڑااوراس بیچارے نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے لیکن اس کے ہاتھ میں کسی کا ہاتھ پاؤں نہ آیااور وہ بھی کنویں میں لڑھک پڑا۔نیتجتًا وہ چاروں کنویں میں جا پڑے اور بھوکے شیر نے چاروں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔اس صورت حال کو دیکھ کر مرنے والوں کے ورثاء اور قبائل کے درمیان جھگڑا کھڑا ہوگیا۔ان میں سے ہرکوئی ایک دوسرے کوالزام دیتا تھا کہ ہمارا آدمی تمہارے آدمی کی وجہ سے مارا گیا اورقریب تھا کہ ان کے درمیان لڑائی چھڑ جاتی اورانسانوں کی لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے۔خوش قسمتی سے کسی انسان نے سیدنا

علی المرتضیٰؓ کو اس فتنے کی خبر دی۔ آپ ان دنوں یمن کے قاضی تھے، آپ نے موقعہ پر جا کر ان کی بات سنی اور ان کے درمیان ایسا شاندار فیصلہ کیا کہ تمام لوگ عش عش کر اٹھے اور انہوں نے اسے بسر و چشم قبول کر لیا۔ آپؓ نے فرمایا: دیکھو تمہاری آپس میں تو کوئی دشمنی نہ تھی، جس کی بنا پر شبہ کیا جا سکے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایک دوسرے کو کنویں میں گرایا ہو۔ البتہ اسے اتفاقی حادثہ قرار دیا جا سکتا ہے اور ان کی دیت مقرر کی جا سکتی ہے اور چاروں آدمیوں کے ورثاء کو اپنے اپنے حصے کی دیت پر اکتفاء کر لینا چاہئے جب انہوں نے رضا مندی کا اظہار کر دیا تو آپ نے فرمایا: سنو! پہلے آدمی کی دیت سو اونٹ تھی لیکن اس کی وجہ سے تین آدمی اور مر گئے لہٰذا اس کی دیت سے ۷۵۔ اونٹ ساقط ہو گئے اور اس کے وارثوں کو ۲۵۔ اونٹ ملیں گے۔

دوسرے آدمی کی وجہ سے دو آدمی مر گئے لہٰذا اس کی دیت، جو کہ سو اونٹ تھی، سے ۵۰/ اونٹ ساقط ہو گئے اور اس کے وارثوں کو ۵۰/ اونٹ ملیں گے۔

تیسرے آدمی کی وجہ سے ایک اور آدمی مر گیا لہٰذا اس کی دیت جو کہ سو اونٹ تھی اس سے ۲۵۔ اونٹ ساقط ہو گئے اور اس کے وارثوں کو ۷۵۔ اونٹ ملیں گے۔

چوتھے آدمی کی وجہ سے اور کوئی آدمی نہیں مرا۔ لہٰذا اس کی دیت پوری کی پوری ہی اس کے وارثوں کو ملے گی اور وہ پورے سو اونٹ کے حق دار ہوں گے۔ اس طرح چاروں مرنے والوں کی دیت ۲۵۰۔ اونٹ ہوئی اور وہ ان تمام لوگوں کے وارثوں سے وصول کی جائے گی جو اس دھکم پیل میں شامل تھے۔ البتہ یہ فیصلہ نافذ اس وقت ہو گا جب حضرت رسول کریم ﷺ اس پر مہر تصدیق ثبت فرمائیں گے لہٰذا تمام لوگ پر سکون ہو کر اپنے اپنے گھروں میں چلے جائیں۔ جب آپ کا یہ فیصلہ حضرت رسول مقبول ﷺ کے پاس پہنچا تو آپ نہایت خوش ہوئے اور اسے نافذ کر دیا۔

☆

امیر مدینہ کا عدل وانصاف

امرائے اسلام عدل وانصاف، بذل وعطا، جود وسخا اور سیاست وامارت میں اپنی مثال آپ تھے۔ لیکن ستیاناس ہو سیاسی حزبیّت اور مذہبی عصبیّت کا، اس نے ان کی معمولی لغزشوں اور سیاسی غلطیوں کو اس قدر اچھالا کہ جن ہستیوں کی سیاسی بصیرت، انتظامی اہلیت، عوامی ہمدردی اور عدل وانصاف پر دیگر اقوام داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں، وہ مسلمانوں کی نگاہوں میں ظالم، غاصب اور عفتوں کے پیاسے ٹھہرائے گئے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابوبکر الصدیق جیسا فہیم وزیرک، حضرت عمر بن خطاب جیسا عادل اور حضرت عثمان جیسا فیاض اور حلیم اور حضرت علی جیسا زاہد وقانع اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم جمیعاً جیسا حلیم ومدبر انسان دیگر اقوام میں ڈھونڈھے سے بھی نہ مل سکے گا۔ لیکن تاریخ کے بدعمل اور کذاب راویوں نے قبائلی عصبیت، مذہبی تعصب اور وقت کے حکمرانوں سے مطامعِ دنیا کے حصول کی خاطر ان کا کردار اس انداز میں پیش کیا کہ ایسے لوگ بھی ان پاک باز ہستیوں پر تنقید کرنے لگے جن کی اپنی حیثیت اللہ کے نزدیک مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اموی حکمران بزرگی کے اعتبار سے ہاشمی حکمرانوں کے ہم پلہ نہ تھے اور نہ ہی انہوں نے بزرگی کے معاملے میں ہاشمیوں سے منافست کی بلکہ اپنے عم زاد ہاشمیوں کا اکرام کیا اور ان کے ساتھ رشتہ داریاں قائم کیں۔ حضرت رسول مقبول ﷺ پر ایمان لانے والوں کی صف میں جہاں حضرت علی المرتضیٰ موجود تھے

وہاں خالد بن سعید بن العاص اموی بھی تھے۔ ہجرت حبشہ میں ہاشمی بھی تھے اور ان کے عم زاد اموی بھی۔ بلکہ حضرت رسول مقبول ﷺ نے اپنی سگی تین بیٹیاں اپنے عم زاد امویوں میں بیاہیں۔ ان کی خاندانی اور سیاسی صلاحیتوں سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے انھیں مختلف صوبوں کا گورنر بنایا اور وہ آپ کی توقعات پر پورے اترے۔
حضرت رسول مقبول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((خِيَارُ كُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُ كُمْ فِي الْإِسْلَامِ اِذَا فَقِهُوْا......))

"تم میں جو شخص جاہلیت میں برگزیدہ تھا وہ دین اسلام کی روح اور حقیقت سمجھ لینے کے بعد اسلام میں بھی معزز اور برگزیدہ ہے۔"

تو جس طرح رسول اللہ ﷺ کا خاندان دور جاہلیت میں بھی بذل و عطاء، شجاعت وشرافت اور فہم وفراست میں بے نظیر تھا اسی طرح آپکا چچیرا اموی خاندان بھی سیادت، قیادت، فہم وفراست، ہمدردی اور ہر دلعزیزی، جود وسخا میں ان سے پیچھے نہ تھا۔ حدود اللہ کے نفاذ میں وہ اپنے اور پرائے کا کبھی لحاظ نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دور میں اسلامی حکومت مشرق میں سندھ اور مغرب میں ہسپانیہ تک پہنچ گئی۔ انہوں نے اس قدر بے مثال فتوحات حاصل کیں کہ ان سے بعد میں آنے والے انھیں سنبھال بھی نہ سکے۔ جب مشرق میں امویوں کا ستارہ غروب ہوا تو وہ مغرب میں چلے گئے اور وہاں خداداد صلاحیت اور خاندانی سیاست و وجاہت سے ایسی شاندار حکومت قائم کی کہ تین صدیوں تک مغرب کی کوئی طاقت ان کے سامنے سر نہ اٹھا سکی۔

ذیل میں ہم ان کے عدل و انصاف کا ایک واقعہ درج کرتے ہیں جو اس امر کا بین ثبوت دیتا ہے کہ جب ان کے بدنام حاکم کے عدل وانصاف کا یہ حال تھا

تو ان کے نیک ناموں کا حال کیسا ہو گا؟

کتاب الاغانی کے مؤلف ابو الفرج اصفہانی اپنی کتاب کے صفحہ ۷۶ جلد نمبر ۱۴ میں اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ:

''عبدالرحمٰن بن الحکم نے مدینہ منورہ کے ایک غلام حناط کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ تو وہ اپنی فریاد لیکر ان کے بھائی مروان بن الحکم کے دربار میں گیا۔ ان دنوں مروان بن حکم مدینہ منورہ کا گورنر تھا۔ تھپڑ مارنے والا ان کا سگا بھائی اور قریش کا نامی گرامی شاعر تھا لیکن مروان نے اس رشتے کی ذرہ پرواہ نہ کی اور اسے اپنی عدالت کے کٹہرے میں حَنّاط کے ساتھ کھڑا کیا۔ جانبین کے بیانات سننے کے بعد حناط کو مظلوم سمجھ کر اسے حکم دیا کہ یہاں میرے سامنے ہی عبدالرحمٰن کے منہ پر اسی طرح تھپڑ مار جس طرح اس نے تجھے مارا ہے!

حَنّاط کہنے لگا:

اللہ کی قسم، میرا ارادہ یہ نہیں کہ میں اس سے قصاص لوں بلکہ میں تو اس لیے پیش ہوا ہوں کہ اسے پتہ چل جائے: اس کے اوپر بھی ایسی طاقت ہے جو مجھے اس سے بدلہ دلوا سکتی ہے۔ اس لیے میں اپنا حق قصاص آپ کو ہبہ کرتا ہوں۔

مروان: میں یہ ہبہ قبول نہیں کرتا۔ آگے بڑھ اور اپنا حق لے لے!

حَنّاط: اللہ کی قسم! میں اسے تھپڑ نہیں ماروں گا۔ البتہ میں اپنا قصاص تمہیں ہبہ کرتا ہوں۔

مروان: اگر تو سمجھتا ہے کہ تھپڑ مارنے سے میں ناراض ہو جاؤں گا تو اللہ کی قسم میں کبھی ناراض نہ ہوں گا، لہٰذا تو اپنا حق قصاص وصول کر لے

حَنّاط: نہیں میں اپنا حق تمہیں ہبہ کرتا ہوں اور اللہ کی قسم میں اسے تھپڑ نہ ماروں گا۔

مروان: اللہ کی قسم! میں تیرا یہ ہبہ قبول نہیں کروں گا اگر تو نے ہبہ کرنا ہے تو اسے کر جس نے تجھے تھپڑ مارا۔ یا پھر اسے اللہ کی خاطر معاف کر دے

حَنّاط: میں نے اسے اللہ کی خاطر معاف کر دیا۔

حَنّاط کے انہی الفاظ پر عدالت برخاست ہوگئی اور وہ امیر مدینہ کا شکریہ ادا کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ جبکہ عبدالرحمٰن بن الحکم، حنّاط کی طرف سے معافی کا پروانہ لیکر اپنے سگے بھائی مروان سے بگڑ گیا اور درج ذیل اشعار کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے لگا:

كُلُّ ابْنُ اُمِّ زائد غير نَاقِصِ وَاَنْتَ ابْنُ اُمِّ نَاقِصَ غَيْرُ زَائِدٖ

وَهَبْتُ نَصِيْبِيْ مِنكَ يا (مَرْوُ) كُلَّهُ لِعَمْرِو وَ عُثمانَ الطَّوِيلِ وَ خَالِدٖ

ترجمہ: ''ہر ماں کا بیٹا (خوبیوں اور غیرت کی وجہ سے) مکمل ہوتا ہے ناقص نہیں۔ جب کہ تو ماں کا ناقص بیٹا ہے مکمل نہیں۔ اے مروان! میں نے تیری پاسداری کے تمام حقوق عمرو، عثمان الطّویل اور خالد کو ہبہ کر دیے ہیں (اور آئندہ مجھ سے احترام کی توقع نہ رکھنا)''

یاد رہے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز اموی اسی مروان بن الحکم کے پوتے اور امیر المومنین عبدالملک بن مروان کے داماد تھے۔

......☆......

اصحابؓ الرسول ﷺ کا حلم و کرم[1]

مٹھی بھر مومنین کی معیت میں مسیلمہ کذاب کی بہادر سپاہ کو تباہ کرنے والے اور جنگ قیساریہ میں یورپی یونین کے نوے ہزار سپاہیوں کو شکست فاش دینے والے امیر معاویہ بن ابی سفیان قریشی اُموی کوئی معمولی درجے کے صحابی رسول ﷺ نہ تھے آپ سردارِ مکہ ابوسفیان کے بیٹے اور حضرت رسول مقبول ﷺ کے برادرِ نسبتی تھے۔

جہادِ شام میں آپ کی عظیم الشان خدمات کے پیش نظر امیر المومنین عمر فاروقؓ نے آپ کو شام کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔

آپ نے وہاں ایسے لاثانی انداز سے حکمرانی کہ امیر المؤمنین نے انھیں کسریٰ العرب کا خطاب دے دیا، آپ جس قدر کفار کے مقابلے میں فولاد تھے اسی قدر مومنوں کے حق میں ریشم کی طرح نرم تھے، آپ کی خلافت کے دور میں سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ کا آپ سے زرعی جاگیر کے معاملے میں تنازعہ چل رہا تھا۔

سیدنا عبداللہ بن زبیرؓ بچپن سے ہی شیر دل اور نڈر قسم کے جوان رعنا تھے، آپ حواری رسول ﷺ کے بیٹے اور خلیفہ رسول ﷺ کے نواسے اور عمۃ الرسول صفیہ بنت عبدالمطلب ہاشمیہ کے پوتے تھے، ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰ آپ کے والد کی پھوپھی اور سیدہ عائشہؓ آپ کی خالہ تھی اور آپ اس ماں (سیدہ اسماء) کے بیٹے تھے جو رات کی تاریکیوں میں تن تنہا پیدل سفر کر کے غار ثور میں حضرت رسول مقبول ﷺ اور سیدنا ابوبکر صدیقؓ کو کھانا پہنچاتی تھیں۔ آپ بنو اسد قبیلے سے

تعلق رکھتے تھے اس لیے اسد بن کر رہے اور اسد بن کر شہادت کی موت قبول کی۔ شہادت سے تھوڑی دیر پہلے

آپ کی زبان پر یہ شعر تھا۔

ولسنا علی الاعقاب تدمیٰ کلومنا ولکن علی اقدامنا تقطر الدماء

(ہم ان بزدلوں میں سے نہیں ہیں جن کی ایڑھیاں ان کے خونوں سے رنگین ہو جاتی ہیں بلکہ ہم تو ان بہادروں میں سے ہیں جنکی چھاتیوں سے خون کے قطرے ان کے قدموں پر گرتے ہیں)

دونوں سرداروں کے غلام اپنے اپنے سرداروں کی زمینوں میں کام کرتے تھے، سیدنا امیر معاویہؓ کے غلاموں کو ناز تھا کہ ہم امیر المومنین کے غلام ہیں اور وہ اس ترنگ میں آ کر متنازعہ زرعی جاگیر میں داخل ہو گئے اور سیدنا عبداللہ بن زبیر کے غلاموں کو مارنے پیٹنے لگے، جب آپ کو اپنے غلاموں پر ظلم وزیادتی کی اطلاع ملی تو آپ شیر کی طرح غضبناک ہو گئے اور قلم دوات منگوا کر امیر المومنین سیدنا معاویہ بن ابی سفیانؓ کو آداب خط و کتابت بالائے طاق رکھ کر چنگھاڑتا ہوا خط لکھا کہ:

"اے معاویہ! تیرے غلام متنازعہ جاگیر میں داخل ہو گئے ہیں اور انھوں نے میرے غلاموں کو پیٹا ہے، اس دفعہ تو میں اس زیادتی کو نظر انداز کرتا ہوں البتہ اگر آئندہ تیرے غلاموں نے متنازعہ جاگیر میں قدم رکھے اور میرے غلاموں کو ہاتھ لگا دیا تو میری اور تیری لڑائی کا تماشا دنیا دیکھے گی۔"

موقعہ پر موجود حضرات یہ اندازِ تحریر دیکھ کر ششدر رہے گئے اور وہ سوچنے لگے کہ اگر یہ خط اسی طرح ہی امیر المومنین کے سامنے پہنچ گیا تو اس کا نتیجہ بُرا نکلے گا، یہ ٹھیک ہے کہ ان کی کھال میں سوائے اللہ رب العالمین کے کسی کا خوف نہیں ہے،

لیکن انھیں چاہیے تھا کہ یہ امیر المومنین سے اس جھگڑے کی عادلانہ اور منصفانہ انکوائری کی درخواست کرتے اور قصور واروں کو سزا دینے کا مطالبہ کرتے، اگر ان کی درخواست پر غور نہ ہوتا تو پھر کسی طرح کا قدم اُٹھاتے لیکن انھوں نے ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ اس کا نتیجہ خطرناک بھی ہوسکتا ہے، لیکن وہ کیا کرتے کیونکہ آپ تو بچپن ہی سے اس قدر جری اور بے باک تھے کہ امیر المومنین عمر فاروقؓ جیسے حکمران کی بھی پروانہ کرتے تھے اس لیے وہ معاملے کو اللہ کے سپرد کر کے خاموش ہو گئے اور نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔

ڈاکیا یہ خط لے کر سواری پر سوار ہو گیا اور بلند و بالا پہاڑوں ریتلے صحراؤں کو عبور کرنے لگا، مہینے بعد وہ دمشق جا نکلا، ان دنوں دمشق مملکت اسلامیہ کا مرکزی دارالحکومت تھا، وہاں کے لوگ امیر المومنین کے پروانے تھے وہ کوفیوں جیسے شوریدہ سر اور انارکسٹ نہ تھے کہ قدم قدم پر حاکم وقت کی مخالفت کرتے ہوں۔ یا بات بات پر اسے ٹوکتے ہوں وہ تو اپنے امیر سے اس قدر خوش تھے کہ پوری زندگی انھوں نے اپنے امیر کی شکایت نہیں کی اور نہ اسے بدلنے کا مطالبہ کیا تھا۔

وہ ڈاکیا انھیں کی موجودگی میں یہ خط امیر المومنین کی خدمت میں پیش کرنے لگا، جب آپ نے اسے کھولا اور پڑھا تو آپ کے چہرے پر ذرہ برابر ملال نہ آیا۔ البتہ آپ نے اپنے بیٹے یزید کی استعداد جانچنے اور اسے اس طرح کی صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کا گر بتانے کے لیے اس سے مشورہ کیا تو اس نے مشورہ دیا کہ اے امیر المومنین! ایک فوجی دستہ روانہ کیجیے جو اس گستاخ کا سر اُتار لائے، اسے امیر المومنین کو اس انداز سے خط لکھنے کی جرأت کیسے ہوئی۔

جی ہاں! اگر کوئی مطلق العنان آمر حکمران ہوتا تو یقیناً اس نے واقعی اس طرح کا ہی جواب دینا تھا لیکن یہ خط اس ہستی کے پاس پہنچا جو رحیم اور کریم سردار تھا اور

وحی الٰہی کا امین اور کاتب تھا اس نے اپنے بیٹے سے فرمایا نہیں اے میرے بیٹے! میں اس کا جواب اس طرح ہرگز نہ دوں گا بلکہ میرے جواب دینے کا انداز کچھ اور طرز سے ہوگا۔

چنانچہ آپ نے جو جواب دیا، وہ ان تنگ ظرف حکمرانوں کے لیے مشعل راہ ہے، جو مختصر اور محدود سی حکمرانی کے گھمنڈ میں شرفاء کی جائز بات کو بھی برداشت نہیں کرتے اور انھیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کی تدبیریں کرتے ہیں، آپ نے لکھا:

''اللہ کے بندے معاویہ بن ابی سفیان امیر المومنین کی طرف سے حواری رسول کے بیٹے عبداللہ کی طرف!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اما بعد! اے حواری رسول ﷺ کے بیٹے مجھے آپ کا مکتوب ملا میں نے اسے پڑھا، یقین جانیے کہ مجھے بھی اس تنازعے سے اتنی ہی تکلیف پہنچی ہے جتنی آپ کو پہنچی ہے اور میں آپ کی خوشی کے مقابلے میں سارے دنیاوی مال ومتاع کو کمتر سمجھتا ہوں، میں نے اپنے آپ کو گواہ بنا کر یہ تحریر لکھ دی ہے کہ میری متنازعہ زمین اپنی زمین میں اور میرے غلاموں کو اپنے غلاموں میں شامل کر لیجیے۔ یعنی میں متنازعہ زمین سے دستبردار ہوتا ہوں اور ان غلاموں سے بھی جنھوں نے آپ کے غلاموں کو مارا ہے، لہٰذا انہیں اپنے قبضہ میں لے لیجیے۔''

جب امیر المومنین کا یہ جواب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو پہنچا تو ان کا رنج فرو ہوگیا اور ان پر حلم و بردباری کی عظمت آشکارا ہوگئی اور وہ جان گئے کہ حلیم و رحیم خلیفۃ المسلمین اور ظالم ومستبد حکمران میں مشرق و مغرب کا فرق ہوتا ہے چنانچہ انھوں نے جواب میں جو خط لکھا وہ پہلے خط کے بالکل برعکس تھا آپ کے اس خط کا

انداز یہ تھا:

''عبداللہ بن زبیر کی طرف سے امیر المومنین معاویہ بن سفیان کی طرف!

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اما بعد! مجھے امیر المومنین اطال اللہ بقاء ہ کا خط ملا جسے پڑھ کر مجھے اس حقیقت کی سمجھ آگئی جس کی وجہ سے سارے قبائل قریش نے آپ کی سیادت کو تسلیم کر لیا ہے۔''

سیدنا امیر المومنین نے یہ خط اپنے بیٹے کو پڑھایا اور اسے بتایا کہ اگر تیرے سامنے کوئی ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے تو اس کا ایسا ہی نرم ترین حل تلاش کرنا۔

یہ تھا حلم اور یہ تھی سیاست معاویہ جس نے اتنے بڑے دلیر اور جری انسان کو زیر کر لیا تھا۔ اب ذرا ان کے بھتیجے ولید بن عتبہ کا حلم و کرم کا قصہ بھی پڑھیے اور اندازہ کیجیے کہ اموی قریشی خاندان کے افراد بھی اپنے عم زاد ہاشمی قریشیوں کی طرح ہی وسیع الظرف سردار تھے۔ آپ کا یہ بھتیجا صحابیٔ رسول ﷺ عتبہ بن ابی سفیان کا بیٹا اور حواریٔ رسول سیدنا زبیر بن عوام کا نواسہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس ہاشمی کا داماد تھا اور اپنے چچا معاویہ بن ابی سفیان سے بھی بڑھ کر سرو قد اور خوبرو نوجوان تھا اور اتنا خوبرو تھا کہ جب سیدہ لبابہ بنت عبداللہ بن عباس ہاشمیہ ان کے نکاح میں آئی تو اسے اپنے چاند سے بڑھ کر حسن و جمال پر شرمندگی ہونے لگی ورنہ پہلے وہ سمجھتی تھی کہ مجھ سے بڑھ کر خوبصورت کون ہو سکتا ہے۔

یہ نوجوان جس طرح ظاہری حسن و جمال سے مالا مال تھا اس طرح باطنی طور پر بھی نہایت پاکیزہ دل اور نیک سیرت انسان تھا۔ امیر المومنین سیدنا معاویہ بن ابی سفیانؓ نے اسے اپنے بھتیجے ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ غرور و استکبار سے دور اور جاہ و حشمت سے نفور ہونے کی وجہ سے مدینۃ الرسولؐ کا گورنر مقرر کر دیا، اس نوجوان

گورنر نے اپنا منصب سنبھالنے کے بعد قبائل کے شیوخ اور شہر کے بزرگوں کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت پر بلایا اور ان میں صحابہ بھی تھے اور تابعین بھی تھے، عوام بھی تھے اور خواص بھی، کیونکہ وہ دعوت طعام جس میں امرا کو بلایا جائے اور غربا کو نظر انداز کر دیا جائے وہ بدترین دعوت ہے اور بہترین دعوت وہ ہوتی ہے جس میں امیروں اور غریبوں کو بلا امتیاز شریک کیا جائے۔

چنانچہ معزز مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی اور یہ گورنر دروازے پر کھڑا ہے، ہر ایک کا پرتپاک خیر مقدم کرنے لگا اور انھیں خاص ترتیب سے مہمان خانے میں بیٹھانے لگا، جب ہال مہمانوں سے بھر گیا تو خود صدر مجلس میں بیٹھ گیا اور غلام کو مہمانوں کے لیے کھانا لانے کا حکم دینے لگا، چنانچہ سلیقہ مند غلام تعمیل ارشاد کرتا ہوا گوشت کی ڈشیں ٹرے میں رکھ کر ہال کی طرف بڑھنے لگے، ابھی بے چارا ہال میں داخل ہوا ہی تھا کہ اس کے پاؤں کا انگوٹھا قالین کے کنارے سے اُلجھ گیا اور وہ اس طور سے منہ کے بل گرا کہ اس کے ہاتھوں پکڑے ٹرے کا کنارا گورنر مدینہ کے منہ کی ٹھوڑی سے جا ٹکرایا اور سارا گوشت اور شوربا اسکے منہ اور کپڑوں پر گرا، لباس اور قالین شوربے سے شرابور ہو گیا۔

غریب غلام بدحواسی کے عالم میں اُٹھ کر ہال کے کونے میں اپنی چمڑی اُدھڑنے اور گردن قلم ہونے کے خوف سے کپکپانے لگا۔ نوجوان گورنر نے گرم شوربے سے شرابور کپڑے اُتارنے اور غسل کر کے نئے کپڑے زیب تن کرنے کی غرض سے گھر چلا گیا، چنانچہ اس نے شوربے سے آلودہ کپڑے اُتارے اور غسل کر کے اپنے بدن سے چکنائی اُتاری اور اُجلا ہوا سوٹ زیب تن کیا اور معزز مہمانوں کی مجلس میں شرکت کی غرض سے ضیافت ہال میں داخل ہوا تو حاضرین مجلس کو اس کے چہرے پر ایسی خوبصورت مسکراہٹ دکھائی دی جس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں،

چنانچہ اس نے حاضرین سے اپنے لیٹ ہو جانے کی معذرت کی اور اپنی جائے نشست کی طرف بڑھنے لگا، ابھی اس نے دو قدم بھی نہ اُٹھائے تھے کہ اچانک اس کی نگاہ کونے میں، بید کی طرح لرزتے ہوئے غلام پر پڑی جس کا خوف کی وجہ سے خون خشک ہوا جا رہا تھا۔ تو وہ اس سے یوں مخاطب ہوا: ''اے مایوس غلام! میرا خیال یہ ہے کہ تو اپنی اس لغزش پر سزا سے ڈر رہا ہے، حالانکہ اس میں تیرا کوئی قصور نہیں ...... میں ان حاضرین کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ: ''جا تو اور تیری اولاد اللہ کے نام پر آزاد ہے اور آج کے بعد تم سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے غلام نہیں ہو۔''

غریب غلام کے کان میں اپنی آزادی اور بے گناہی کی آواز پڑی تو وہ مارے خوشی کے اُٹھ کھڑا ہوا اور ایڑیاں اُٹھا کر چلنے لگا اور ہواؤں سے باتیں کرنے لگا، اب اس کے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے، یہ ہے اس محسود خاندان کے افراد کا حلم و کرم جسے متعصب اور غالی قلم کار ظالم اور مستبد قرار دیتے ہیں ایک شاعر نے کیا خوب فرمایا ہے (بتغیر یسیر)

مَانَقَمَ النَّاسُ مِنْ بَنِي أُمَيَّةَ إِلَّا أَنَّهُمْ يَحْلُمُوْنَ إِنْ غَضِبُوْا

وَإِنَّهُمْ سَادَةُ الْمُلُوْكِ فَلَا تُصْلِحُ إِلَّا عَلَيْهِمُ الْعَرَبُ

(ترجمہ) لوگ شاہانِ بنو اُمیہ سے اس بنا پر نالاں ہیں کہ جب وہ غضب ناک ہوتے ہیں تو حلم سے کام لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ حکمرانوں کے سردار ہیں اس لئے عرب ان کے علاوہ کسی دوسرے کی سربراہی پر راضی نہیں ہوتے۔

---

[1] اس قصے کا اصل المستطرف میں ہے۔

شہادۃ الحق [1]

سینکڑوں نہیں ہزاروں افراد کے مجمع عام میں اور پھر کوفیوں کے سامنے منبر پر کھڑے ہو کر شہادۃ الحق دینا حضرت امیر المومنین علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہی کا حوصلہ تھا۔ آپ نے کوفہ کی جامع مسجد میں منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر پوچھا:

"لوگو! مجھے بتاؤ کہ سب لوگوں سے بڑھ کر شجاع اور دلیر کون ہے؟"

انہوں نے جواب دیا: اے امیر المومنین! آپ ہی سب سے بڑھ کر شجاع انسان ہیں۔

آپ نے فرمایا: جہاں تک میرا معاملہ ہے تو میرا جس کسی دشمن سے مقابلہ ہوا، میں نے حساب برابر کر دیا لیکن تم مجھے اشجع الناس کے متعلق بتاؤ کہ وہ کون ہے؟

لوگوں نے کہا پھر ہم نہیں جانتے لہٰذا آپ ہی بتائیں کہ وہ کون ہے؟

آپ نے فرمایا: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بن عثمان رضی اللہ عنہ۔

قربان جائیے حضرت امیر المومنین علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی صاف گوئی پر کہ اللہ کی قسم انہوں نے سچ کہا۔ اس سچ کے اظہار سے آپ کا مرتبہ کم ہوا نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بڑھا بلکہ دونوں کے مرتبے اتنے ہی رہے جتنے اللہ نے عطا فرمائے تھے البتہ اس صاف گوئی سے آپ کی فراست مومنانہ اور عقل فرزانہ پر عش عش کرنے کو جی چاہتا ہے اور اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ:

بادی النظر میں شجاع اور دلیر اسے سمجھا جاتا ہے جس نے جنگی معرکوں میں دشمنوں کی صفوں کو چیر ڈالا ہو اور ان کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے ہوں۔ جس طرح حضرت علی، حضرت زبیر، حضرت خالد بن ولید، حضرت براء بن مالک، حضرت ابو دجانہ انصاری، مثنیٰ بن حارثہ وغیرہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کارناموں سے پتہ چلتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو خوبیوں کو شجاعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک قوی البدن ہونا اور دوسرا قوی القلب ہونا۔ بسا اوقات قوی البدن انسان، قوی القلب بھی ہوتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ قوی البدن انسان قوی القلب بھی ہو۔ اور نہ یہ ہی ضروری ہے کہ قوی القلب انسان، قوی البدن بھی ہو۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قوی البدن جنگجو اپنے ہمراہیوں کی معیت میں بڑھ چڑھ کر حملے کرتا ہے لیکن جب وہ تنہائی کی حالت میں ہوتا ہے تو خوفزدہ ہو جاتا ہے اور آگے بڑھنے سے ڈرتا ہے۔

جبکہ قوی القلب انسان، قوی البدن جنگجو کی طرح کشتوں کے پشتے تو نہیں لگاتا لیکن خوفناک معرکوں میں گھس جاتا ہے اور خطرات کے سامنے ہمالیہ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کا اپنا بدن تیروں سے چھلنی ہو جائے گا یا تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ دانشمند اقوام اپنی قیادت کے لیے عموماً قوی القلب انسان کا انتخاب کرتی ہیں اور قوی البدن انسان کو خدمات پر مامور کرتی ہیں اگر شجاعت قلبیہ واقعی کوئی خوبی ہے تو یقین جانیے کہ حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بڑھ کر کوئی شخص دلیر اور شجاع نہیں۔

جنگ حنین میں چشم فلک نے دیکھا کہ چودہ ہزار کا لشکر میدان جنگ چھوڑ کر تتر بتر ہو گیا لیکن اس کا سپہ سالارِ اعلیٰ اکیلا خچر پر سوار میدان کارزار میں "اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِب، اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلَبِ" کہتا ہوا گھستا جا رہا ہے۔ آپ کے بعد سیدنا

ابوبکر کا نمبر ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک مرتبہ کفار مکہ نے حضرت نبی کریم ﷺ کو پکڑ کر مارنا شروع کر دیا تو سمیت حضرت علی المرتضیٰؓ کے جو اس وقت نوعمر بچے تھے کسی صحابی کو ہمت نہ پڑی کہ وہ آگے بڑھ کر آپ کو چھڑا سکے۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ کسی دوسری جگہ کسی کام میں مصروف تھے۔ ان کو کسی نے بتایا کہ تیرے صاحب کو قریش مکہ مار رہے ہیں۔ آپ فوراً بھاگے بھاگے آئے اور کسی کو مار کر، کسی کو دھکا دے کر، کسی کو سخت سست کہہ کر دور ہٹانے لگے۔ ان ظالموں نے حضرت نبی کریم ﷺ کو چھوڑ کر آپ کو پکڑ لیا اور اتنا مارا پیٹا کہ آپ کو نیم مردہ کر کے دم لیا۔ آپ کی قوم کے لوگ آئے اور چار پائی پر اٹھا کر گھر لے گئے۔ کہیں عصر کے بعد جا کر آپ ہوش میں آئے۔ پوچھنے لگے: ''اللہ کے پیارے رسول ﷺ کا کیا حال ہے؟

تو آپ کے تیمی قریشی تیمار دار یہ سن کر بگڑ گئے اور اٹھ کر چلے گئے۔ گھر والوں نے کھانا اور پانی پیش کیا تو آپ نے اس وقت تک کھانے پینے سے انکار کر دیا جب تک حضرت نبی کریم ﷺ کی خیریت کا پتہ نہ چل جائے۔ آپ کی ماں نے کافی اصرار کیا لیکن آپ اپنی بات پر اڑ گئے کہ مجھے حضرت رسول کریم ﷺ کے متعلق بتاؤ۔

المختصر آپ کو بتا دیا گیا کہ وہ دار ارقم میں خیریت سے ہیں تو آپ نے فرمایا: ''جب تک آنکھوں سے آپ کی زیارت نہ کر لوں مجھ پر کھانا پینا حرام ہے۔ چنانچہ رات کے کسی پہر جب لوگوں کی آمد و رفت ختم ہوئی تو آپ کو دار ارقم پہنچایا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر آپ کی جان میں جان آئی۔ آپؓ کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ اٹھے، گلے لگا کر بوسہ دیا اور رونے لگے۔

آپؓ نے فرمایا: اے اللہ کے پیارے رسول ﷺ حوصلہ رکھیے میں ٹھیک ہوں

فاسق عتبہ وغیرہ کفار کے تھپڑوں کی وجہ سے چہرہ ہی سوجا ہے باقی کوئی تکلیف نہیں۔

اللہ اکبر! آپ کو زندہ وسلامت دیکھ کر ابوبکرؓ کو قرار آیا اور تمام دکھ بھول گیا۔

امیر المومنین آپ کی اسی شجاعت قلبیہ کو بیان کر کے اتنا روئے کہ آپ کی چادر تر ہونے لگی۔ اس کے بعد آپ نے کوفی سامعین سے کہا میں تمہیں اللہ کی قسم دیکر پوچھتا ہوں کہ بتاؤ: مومن آل فرعون بہتر تھا یا حضرت ابوبکرؓ؟

حاضرین کوئی جواب نہ دے سکے، تو آپ نے فرمایا:

تم جواب کیوں نہیں دیتے؟ اللہ کی قسم! ابوبکرؓ کی زندگی کی یہ گھڑی آل فرعون کے مومن سے بہتر ہے کیونکہ وہ ایمان چھپائے پھرتا تھا اور ابوبکرؓ اپنے ایمان کا اعلان کر رہا تھا۔ (کنز العمال)

امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰؓ نے سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا ایک واقعہ بھی سنایا!

غزوۂ بدر کے دن ہم نے نبی کریم ﷺ کے لیے ایک جھونپڑا بنایا اور مشورہ کیا کہ آپ کے پاس کسی ایسے جانباز کو کھڑا کیا جائے جو کسی کافر کو ادھر منہ نہ کرنے دے (کیونکہ مشرکین نے آپ پر زوردار حملہ کرنا تھا) تو سوائے ابوبکرؓ کے کسی اور کو ہمت نہ پڑی۔ چنانچہ یہ تلوار سونت کر آپ کے پاس کھڑے ہو گئے جونہی کوئی کافر اس طرف رخ کرتا یہ اس پر شمشیر وسناں کے ساتھ جھپٹ پڑتے تو اس کو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑتا۔

اللہ کی قسم! شجاعت قلبیہ میں حضرت ابوبکرؓ اپنی مثال آپ تھے۔ فتنہ ارتداد کے موقعہ پر جبکہ قیصر روم ایک لاکھ افراد پر مشتمل فوج سرحد پر لے آیا تھا اور تیرہ قبائل مرتد اور منکر زکوۃ ہو چکے تھے۔ ان مرتدین میں سے اکیلے مسیلمہ کذاب کے پاس چالیس ہزار عرب جنگجو تھے۔ آپ نے جرأت مومنانہ سے کام لیتے ہوئے ساڑھے تین ہزار کے لشکر سے تمام اعداء اسلام کا صفایا کر دیا۔ انھیں دوبارہ وہاں داخل کیا جہاں سے وہ نکلے تھے۔ آپ کی انھی خدمات کی وجہ سے حضرت

امیر المومنین نے کوفہ کی جامع مسجد کے منبر پر علی الاعلان فرمایا:

((یَا اَهلَ الْکُوفَةِ، اِنَّ فِیْ رَقَبَتِیْ عَهْد ، اُرِیْدُ اَن اُخْرِجَهُ مِنْ رَقَبَتِیْ اِلٰی رِقَابِکُمْ اَلاَ اِنَّ خَیْرَ النَّاسِ بَعْدَ رَسُولِ اللّٰہ ﷺ اَبُوبَکرٍ، ثُمَ عُمَر، ثُمَّ عُثْمَان، ثم قال: وَاللّٰہِ مَا قُلْتُ ذَالِکَ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِیْ...))

''اے کوفہ والو: میری گردن میں ایک عہد ہے میں اسے اپنی گردن سے اتار کر تمھاری گردنوں میں دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ: رسول اللہ ﷺ کے بعد تمام لوگوں میں سے بہترین شخصیت ابوبکر ہیں، پھر عمر، پھر عثمان۔ (رضی اللہ عنہم) اس کے بعد فرمایا۔ اور اللہ کی قسم یہ بات میں نے اپنی طرف سے نہیں کہی (بلکہ اللہ کو علیم و خبیر جان کر حقیقت بیان کی ہے۔)''

اس کے بعد فرمایا:

((یَا اَهلَ الْکُوفه: اِنّ فی رَقَبَتِی شَیْئًا اُرِیْدُ اَن اُخْرِجَهُ مِنْ رَقَبَتِیْ وَاَجْعَلُه فِی رِقَابِکُمْ. اِعْلَمُوْا اَنّیْ کُنتُ جَالِسًا عِنْدَ رَسُولِ اللّٰہ ﷺ وَ عِنْدَہ مُعاوِیَةُ فَنزَلَ عَلیهِ الوَحْیُ، فَاَخذَ القَلَمَ مِن یَدیِ فَوَضَعه فِی یَدِ مَعَاوِیَةَ..فَوَ اللّٰہِ مَا وَجَدتُ مِن ذٰلِکَ فِی نَفْسِی، لاَ نّی عَلِمْتُ اَنَّ اللّٰہَ اَمَرہ بِذالِکَ ، اَلاَ اِنَّ المُسلِمَ مَن سَلِمَ مِن قِصّتی و قِصَّتهٗ))[طبقات حنابلہ: ج ۲]

اے کوفیو! میری گردن میں ایک چیز ہے میں چاہتا ہوں کہ اسے اپنی گردن سے نکال کر تمھاری گردنوں پر رکھ دوں۔ جان لو! میں حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ آپ کے پاس معاویہؓ بھی تھے کہ آپ پر وحی نازل ہونے لگی چنانچہ آپ نے میرے

ہاتھ سے قلم لے کر معاویہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اللہ کی قسم! مجھے اس پر ذرہ برابر ملال نہ آیا کیونکہ میں جانتا تھا آپ کو اللہ تبارک تعالیٰ ہی نے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔ آگاہ رہنا، مسلمان وہی ہے جو میرے اور اس کے (یعنی حضرت معاویہؓ کے) قصے میں اپنے آپ کو سلامت رکھے۔"

اللہ اکبر! یہ ہے شہادۃ الحق جو ایک عالی مرتبت ہستی کی جانب سے اپنے مخالف کے حق میں دی جا رہی ہے۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنین کنند

آپ کی اسی طہارت قلبی اور مومنانہ جرأت واستقلال نے آپ کو مومنین کا محبوب بنا دیا ہے وہ خلفائے ثلاثہ کے بعد کسی صحابیؓ کو آپ کے برابر نہیں سمجھتے اور وہ خصوصی طور پر آپ کو کرّم اللہ وجهه کہتے ہیں۔

......☆......

[1] یہ قصہ کنز العمال طبقات الحنابلہ میں موجود ہے۔

اعتراف عظمت

دمشق کے دربارِ عام میں حضرت معاویہؓ نے امیر المؤمنین سیدنا علی المرتضےٰ ؓ کے فدائی ضرار بن حمزہ الصدائی سے کہا کہ میرے سامنے حضرت علیؓ کے اوصاف بیان کیجئے۔

عرض کی: ''امیر المومنین مجھے معاف رکھیے۔''

فرمایا: نہیں بلکہ ضرور بالضرور بیان کیجیے۔''

ضرار کہنے لگے: ''اچھا اگر ضرور سننا ہے تو سنو۔''

اللہ کی قسم! وہ بلند خیال اور مضبوط اعصاب والے تھے۔ دوٹوک بات کہتے اور حق کے ساتھ فیصلہ کرتے تھے۔ ان کے پہلوؤں سے علم کے چشمے پھوٹتے تھے ان کے چاروں اطراف حکمت و دانائی بولتی تھی۔ وہ دنیا اور اس کی رنگینیوں سے بیزار تھے رات کی تنہائیوں اور وحشتوں سے مانوس تھے۔

اللہ کی قسم! وہ بڑے متحمل اور طویل سوچ والے انسان تھے۔ وہ اپنی ہتھیلی کو الٹتے اور اپنے آپ سے مخاطب ہوتے تھے وہ کوتاہ لباس اور سادہ خوراک پسند کرتے تھے وہ ہم میں گھل مل کر رہتے۔ جب ہم سوال کرتے تو وہ جواب دیتے۔ جب ہم کوئی خبر دریافت کرتے تو وہ ہمیں مطلع کرتے ۔لیکن اتنا قریب ہونے کے باوجود ہم ان کی ہیبت کی وجہ سے ان سے گفتگو کی ہمت نہ پاتے۔ وہ اہل دین کی تعظیم کرتے اور مساکین سے محبت کرتے طاقتور، اپنے باطل میں ان سے طمع

نہ کرتا اور کمزور ان کے عدل سے مایوس نہیں ہوتا تھا۔

میں گواہ ہوں کہ میں نے انھیں کئی دفعہ دیکھا کہ رات چھا چکی ہوتی، اور ستارے ڈھل چکے ہوتے تو وہ محراب میں اپنی ڈاڑھی پکڑے، سانپ کے ڈسے ہوئے شخص کی طرح تڑپ رہے ہوتے اور غمگین کی طرح رو رہے ہوتے۔ اور کہہ رہے ہوتے کہ اے دنیا میرے علاوہ کسی اور کو دھوکا دے۔ تو میرا سامنا کیوں کرتی ہے اور مجھ سے کیوں شوق رکھتی ہے؟ دور ہو جا! میں نے تجھے طلاق بائنہ دے دی ہے۔ تیری عمر چھوٹی اور خطرہ بڑا ہے۔ ہمارا زاد راہ کم، سفر لمبا اور راستہ پر خطر ہے۔

یہ سن کر حضرت معاویہؓ رو دیئے اور فرمایا: اللہ ابوالحسن پر رحم فرمائے۔ وہ یقیناً ایسے ہی تھے۔ تو اے ضرار ان کی جدائی پر تیرے غم کا کیا حال ہے؟

ضرار ''انکی جدائی پر میرا غم اس ماں جیسا ہے جس کے اکلوتے بیٹے کو اس کی گود میں ذبح کر دیا گیا ہو۔''

......☆......

حلیۃ الاولیاء: ۱/۸۴،۱ اور نہج البلاغۃ، ص: ۴۷۴۔

بیمثال حسن الجوار[1]

حضرت سعید بن العاص قریشی اموی جود وسخا اور بذل و عطاء، حلم و کرم، سیاست و امارت، شجاعت و بسالت جیسے اوصاف حمیدہ میں اپنی مثال آپ تھے۔ حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے اس طرح کے کریمانہ اوصاف کی وجہ سے انھیں اکرم العرب کا خطاب دے رکھا تھا۔

ایک مرتبہ ان کے کسی محلے دار کو اپنی مجبوری کے پیش نظر اپنا مکان فروخت کرنے کی ضرورت پڑ گئی۔ لوگوں کو اس بات کا علم ہوا تو وہ دوڑے آئے اور مکان کی بولی لگانے لگے۔ عام لوگوں کا وطیرہ یہ ہے کہ وہ مجبور کی مجبوری سے زبردست فائدہ حاصل کرتے ہیں اور اونے پونے داموں میں اس کی جائیداد ہتھیا لیتے ہیں۔ جبکہ مومن کا ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ وہ مجبور انسان کی مجبوری سے ناجائز فائدہ حاصل کرے۔ وہ لوگ بھی چونکہ اسی طرح کے ماحول کے پروردہ تھے لہٰذا انہوں نے مکان کی حالت دیکھ کر ایک لاکھ درہم کی پیش کش کی لیکن مالک مکان نے اس قیمت پر مکان فروخت کرنے سے انکار کر دیا اور کہا۔ خریدارو! تم نے میرے مکان کی خستگی دیکھ کر اس قدر کم قیمت لگائی ہے! اس بات کا ذرا خیال نہ کیا کہ اگرچہ یہ مکان خستہ ہے لیکن اس کے پڑوس میں سعید بن العاص اموی قریشی کا گھر ہے اور اس جلیل القدر سردار جیسا پڑوسی ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گا۔

وہ اپنے محلے دار اور پڑوسیوں کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ اگر ان میں کوئی سفر پر جائے تو اسے الوداع کرنے جاتے ہیں اور جب واپس آئے تو اس کا استقبال کرتے ہیں۔ جب کوئی چار دن نظر نہ آئے تو اس کی خبر گیری کرنے اس کے

--

گھر جاتے ہیں۔ جب کوئی بیمار ہو جائے تو اس کی ایسی تیمار داری کرتے ہیں کہ اسے اپنے عزیز و اقارب کی سرد مہریوں اور ستم ظریفیوں کا احساس نہیں رہتا۔ اگر مجھے مجبوری نہ ہوتی تو میں یہ مکان کبھی فروخت نہ کرتا۔

خریداروں نے جب حضرت سعید بن العاص اموی رضی اللہ عنہ کا نام سنا تو اپنی ہتھیلیاں اپنے سروں پر رکھ کر کہنے لگے: کہ یوں کہو ناں کہ اس جگہ کی قیمت اس کے بہترین پڑوسی کی وجہ سے ہے ورنہ اپنے رقبے اور لاگت کے اعتبار سے تو یہ مکان اتنی قیمت کا نہیں ہے۔

حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو جب اس قصے کی خبر پہنچی تو وہ فوراً اپنے پڑوسی کے گھر پہنچے اور اسے اس کے مکان کی رقم ادا کر کے اس بات پر افسوس کرنے لگے کہ کاش مجھے اپنے ہمسائے کی مجبوری کا علم ہو جاتا یا وہ چپکے سے میرے کان میں کہہ دیتا تو اسے اپنے مکان کی بولی لگانے کی زحمت نہ کرنا پڑتی اس کے بعد فرمایا:

اے میرے ہمسائے! یہ مکان بھی تمھارا رہا اور رقم بھی تمھاری۔ نہ تو اپنا مکان فروخت کرنا اور نہ رقم ہی مجھے واپس کرنا۔ سبحان اللہ! کیا خوب تھا پڑوس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اور کیا خوب تھے ان کے اخلاق و اوصاف! ایک مرتبہ یہ اپنے مکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک غریب سائل نے سوال کیا؛ مجھے اللہ کے نام پر کچھ دو۔ تو انہوں نے اپنے خازن سے کہا؛ اسے ایک لاکھ درہم دے دو۔"

ایک لاکھ درہم کا لفظ سن کر غریب سائل پر شادی مرگ طاری ہونے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا دے کر زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ جب آپ نے اسے اس قدر روتے دیکھا تو دلاسہ دیا اور پوچھا:

روتے کیوں ہو؟ مجھے کیا پتہ کہ آپ کی ضرورت کتنی ہے؟ اگر اس سے تمھاری ضرورت پوری نہیں ہو سکتی تو میں اور دے دیتا ہوں۔"

سائل نے یہ سن کر جواب دیا: جناب میرے رونے کا سبب یہ نہیں جو آپ نے سمجھا میں تو عام سائلوں کی طرح چند درہموں کی امید لے کر آیا تھا۔ میں تو اس

دن کا تصور ذہن میں لا کر رو رہا ہوں جب آپ جیسے نادر المثال فیاض اور سخی انسان کو بھی قبر میں دفن کیا جا رہا ہوگا۔ یہ سن کر حضرت سعید بن العاصؓ نے شرمساری سے منہ نیچے کر لیا اور خازن کو ایک لاکھ درہم اور دینے کا حکم دے دیا۔ اللہ اکبر!

اللہ تعالیٰ فیاض اور جواد ہے۔ وہ جود و سخا کو پسند کرتا ہے اور اپنی راہ میں لٹانے والوں پر دولت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ ایک مرتبہ آپؓ اپنے ہم نشینوں کے پاس اپنی حویلی میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ رات کا کافی حصہ گزر گیا۔ جب آپ کے ہم نشین اٹھ کر جانے لگے تو ایک اجنبی نوجوان بیٹھا ہی رہا۔ آپؓ نے اسے دیکھ کر چراغ گل کر دیا اور پوچھا:

نوجوان! کیا حاجت درپیش ہے؟

تو اس نے بتایا کہ مجھ پر چار لاکھ درہم کا قرض ہے۔ میں اس کی ادائیگی کی سکت نہیں رکھتا۔

آپؓ نے فرمایا: ''کوئی بات نہیں آپ کا قرض ہم ادا کر دیں گے۔''

آپ نے چراغ اس وجہ سے گل کر دیا تھا کہ اگر زندگی میں میرا اس سے کہیں ٹاکرا ہو جائے تو وہ منہ نیچا کر کے نہ گزرے بلکہ سر اٹھا کر خودداری سے گزرے اور اپنے آپ کو کسی کا زیر بار نہ سمجھے۔

یقیناً اس جیسے پڑوسیوں کے متعلق ہی جریر کو کہنا پڑا تھا۔

سَلَامٌ علی اَهلِ الدِّيَارِ لَانَبتَغِيُ بَدَلًا   دَارًا بِدَارٍ وَلَا الْجِيرَانَ جِيرَانَا

امیر المومنین سیدنا عمر بن خطابؓ کا حسن الجواران سے بھی عجیب تر تھا۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ چند راتوں سے سحری سے قبل کسی نقاب پوش کو ایک گھر سے نکلتا دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ ایک رات انھیں شک پڑ گیا یہ تو امیر المومنین عمر بن خطابؓ ہیں تو وہ وسوسوں میں پڑ گئے۔ بڑی مشکل سے رات کا بقیہ حصہ بسر کیا اور اگلے دن دستک دے کر اس گھر میں داخل ہو گئے۔ انھیں گھر میں ایک کونے میں

بیٹھی ہوئی اندھی بڑھیا نظر آئی تو یہ سیدھے اس کے پاس جا کر پوچھنے لگے:

اماں جی! یہ کون شخص ہے جو رات کے پچھلے پہر تیرے گھر آتا ہے اور یہاں آکر کیا کرتا ہے؟

بیٹا میں اندھی اور بوڑھی عورت ہوں۔ بڑھاپے کی وجہ سے رفع حاجت کے لیے باہر جانے سے قاصر ہوں اس لیے میں نے اپنے گھر کے ایک کونے میں بیت الخلاء بنا رکھا ہے وہیں اپنی حاجت سے فارغ ہو لیتی ہوں۔ یہ شخص روزانہ رات کو میرے گھر میں جھاڑو دیتا ہے اور بیت الخلاء سے گندگی اٹھا کر باہر پھینک آتا ہے۔

یہ سن کر حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ اپنے آپ کو کوسنے لگے

"طلحہ تیری ماں تجھے گم پائے تو امیر المومنینؓ کی لغزشیں تلاش کرتا ہے۔"

اللہ اکبر: کہاں چھتیس لاکھ مربع میل علاقے کا حکمران اور کہاں اندھی بوڑھی اماں کے بیت الخلاء کی صفائی کا اہتمام۔

سچ فرمایا اللہ کے پیارے رسول ﷺ نے کہ مخلص بندے کا اخلاص بھرا عمل سامنے آکر رہتا ہے اگرچہ وہ اسے تاریک کوٹھری میں چھپ کر ہی ادا کرے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ باوجود اپنی وجاہت اور مصروفیت کے اپنے ہمسایوں کی بچیوں کو ان کی بکریوں کا دودھ دوہ کر دیا کرتے تھے۔ جب آپ منصب خلافت پر فائز ہوئے تو ان کے ہمسایوں کی بچیاں افسوس کرنے لگیں کہ اب ہماری بکریوں کا دودھ کون دوہا کرے گا۔ اللہ اکبر، ہمارے ماضی کو خونیں تاریخ کہنے والے ابو بکر الصدیق جیسا زیرک اور فہیم، حضرت عمر بن خطاب جیسا عادل اور منتظم حضرت عثمان جیسا فیاض اور نرم خو، حضرت علی جیسا شجاع اور زاہد، حضرت سعید بن العاص جیسا، کریم النفس انسان کہیں دکھا سکتے ہیں؟ (رضی اللہ عنھم جمیعًا)

[1] اس قصے کا اصل منہاج القاصدین، العقد الفرید، جامع العلوم والحکم میں ہے لیکن ہمارا ماخذ المطالعة العربية ہے۔

بے مثال سخاوت [1]

فقر و فاقہ اور تنگدستی کا مارا ہوا یہ شخص امید اور مایوسی کے عالم میں حضرت عبداللہ بن عامر قریشی اموی رضی اللہ عنہ کی طرف اپنے قدموں کو یوں کھینچ کھینچ کر اٹھا رہا تھا، جیسے کسی ملزم کو تختہ دار کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا، کندھے لرز رہے تھے اور پیشانی عرق آلود تھی کیونکہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کامیاب لوٹے گا، یا ناکام۔ اس کا رنگ فق تھا اور چہرہ یوں نظر آ رہا تھا جیسے اس سے خون نچوڑ لیا گیا ہو، لیکن بیچارہ مرتا کیا نہ کرتا۔ بیماری نے بدن سے قوت کسب سلب کر لی تھی اور گھر میں علاج معالجے کے لیے ایک درہم بھی موجود نہ تھا۔ جوں توں کر کے کسی طبیب کے پاس گیا۔ اس نے نبض دیکھ کر، دوا فراہم کر کے اسے گائے کے دودھ سے تناول کرنے کی ہدایت کر دی۔ یہ بیچارہ تو نان جویں کا محتاج تھا، دودھ کہاں سے خریدتا۔ خود داری اور عزت نفس کی بنا پر کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے کو پہاڑ اٹھانے سے بھی گراں اور دشوار سمجھتا تھا۔ پھر شرفاء کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی مصیبت نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے وہ کہا کرتے ہیں:

لَنَقْلُ الصَّخْرَةِ مِنْ قُلَلِ الْجِبَالِ   اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ مِنَنِ الرِّجَالِ

یَقُوْلُ النَّاسُ کَسْبٌ فِیْهِ عَارٌ   وَکُلُّ الْعَارِ فِیْ ذُلِّ السُّوَالِ

”پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھاری چٹان کو اوپر سے نیچے منتقل کرنا میرے نزدیک لوگوں کے احسانات اٹھانے سے زیادہ اچھا ہے۔

لوگ کہتے ہیں: کمائی میں عار ہے، جبکہ ہر طرح کی عار کسی کے سامنے
دست سوال دراز
کرنے میں پنہاں ہیں۔ (یعنی اس سے بڑا ذلت والا کوئی کام نہیں۔)

تاہم شریعت مطہرہ میں، اس حالت سے دوچار شخص کے لیے، دست سوال دراز کرنے کی اجازت ہے۔ اگر اس حال میں بھی کوئی مسلمان دست سوال دراز نہ کرے اور بھوکا مر جائے تو جہاں اس کے ہم مذہب گنہگار ہوں گے، وہاں مرنے والا بھی خودکش متصور ہوگا۔ چنانچہ یہ ناتواں اور ناچار شخص بستر سے اٹھا اور کھڑا ہو کر اس سوچ میں ڈوب گیا، کہ جاؤں تو کس کے پاس؟ کیونکہ بخیل اور کنجوس مالدار کے سامنے آدمی اپنے چہرے کی آبرو بھی ضائع کر آتا ہے اور وصول بھی کچھ نہیں ہوتا۔

کنجوس اور بخیل مالداروں کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہوتا ہے، وہ خوش دلی سے مریضوں اور محتاجوں کو تو پانی کا گھونٹ بھی نہیں پلاتے اور نہ کسی مسکین کو لقمہ تک کھلاتے ہیں۔ مگر کنپٹی پر پستول رکھنے والے چور اور ڈاکو کے سامنے تجوریاں کھول دیتے ہیں۔ ان سے شکریے کی بجائے تھپڑ کھا کر خدا کا شکر بجا لاتے ہیں، کہ جان بچ گئی ہے۔

اس شخص نے اللہ کو یاد کیا اور نجیب الطرفین صحابی عبداللہ بن عامر اموی رضی اللہ عنہ کے گھر کی طرف چل پڑا، کیونکہ ان کی خصلتِ جود و سخا مشہور تھی۔ امید تھی کہ وہ چہرے کے آبرو کو رائیگاں نہ جانے دے گا۔

جی ہاں، حضرت عبداللہ بن عامر اموی رضی اللہ عنہ یقیناً سخی اور کریم انسان تھے اور حلم و کرم میں مشہور تھے۔ کیوں نہ ہوتے، جب یہ تین سال کے تھے تو حضرت رسول مقبول ﷺ نے ان کے منہ میں اپنا مبارک لعاب دہن ڈالا تھا اور یہ غٹ غٹ کر کے نوش کر گئے تھے اور انھیں دیکھ کر حضرت رسول مقبول ﷺ نے فرمایا تھا:

اے عبشمیو! تمھارا یہ بچہ اپنی شکل وشباہت میں، تمھاری نسبت ہم ہاشمیوں کے زیادہ مشابہ ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اسے سیرابی وشادابی عطا کی جائے گی اور یقیناً ایسا ہی ہوا۔

یہ فیاض، جو ماں کی طرف سے ہاشمی اور باپ کی طرف سے عبشمی تھا، جہاں کہیں بنجر زمین آباد کرتا، قدرت خداوندی سے بارشیں اس طرف رخ کر لیتیں اور زمین سے پانی کے چشمے ابلنے لگتے۔ وہاں ہریالی ہی ہریالی ہو جاتی۔ ان کے مویشیوں کے ریوڑ وہاں دن رات چرتے چگتے رہتے تھے۔ چنانچہ یہ لاغر اور بیمار شخص اپنی لاٹھی کے سہارے ان کی طرف چلنے لگا۔ جب ان کی خدمت میں پیش ہوا تو بمشکل اتنا کہہ سکا:

"میں بیمار ہوں اور طبیب نے مجھے دوائی دیکر ہدایت کی ہے، کہ اسے گائے کے دودھ سے تناول کیا جائے۔ چند دن کے لیے گائے کے دودھ کا سوال ہے۔"

جب حضرت عبداللہ بن عامر امویؒ نے یہ سنا، تو ان کا دل پسیج گیا۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگے کہ اے عبداللہ تو نے اس کے سوال کرنے سی قبل، اس کی حاجت کا اندازہ کیوں نہ لگایا اور یوں گویا ہوئے

"اے شخص! اس وادی میں میری سات سو (۷۰۰) گائیں چر رہی ہیں۔ میں نے اللہ کے نام پر تجھے ہبہ کر دیں۔"

مریض نے یہ الفاظ سنے، تو اس کی آدھی بیماری وہیں دور ہو گئی اور خوشی کی وجہ سے اس کا پژمردہ دل زندہ ہو گیا۔ چہرے پر بشاشت گردش کرنے لگی۔ لیکن بعد میں یہ سوچ کر کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دودھ کی بوند بوند کو ترسنے والا، یکدم سات سو گائیوں کا مالک بن جائے۔ اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ مگر یہ اس کی خام خیالی

تھی۔ حضرت عبداللہ بن عامر کوئی کہہ مکرنی کرنے والے نہ تھے اور نہ ہی سستی شہرت کے حریص۔ بلکہ یہ تو حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لعاب مبارک کی ادنیٰ سی کرامت تھی کہ وہ بلا دھڑک اس طرح کی بخششیں کرتے تھے اور اپنے مستقبل کی ذرہ برابر پروا نہ کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے پڑوسی حضرت خالد بن عقبہ کا مکان نوے ہزار درہم یعنی کم وبیش پینتالیس لاکھ روپے میں خرید لیا، تو شام کو اس مکان سے خالد کے بیوی بچوں کے رونے کی آواز آئی۔ کیونکہ جس گھر میں انسان کی نسلیں زندگیاں بسر کر چکی ہوں وہ اس کے باسیوں کو یوں پیارے لگتے ہیں جیسے شہد کی مکھیوں کو ان کا چھتہ اور بچوں کو ان کی مہربان ماں پیاری لگتی ہے۔ خالد بن عقبہ کو مالی مجبوریوں نے یہ مکان بیچنے پر مجبور کر دیا تھا، ورنہ وہ اسے بیچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

جب حضرت عبداللہ بن عامر اموی رضی اللہ عنہ نے ان کے رونے کی آواز سنی، تو اپنے غلام کے ذریعے اس کا سبب معلوم کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنا آبائی مکان فروخت ہونے پر رو رہے ہیں۔

یہ سن کر آپ نے فرمایا: جاؤ اور انھیں خوش خبری سنا دو کہ مکان بھی ان کا رہا اور پینتالیس لاکھ روپے بھی۔ نہ میں مکان لوں گا، نہ پینتالیس لاکھ روپیہ۔ یہ سن کر خالد بن عقبہ کے گھر والوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور جو ابھی ابھی رو رو کر برا حال کر رہے تھے، وہ مارے خوشی کے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی اس طرح کی فیاضیانہ بخششوں نے اس غریب اور مریض شخص کو حوصلہ دیا۔ وہ اٹھا اور سات سو گائیوں کا ریوڑ ہانک کر لے گیا۔

زیاد الاعجم انھی کے متعلق کہا کرتا تھا:

أَخٌ لَکَ لَاتَرَاهُ الدَّهْرُ اِلَّا عَلٰی الْعِلَّاتِ بَسَّامًا جَوَّادًا

اَخٌ لَکَ مَامَوَدَّتُهٗ بِمَزَقٍ اِذَا مَاعَادَ فَقُرُ اَخِيْهِ عَادَا

سَاَلْنَاهُ الْجَزِيْلَ فَمَا تِلُکَ وَاَعْطٰی فَوْقَ مُنِيَّتِنَا وَزَادَا

وَاَحْسَنَ ثُمَّ اَحْسَنَ ثُمَّ عُدْنَا فَاَحْسَنَ ثُمَّ عُدْتُ لَهٗ فَعَادَا

مِرَارًا مَا رَجَعْتُ اِلَيْهِ اِلَّا تَبَسَّمَ ضَاحِکاً وَثَنٰی الْوِسَادَا

(۱) ''وہ تیرا بھائی ہے جسے زمانہ آفات میں بھی خندہ رُو اور سخی و فیاض دیکھتا ہے۔''

(۲) ''وہ تیرا ایسا بھائی ہے جس کی دوستی پارہ پارہ نہیں ہوسکتی جب کبھی اس کے بھائی کی طرف تنگدستی رُخ کرے تو وہ سخی انسان بھی اپنے اس بھائی کی طرف رُخ کرلیتا ہے۔''

(۳) ''ہم نے اس سے مالی صلے کا سوال کیا تو اس نے ذرّہ برابر توقف نہ کیا اور ہماری توقعات سے بڑھ کر دیا۔''

(۴) اس نے پے در پے احسان کیے، پھر بھی ہم اس کی طرف لوٹے تو اس نے احسان کیا، چنانچہ میں پھر اس کے سامنے آیا تو اس نے پھر بھی احسان کیا اور ذرّہ برابر بھی ملال نہ کیا۔''

(۵) ''میں کئی مرتبہ اس کی طرف آیا تو وہ مسکرا کر ہی ملا اور میرے لیے گول تکیہ بچھا دیا۔''

......☆......

[1] اس قصے کا اصل منہاج القاصدین ابن جوزی میں ہے۔

گوہر نایاب کی بازیابی[1]

یہ حسین وجمیل نوجوان ملک کے مشہور ومعروف تاجر کا نورِ چشم تھا۔ اس کی دکان اس دریا کی طرح تھی جس میں سونے کی ندیاں گر رہی ہوں۔ وسیع وعریض محل اپنی خوبصورتی میں جنت عدن کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس محل میں پچاس کنیزیں موجود تھیں جو اپنی صفائی اور حسن میں گلشن کے رنگا رنگ پھولوں کی طرح تھیں جنھیں شبنم کے قطروں نے دھو ڈالا ہو یا اس گلدستے کی طرح تھیں جسے نئی نویلی دلہن کے حجلہ عروسی میں رکھنا مقصود ہو۔ لیکن یہ خوبرو اور نوابی شان وشوکت رکھنے والا نوجوان، زندگی کے اصل اور پر لطف پہلو سے بے خبر تھا۔ ایک دن غلاموں اور کنیزوں کے بازار میں اس کی نگاہ اچانک اس پری پیکر حور تمثال پر پڑی جس کا چہرہ بدر تمام کو شرما رہا تھا اور سرمگیں آنکھیں اپنی باریک باریک سیاہ پلکوں سے بڑے بڑے زاہدوں کو تڑپا رہی تھیں۔ گورے رخسار پر قدرتی گندھا ہوا سیاہ تل دیکھنے والوں کے دلوں کو مقناطیس کی طرح کھینچ رہا تھا۔ اولوں جیسے صاف وشفاف دندان، نیلگوں آسمان پر چمکنے والے تاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ یہ دراز گردن دلربا جب پھول کی نازک پتیوں جیسے لب کھول کر مسکراتی تو منہ سے بجلی کوندنے لگتی۔

جوں جوں یہ نوجوان اس حور کے انگ انگ پر نظر دوڑاتا ایک سے ایک بڑھ کر خوبی دیکھتا۔ یہ حور اس کی آنکھوں کے شیشے سے ہوتی ہوئی اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ اس نے منہ مانگے دام یعنی پانچ صد طلائی دینار دے کر اسے خرید لیا۔ اسے گھر لے آیا۔ پھر وہ اسی کا ہو کر رہ گیا۔ اب اس کی صورت حال یہ تھی

کہ دن بھر ایک گھڑی دکان پر بیٹھتا تو بے قرار ہو کر گھر آ جاتا۔

اس کی غیرت گوارا نہ کرتی تھی کہ سورج بھی اس پر اپنی کرنیں ڈالے یا اسے بادنسیم کا جھونکا چھوئے۔ جونہی یہ دکان کھولتا جدائی کے تلخ لمحات اسے بے قرار کر دیتے۔ آتش محبت سینے میں مچلنے لگتی تو یہ دکان بند کر کے دلربا کے شیریں آبِ دہن سے آتش شوق بجھانے موجود ہوتا۔ حبیبہ کی محبت اس کا سرمایہ حیات اور زندگانی کا بھید بن گئی ورنہ اس نوجوان کو زندگی کی جنسی لذتوں کا پتہ ہی نہ تھا۔

اس سے پہلے یہ نوجوان شاعروں کی عشقیہ غزلوں اور بلیغ تشبیہات کو الفاظ بلامعنی سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک منظروں کی دلفریبی، راتوں کی چاندنی، صبح کی تروتازگی کوئی چیز نہ تھی۔ اس کے نزدیک شعراء کی غزلوں کی اہمیت تھی تو اتنی سی جتنی عجمی انسان کو عربی اشعار سے ہوتی ہے۔ وہ جانوروں کی طرح الفاظ تو سنتا ہے لیکن معانی سے بے خبر رہتا ہے۔ جب اسے عشق سے واسطہ پڑا تو جان گیا کہ ان الفاظ کے اندر وہ حقائق ہیں جو دلوں کو تڑپا دیتے ہیں اور کلیجے کو چیر دیتے ہیں۔

جوں جوں دن گزرتے گئے، جنون محبت بڑھتا گیا۔ تجارت کا برفاب محبت کی آنچ میں پگھلنے لگا۔ دکان بند رہنے لگی۔ جمع شدہ سیم و زر نکلنے لگا۔ سالہا سال کی جمع کی ہوئی دولت شبنم کے قطروں کی طرح بکھرنے لگی لیکن یہ نوجوان ذرا پروا نہ کرتا کیونکہ اسے ایسی حبیبہ مل گئی جس سے ایک گھڑی کا وصل کائنات کی دولت سے بدرجہا بڑھ کر تھا۔ یہ اپنے گاہکوں کو دکان پر کھڑے چھوڑ کر حور تمثال حبیبہ کا دیدار خریدنے چلا جاتا۔ جب کبھی نیک بخت سمجھاتی کہ جاؤ اور مال و دولت کی خبر کرو، تجارت کرو اور ثروت بچاؤ تو یہ کہتا:

مجھے سیم و زر اور دولت و ثرت سے کیا غرض؟ بس تو ہی میری ثروت اور تجارت ہے۔ وہ جب بھی بات کرنا چاہتی یہ نوجوان اس کے پھول کی پتیوں جیسے نازک

ہونٹوں پر قُبلہ جما کر خاموش کرا دیتا۔

بالآخر تجارت ختم ہو گئی۔ سونے کا کنواں خشک ہو گیا۔ اثاثہ فروخت ہو گیا۔ کنیزیں (خادمائیں) بک گئیں تو اس نے محل کے مرمریں پتھر فروخت کرنے شروع کر دیئے۔ جانے والے مال کا غم نہ گمشدہ خزانے کا افسوس! اسے حبیبہ کی محبت میں بھوک سے غذا اور پیاس سے سیرابی حاصل ہوتی۔ وحشت سے سکون اور سردی سے حرارت نصیب ہوتی۔ اس کے گورے چٹے رخساروں نے اسے پھولوں سے بے نیاز کر دیا۔

کیونکہ اسے موتیوں کے بدلے محبوبہ کے اولوں جیسے شفاف دندان اور شہد کے بدلے محبوبہ کا شیریں آب دہن مل گیا، اس کے ریشم جیسے نرم و نازک بدن کی خوشبو، مشک ختن کا نعم البدل تھی۔ اس کی گوری اور چوڑی چھاتی میں اس کی دنیا آباد تھی۔ اس کے ہاں اندھیری رات کے وقت محبوبہ جیسی قندیل روشن رہتی تھی جو رات کو روشن دن میں بدل دیتی اور ویران محل کو جگمگا دیتی تھی۔

......☆......

الغرض محبت کا فصل پک گیا اور برداشت کا وقت آ گیا لیکن خزاں یا بہار میں نہیں بلکہ شدید ترین سردی کے موسم میں آیا اور ان دنوں گھر میں فقر و فاقہ کے دن تھے۔ گھر بھر میں لے دے کر صرف ایک چٹائی رہ گئی تھی جس کے دھاگے ٹوٹ رہے تھے اور روئی کے ٹکڑے مٹی سے میلے ہو رہے تھے۔

اس بیچاری کو درد زہ شروع ہوا تو وہ اس چٹائی پر پچھاڑیں کھانے لگی۔ یہ نوجوان اپنی حبیبہ کے درد کو اپنی پسلیوں میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کی ہر چیخ اس کے دل پر خنجر کی طرح پیوست ہو رہی تھی لیکن بھلا کیا کر سکتا تھا۔ جب تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی تو اس بیچاری نے کہا:

اے میرے محبوب! میں مر جاؤں گی۔ جا میرے لیے کچھ روغن، شہد اور آٹا

لے آ اور جلدی کر۔ اگر دیر ہو گئی تو مجھے زندہ نہ پائے گا۔

......☆......

یہ گھر سے نکلا اور دیوانے کی طرح دوڑ دوڑ کر مطلوبہ اشیاء تلاش کرنے لگا۔ دکانیں اور بازار بند تھے۔ لوگ گھروں میں مزے کی نیند سو رہے تھے لیکن محبت کا متوالا پردیسیوں کی طرح مارا مارا پھر رہا تھا۔ یہ دوڑتا ہوا بغداد کے پل پر جا پہنچا۔ اس کا اگر کوئی گھر تھا تو وہی جس سے نکل کر آیا تھا اور اگر کوئی غم خوار تھا تو وہی عورت جو درد سے مر رہی تھی۔ اس کے دل میں خطرناک وسوسے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ اسے اپنی محبوبہ کے خاتمے کے بعد آنے والی وحشت اور کاٹ کھانے والی تنہائی کا خوف لرزا رہا تھا۔

جب وسوسوں نے بھیانک منظر پیش کیا تو سوچنے لگا؛ اگر دجلہ میں چھلانگ لگا کر میں بھی زندگی کا خاتمہ کر لوں تو شاید اگلے جہاں میں اکٹھے ہو جائیں۔ دجلہ کا پانی رات کی سیاہ چادر اوڑھے رقص کر رہا تھا۔ چاروں طرف یخ بستہ خاموشی چھا چکی تھی۔ یہ چھلانگ لگانا ہی چاہتا ہے کہ اسے اپنی حبیبہ کا انتظار اور تکلیف یاد آ ئی۔ اپنی درماندگی اور ناچاری نے اسے یہ دعا مانگنے پر مجبور کر دیا: ''اے اللہ میری حبیبہ اور جو کچھ اس کے پیٹ میں ہے وہ تیرے سپرد کرتا ہوں۔''

اس کے بعد لمبے چوڑے خیالات برق رفتاری سے اس کے ذہن پر گزرنے لگے۔ یہ چھلانگ لگانے سے پہلے سوچنے لگا کہ اس یخ بستہ پانی میں موت جلدی آ جائے گی یا دیر سے۔ آیا مشکل سے دوچار ہونا پڑے گا یا نہیں۔ کیا اللہ خودکشی کرنے والوں کی جواب طلبی نہیں کرے گا اور حکم عدولی کرنے والوں کو سزا نہ دے گا؟ کیا اللہ تعالیٰ نے خودکشی حرام نہیں کی؟ کیا یہ جان اس کی ملکیت نہیں؟ جو اس نے بطور امانت بندے کو دے رکھی ہے۔ یہ جان نہ میری ہے نہ میں نے پیدا کی ہے پھر یاد آیا کہ میں نے جو اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے اور محبوبہ کو اس کے سپرد کیا ہے تو کیا وہ ایسے ہی رائیگاں

جائے گی۔ مرنے کے بعد میں اللہ کو کیا جواب دوں گا۔ ایمان جاگ اٹھا اور یہ واپس مڑنے پر آمادہ ہو گیا لیکن مستقبل کے بھیانک خوف نے پھر پاؤں پکڑ لیے۔ یہ آنکھیں بند کر کے کوئی خطرناک فیصلہ کرنا ہی چاہتا تھا کہ ایک غیر محسوس قوت نے بازو پکڑ لیے اور یہ قوت دراصل دل موہ لینے والی وہ سریلی آواز تھی جو دور سے گونجتی ہوئی سنائی دی۔ یہ آواز آبشاروں اور نہروں سے ہوتی ہوئی دجلہ پار کر رہی تھی۔ یہ آواز اس بات کی علامت تھی کہ رات ختم اور دن شروع ہو گیا ہے۔ یہ موذن کی آواز تھی۔ جس کے انتظار میں چوپائے کھڑے اور پرندے بیٹھے رہتے ہیں۔ جسے سن کر بلبلیں چہچہانے لگتی ہیں اور نمازی جاگ پڑتے ہیں۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر...... لا الہ الا اللہ

اسے حی علی الصلوٰۃ۔ حی علی الفلاح کے الفاظ سن کر دنیا کی سعادت اور آخرت کی بزرگی نظر آئی۔ اس کے اعصاب میں قوت و توانائی دوڑنے لگی۔ وہ وہاں سے واپس گھر آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ پڑوس کی عورتیں جمع تھیں جو اس کی آہ و بکا سن کر جمع ہو گئی تھیں۔ اس نے ان سے اپنی بیوی کی حالت دریافت کی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ فوت ہو چکی ہے، حالانکہ وہ بے ہوش ہو کر سکتہ میں تھی۔ یہ فوتیدگی کی اطلاع سن کر چیختا چلاتا، روتا پیٹتا، بال نوچتا، کپڑے پھاڑتا ہوا دیوانوں کی طرح جدھر منہ آیا ادھر چل پڑا۔

اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے اور یہ بستیوں اور شہروں میں گھومتا ہوا خراسان جا نکلا عرب لوگ مروت کی وجہ سے کھانا اور بستر مہیا کر دیتے لیکن یہ نہ پوچھتے کہ تو کون ہے اور کہاں جانا چاہتا ہے۔

کچھ عرصے کے بعد ہوش و حواس درست ہوئے تو کسی واقف کار نے اسے تجارت کے لیے پیسہ دے دیا۔ چنانچہ یہ تھوڑے ہی عرصے میں مالدار ہو گیا۔ گھر میں سونے چاندی کی ریل پیل ہو گئی۔ یہ اپنے گھر کے پتے پر پڑوسیوں کو خط لکھتا

رہا۔ چنانچہ اس نے چھیاسٹھ خط لکھے لیکن جواب ایک کا بھی نہ آیا۔

جس شخص نے ازدواجی زندگی کا حظ اٹھایا ہو اور بیوی کی محبت میں شیریں اوقات گزارے ہوں وہ بھلا کیونکر تنہائی کی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ سونے اور چاندی کے درہم و دینار سے عمدہ کھانے، بہترین پوشاکیں، اعلیٰ سواریاں، بلند وبالا کوٹھیاں خریدی جا سکتی ہیں لیکن ہم مزاج، ہم خیال دردمند رفیقہ حیات کا ملنا قسمت پر موقوف ہوتا ہے۔

یہ نوجوان جب رات کو گھر کے دروازے بند کر لیتا تو شاندار ماضی کے پر لطف لمحات اور اپنی حبیبہ کے اوصاف کو یاد کر کے روتا۔ اسے اپنا بغدادی محل جو اپنی خستہ حالی کے باوجود محض دلربا کے دم خم سے گلشن نما تھا، اس محل سے بہت پیارا لگتا تھا جس میں سوائے سونے چاندی کے کوئی غم خوار نہیں تھا۔

اسے خراسان میں اٹھائیس سال بیت گئے۔ عمر کی بہار خزاں میں تبدیل ہو نے لگی۔ یہ گھبرا گیا کہ اسے کہیں اس حال میں ہی موت نہ آ جائے کہ وہ اپنی محبوبہ کی قبر بھی نہ دیکھ سکے۔ چنانچہ ایک رات یہ تصور وحشت ناک منظر بن کر سامنے آ گیا تو اس نے بغداد واپسی کا عزم بالجزم کرلیا۔

اس نے اٹھائیس سال کی کمائی ہوئی دولت بیس ہزار طلائی دیناروں میں فروخت کر دی اور عمدہ پوشاک اور کچھ سامان خرید کر ایک قافلے کے ساتھ بغداد کی طرف چل پڑا۔ دل میں بس ایک ہی آرزو تھی کہ بیوی کی قبر پر ایک شاندار عمارت بنائے اور وہیں کا ہو کر رہ جائے۔

لیکن رابستہ میں قافلہ پر ڈاکو ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے قافلہ والوں کو لوٹ کر قتل کر دیا۔ یہ رات کو مردوں کے درمیان سے اٹھ کر پیدل چلتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ دنیا دکھوں اور مصیبتوں کا گھر ہے۔ حبیبہ کی جدائی کا جانکاہ صدمہ دل سے اترا بھی نہ تھا کہ دوسرا صدمہ آن پڑا۔ یہ پھر خودکشی کا سوچنے لگا مگر ایمان چونک پڑا اور اس

نے یاد کیا کہ میں نے اپنی حبیبہ اور اس کے جنین کو اللہ کے سپرد کیا تھا اور اللہ کے پاس امانتیں ضائع نہیں ہوتیں۔

کیا عجب کہ وہ امانت محفوظ ہی ہو۔ یہ انھی سوچوں میں گم چلتا ہوا دریا کے کنارے آ پہنچا۔ اتفاق سے وہاں ایک بحری جنگی جہاز گزر رہا تھا۔ اس نے جہاز کی طرف اشارہ کر کے آواز دی جہاز والوں نے اپنا رخ اس کی طرف کر دیا اور اسے اپنے ساتھ سوار کر لیا۔

اسلام کی خوبی یہ ہے کہ اس کے ماننے والے اپنے بھائیوں کو حقیر نہیں سمجھتے۔ خواہ وہ امیر ہوں یا غریب۔ انہوں نے اسے کھانا پیش کیا۔ یہ کھانا کھا کر سو گیا۔ جہاز دن بھر چلتا رہا۔ شام کے وقت یہ بیدار ہوا تو بغداد نظر آ رہا تھا۔ اسے بغداد اور دجلہ کا پرشکوہ منظر تعجب میں ڈالنے لگا۔ دجلہ کی سطح پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں اور جہاز مچھلیوں کی طرح ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ کھجوروں کے درخت باہم معانقے کر رہے تھے۔ پانی کی موجیں رقص کر رہی تھیں۔ ان کا جہاز ان کشتیوں میں ایسے گزر رہا تھا جیسے کوئی جواں مرد حسینوں کی جمگھٹے سے گزر رہا ہو۔

امیر الجیش نے اسے بغداد کے اسی پل پر اتارا، جہاں یہ اٹھائیس سال قبل کھڑا چھلانگ لگانے کا سوچ رہا تھا۔ اس وقت اس کے دل کی کیفیت یہ ہو گئی کہ اب پھر سے روغن اور شہد خرید کر اپنی حبیبہ کو پیش کرے۔ لیکن فوراً متنبہ ہوا کہ یہ کوئی گھنٹوں کی بات نہیں بلکہ اٹھائیس سال کا عرصہ ہے۔ کتنے لوگ پیدا ہوئے اور کتنے فوت ہو گئے۔ یہ وہاں سے اپنے ویران گھر کو ڈھونڈنے چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ اس ویران گھر کی جگہ ایک عظیم الشان مکان تیار ہو چکا ہے اور اس کے گیٹ پر مسلح نوجوان چاک و چوبند کھڑے ہیں۔ یہ سوچنے لگا کہیں میں بھول نہ گیا ہوں۔ واپس مڑا تا کہ پوچھ لے لیکن پوچھے تو کس سے؟ ناشناسا چہرے ہیں۔ جگہیں

تبدیل ہو چکی ہیں۔ اس کو اپنی آخری آرزو بھی پوری ہوتی نظر نہ آئی وہ رجعت قھقری میں تھا کہ اچانک اس کی نگاہ قدیمی دکان پر پڑی۔ جس میں ایک نوجوان سبزی فروخت کر رہا تھا۔ یہ وہاں پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ اس نوجوان کا باپ عرصہ بیس سال سے فوت ہو چکا ہے اور یہ پر شکوہ محل امیر المومنین مامون الرشید کی دایہ کے بیٹے کا ہے جو آج کل مملکت اسلامیہ کا سیکرٹری خزانہ ہے۔ اس دکاندار نے مزید بتایا کہ اس نوجوان کا قصہ بھی عجیب ہے اس کا باپ نامور تاجر کا فرزند تھا۔ اس نے کنیز خریدی اور پھر اسی کا ہو کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ سال بعد کنیز کو دردزہ شروع ہوا تو وہ اس کے لیے خوردونوش کی اشیاء لینے گیا جو اسے کہیں سے بھی نہ ملیں اور نہ وہ خود ہی واپس آیا لیکن میرے والد نے اس کی کنیز کی طلب پوری کر دی تھی۔ انہی ایام میں امیر المومنین ہارون کے ہاں بچہ پیدا ہوا جو کسی دائی کا دودھ نہیں پیتا تھا۔ جونہی اسے اس کنیز کا دودھ پلایا گیا، تو اس نے فوراً پی لیا۔ اس دن سے یہ کنیز نومولود کی رضائی ماں بن گئی جو اسے کافی عرصہ دودھ پلاتی رہی اور وہ نومولود آج کل امیر المومنین مامون کے نام سے مشہور ہے۔

یہ تفصیل سن کر اس تاجر کے گرد زمین گھومنے لگی اور بیشمار شکوک اور امیدیں مختلف صورتوں میں اس کے دل پر برق رفتاری سے گزرنے لگیں۔ اس نے سبزی فروش سے پوچھا کہ اُمُّ الولد (بچے کی ماں) کہاں ہے؟

اس سوال کے جواب کا انتظار اس پر عرصہ قیامت کی طرح گزرنے لگا۔ جواب سننے کے لیے بے تابی کا یہ عالم تھا کہ وہ گویا کوئی ملزم ہے جسے عدالت سے قتل یا برأت کا حکم سنایا جانا ہو۔

سبزی فروش نے بتایا کہ وہ کچھ عرصہ اپنے بیٹے کے ہمراہ امیر المومنین کے گھر جاتی رہی لیکن آج کل اس سامنے والے محل میں رہ رہی ہے۔ البتہ اس وقت سے

آج تک اس کی آنکھوں سے آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے۔

یہ اسے چھوڑ کر جلدی جلدی محل کی طرف بڑھنے لگا۔ ساری تھکاوٹیں دور ہو گئیں۔ جوانی کی یادیں سینے میں رقص کرنے لگیں۔ یہ حمد الٰہی کے ترانے گاتا ہوا چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ سبحان اللہ! میں جس محبوبہ کی قبر کے پاس دفن ہونے کے لیے آیا تھا وہ ابھی تک اس انتظار میں ہے کہ محبوب آئے اور وہ اسے اپنے سینے میں بھری ہوئی محبت پیش کرے اور وہ جنین جو موت کے دروازے پر کھڑا تھا آج وہ مملکت اسلامیہ کا امین بیت المال یعنی سیکرٹری خزانہ بن چکا ہے۔

دروازے پر جا کھڑا ہوا تو گھر کے نوجوان مالک نے پوچھا: صاحب کیا تلاش کرتے ہو؟''

اس کا دل دھڑکنے لگا اور سانس تیز ہوگئی۔ آنکھیں آنسو برسانے لگیں۔ بات کرنے کا یارانہ رہا۔ بس اتنا ہی کہا: ''میں تیرا باپ ہوں!''

نوجوان نے تردد کے عالم میں کہا: میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ یہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ دونوں یکے بعد دیگرے کئی صحنوں سے گزرتے ہوئے حرم تک پہنچ گئے۔

نوجوان نے اسے پردے کے پیچھے کھڑا کیا اور خود اندر چلا گیا تاکہ اپنی ماں سے اس کے متعلق پوچھ لے۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ اندر میری حبیبہ ہی ہے۔ اس نے آواز دی تو وہ آواز پہچان کر برق رفتاری سے پردے سے باہر آئی اور اسے زندہ سلامت دیکھ کر خوشی کے آنسو بہانے لگی۔ چاہتی تھی کہ فوراً اس کے سینے سے چمٹ جائے لیکن نوجوان بیٹے کی موجودگی میں حیاء کی وجہ سے ایسا نہ کر سکی۔

سمجھدار نوجوان یہ دیکھ کر بغیر کچھ کہے سنے باہر چلا گیا تاکہ اب کے والدین جی بھر کر اپنی پرانی یادیں تازہ کر لیں۔

[1] اس قصے کا اصل قصص من التاریخ میں موجود ہے۔

ناگہانی مسرت [1]

ابو وداعہ کی نوجوان اور سلیقہ شعار بیوی عین جوانی کے عالم میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔ تو اس کے لیے دنیا اندھیر ہو گئی۔ صدمے کی وجہ سے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔ ٹانگیں بدن کا بوجھ اٹھانے سے جواب دینے لگیں۔ بیٹھنا چاہتے تو بیٹھا نہ جاتا۔ سونا چاہتے تو بستر پر کروٹ نہ لگتی۔ کھانا چاہتے تو لقمہ حلق سے نیچے نہ اترتا۔ دوست احباب بہتیرا دلاسہ دیتے لیکن جس پر گزرے وہی جانتا ہے۔ حوصلہ اور سہارا دینے والے کھانے پینے کا سامان دے کر کام کاج میں مصروف ہو گئے۔ لیکن ابو وداعہ کو ہموم وغموم نے گھیر لیا۔ مستقبل کے بھیانک تصور نے نیند اچاٹ کر دی۔ وہ اس حالت سے نکلنے کے لیے ایک ایسے شخص کی مجلس میں غم ہلکا کرنے کے لیے چلے گئے جس نے پچاس (۵۰) سال تک تکبیر اولیٰ فوت نہ ہونے دی تھی۔ پہلی صف میں کھڑا ہونے کے باعث کسی نمازی کی گدی پر نگاہ نہ ڈالی۔ غیور ہونے کی بنا پر تیس ہزار (۳۰۰۰۰) درہم سے زائد رقم کے عطیہ کو نگاہ بھر کر نہ دیکھا۔ فرمایا کہ نہ مجھے تیس ہزار درہم کی پروا ہے نہ بنو مروان کے بادشاہ کی۔ آپ نے ہر طرح کی مصلحتیں بالائے طاق رکھتے ہوئے غیر شرعی بیعت سے انکار کر دیا اور اس کی پاداش میں اپنی گردن تلوار کی دھار کے نیچے رکھ دی تھی۔ اس کے متعلق ہی تو حضرت عبداللہ بن عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے فرمایا تھا: ''اگر اس نوجوان کو رسول مقبول ﷺ دیکھ پاتے تو نہایت مسرور ہوتے۔ یہ تھے حضرت سعید بن مسیب، سیدنا ابوہریرہؓ کے داماد اور

فقہائے مدینہ کے سرخیل، حدیث وفقہ، زہد و ورع، عبادت و ریاضت جیسی خوبیوں سے متصف۔ (رحمہ اللہ)

ابو وداعہ کہتے ہیں کہ میں جونہی ان کی مجلس ایمان وعرفان میں پہنچا، تو انہوں نے مجھ سے غیر حاضری کا سبب دریافت کیا: اتنے دن کہاں غائب رہے؟

ابو وداعہ: میری اہلیہ فوت ہو گئی تھی۔ اسی سلسلے میں مشغولیت کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکا۔

سعید: تو نے ہمیں کیوں نہ بتایا؟ تاکہ ہم بھی اس کی نماز جنازہ میں شامل ہوتے؟

ابو وداعہ: آپ کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا

ابو وداعہ اس طرح کی باتیں کر کے اٹھنے لگے تو حضرت سعید بن مسیّبؒ نے ان کے زانو دبا کر بٹھا لیا اور پوچھا: اب کیا پروگرام ہے؟ شادی کرنی ہے تو بتاؤ!

ابو وداعہ: اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ میرے جیسے مفلس اور قلاش انسان کو جو سوائے دو، تین درہموں کے پونجی نہیں رکھتا، رشتہ کون دے گا؟

فرمانے لگے: اگر میں ہی دے دوں تو کیا خیال ہے؟

یہ الفاظ سن کر ابو وداعہ کا دل سینے میں رقص کرنے لگا، کہنے لگے: زہے قسمت! وہی دوشیزہ جس کے علم و فضل، حسن و جمال اور حسب و نسب کی شہرت سن کر خلیفۃ المسلمین عبدالملک بن مروان نے اس کا رشتہ اپنے بیٹے ولید بن عبدالملک کے لیے طلب کیا تھا اور آپ نے اس کو کورا جواب دے دیا تھا؟

ابو وداعہ نے کہا: جی ہاں بہتر ہے۔

حضرت سعید بن مسیّب نے وہیں (موجود حاضرین کے سامنے) اللہ تبارک و تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی، اس کے پیارے رسول ﷺ پر سلام پڑھا اور دو درہم حق مہر پر ابو وداعہ کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا۔

اس غیر متوقع اور ناگہانی مسرت کی وجہ سے ابو وداعہ کے پاؤں زمین پر اور سر

آسمان پر جا پہنچا۔ وہ مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔ وہ دنیا جو اسے اندھیر نظر آتی تھی، روشن ہوگئی۔ بھیانک مستقبل، تابناک نظر آنے لگا۔ خوشی بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ دوڑا دوڑا گھر پہنچا تاکہ قرض پکڑ کر ولیمہ وغیرہ کا اہتمام کرے لیکن قرض پکڑے تو کس سے؟ کیونکہ لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ مفلس اور قلاش مسلمان کو زبانی مبارکباد دینا توہین خیال کرتے اور اس کی دعوت قبول کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں۔ اسے قرض دینے کی بجائے روپیہ، اٹھنی خیرات دے دیتے ہیں کہ کہیں ان کا قرض ڈوب ہی نہ جائے۔ اسی سوچ بچار میں نماز مغرب کا وقت ہوگیا۔ روٹی اور زیتون کے ساتھ روزہ افطار کرنے بیٹھے ہی تھے کہ دروازہ کھٹکنے لگا۔

ابو وداعہ نے پوچھا: کون؟

جواب ملا: سعید، سعید

ان کے دل میں ہر اس شخص کا تصور آیا جس کا نام سعید تھا سوائے سعید بن مسیّب کے۔ کیونکہ ان کو تو چالیس سال گزر گئے تھے وہ اپنے گھر سے مسجد کے علاوہ کسی جگہ دیکھے نہ گئے تھے۔ باہر آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت سعید بن مسیّب کھڑے ہیں۔ دل میں برق رفتاری سے خیال گزرا کہ شاید جلد بازی کی وجہ سے ندامت ہوئی ہو اور معاملہ فسخ کرانے آئے ہوں۔

عرض کیا: ابو محمد! پیغام بھیج دیتا تھا، میں خود حاضر ہو جاتا؟

فرمایا: نہیں تو حقدار ہے کہ ہم تیرے پاس آئیں۔

پوچھا: کیا حکم ہے؟

فرمایا: آپ جوان آدمی ہیں اور یہ بات مجھے اچھی نہیں لگتی کہ شادی کے بعد آپ اکیلے رات بسر کریں اور یہ تیری بیوی ہے۔

ابو وداعہ قد آور نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر خوش گوار حیرت میں ڈوب گئے اور بول نہ سکے۔ حضرت سعید نے اپنی بیٹی کو ان کے دروازے میں داخل کیا تو وہ مارے حیا کے گھٹنوں کے بل دروازے کو تھام کر بیٹھ گئی۔ سعید بن مسیّب خود واپس چلے گئے۔

ابو وداعہ اپنے گھر کی چھت پر چڑھے اور چلا چلا کر پڑوسیوں کو پکارنے لگے۔ پڑوسی دوڑے دوڑے آئے اور پوچھنے لگے:

کیا بات ہے؟ ابو وداعہ نے انھیں بتایا کہ آج حضرت سعید بن مسیّب نے میرے ساتھ اپنی بیٹی بیاہ دی ہے اور وہ خاموشی سے اسے میرے گھر چھوڑ گئے ہیں۔ یہ ہے ان کی بیٹی۔ بس پھر کیا تھا گھر میں عورتوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے ان کی ماں بھی بھاگی بھاگی آئی اور کہنے لگی:

''میرا تجھے دیکھنا حرام ہے اگر تو نے اسے تین دن تک ہاتھ لگایا تو! تاکہ میں اسے سجا سنوار کر اپنا شوق پورا کرلوں۔''

ابو وداعہ کہتے ہیں کہ جب میں تین دن بعد شب زفاف کے لیے اس کے پاس گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ سب سے بڑھ کر خوبصورت کتاب اللہ کی حافظہ، سنت رسول اللہ ﷺ کی عالمہ اور خاوند کے حقوق کی پاسداری کرنے والی ہے۔

ایک ماہ تک سعید بن مسیّب نہ میرے پاس آئے اور نہ میں ان کے پاس گیا۔ اس کے بعد میں ان کے حلقہ درس میں گیا اور سلام کہا۔ انہوں نے جواب تو دیا لیکن مزید کچھ نہ کہا۔ جب مجلس برخاست ہوگئی اور سب لوگ چلے گئے تو مجھ سے پوچھا۔ تمھاری بیوی کا کیا حال ہے؟۔

میں نے کہا: سبحان اللہ! ایسا کہ مجھے خوش لگے اور دشمن کو برا۔

فرمانے لگے: اگر کوئی خصلت ناپسند معلوم ہو تو لاٹھی پکڑ لینا اور اس کے کس بل

نکال دینا۔ اس کے بعد میں واپس پلٹ گیا۔

اللہ اکبر! کجا حضرت سعید بن میبّب اور کجا موجودہ دور کے سیاسی و مذہبی علمائے دین جو مسند مشیخت پر بیٹھ کر اپنی لاڈلیوں کے لیے سترھویں (۱۷) گریڈ کے پینٹ شرٹ پہننے والے کلین شیو جو افسر تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

مرید سادہ تو رو رو کے ہو گیا تائب
خدا کرے شیخ حرم کو بھی ملے توفیق

......☆......

[1] اس قصہ کا اصل مختارات من أدب العرب میں موجود ہے۔

زواج میمون[1]

دولت اسلامیہ کے نوجوان اور خوبرو چیف جسٹس شریح بن حارث کندی کو اندازہ نہ تھا کہ اس کی منگیتر حسین وجمیل ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کی سلیقہ شعار اور خوش گفتار بھی ہوگی۔ وہ تو اس کے حسن و جمال کی شہرت سن کر اس کے والدین کو نکاح کا پیغام بھجوا چکے تھے۔

زینب کے والدین کے لیے پیغامِ نکاح بڑے اعزاز کی بات تھی کیونکہ ان کی بیٹی کا رشتہ طلب کرنے والی شخصیت کوئی معمولی ہستی نہ تھی بلکہ انھیں حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ اقضی العرب قرار دے چکے تھے اور ان کی اعلیٰ درجے کی فہم و فراست کی وجہ سے انھیں مملکت کا چیف جسٹس بنا لیا گیا تھا۔ چنانچہ زینب کے والدین نے اُس کی رضا مندی سے ان کی درخواست برضا ورغبت قبول کر کے حق مہر کی وصولی کے بعد تقریب نکاح کی تاریخ مقرر کر لی۔ اگرچہ یہ تاریخ ہفتے عشرے سے زیادہ نہ تھی لیکن قاضی شریح کے لیے یہ دن مہینوں اور سالوں کی طرح طویل تھے۔ چنانچہ تقریب نکاح کے بعد یہ سلیقہ شعار، ملنسار اور خوش گفتار خاتون اپنی ہم جولیوں اور باندیوں کے درمیان اس شان سے چلنے لگی جیسے کوئی ملکہ ''گارڈ آف آنر'' کا معائنہ کر رہی ہو۔ قبیلے کی خواتین کا استقبالی جلوس اس کی راہ میں نظریں بچھا رہا تھا اور وہ ان کے درمیان یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے نیلگوں آسمان پر روشن ستاروں کے جھرمٹ میں چودھویں کا چاند ہو۔ جونہی وہ اپنی شایان شان حجلہ عروسی

میں داخل ہوئی تو اس کی معطر فضاؤں سے بے خود ہوگئی اور پلنگ پر بیٹھ کر ستانے لگی۔ ہمجولیاں اور باندیاں دائیں بائیں بیٹھ کر اس کا دل بہلانے لگیں۔ اس کی خوش قسمتی پر تبصرے کرنے لگیں کہ زہے قسمت مور اور مورنی کا یہ جوڑا کیا خوب نظر آئے گا۔ شوہر چیف جسٹس ہے تو بیوی بھی چودھویں کا چاند نظر آ رہی ہے۔ چند گھڑیوں بعد انھیں حکم ملا کہ دلہا تشریف لا رہے ہیں اس لیے کمرہ خالی کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ اٹھ کر اپنے گھروں کو روانہ ہوگئیں اور یہ اپنے آپ کو آنے والے لمحات کے لیے تیار کرنے لگی۔

جب قاضی شریح کمرہ عروسی میں داخل ہوئے تو پندرہ بیس برس کے سن وسال کی اس حور تمثال کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ چند گھڑیاں تو وہ اس سرو قامت دلربا کے جمال بے مثال اور حسنِ باکمال کا مشاہدہ کرتے رہے۔ کبھی صبح جبیں دیکھتے کبھی چشم سرگیں، کبھی پنجہ نگاریں اور کبھی ساعد سیمیں۔ کبھی گردن بلوریں اور کبھی گیسوئے عنبریں، کبھی پلک ہائے دراز تو کبھی شمع رخسار۔ المختصر وہ جوں جوں نظریں گھماتے ایک سے بڑھ کر ایک وصفِ جمال دیکھتے جاتے۔ جی میں آیا کہ جب تک میں اس نعمت پر شکرانے کے طور پر دو رکعت نفل ادا نہ کرلوں اس وقت تک اسے ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ فوراً واپس گئے اور وضو کر کے مصلّٰی پر آن کھڑے ہوئے۔ وہ دوشیزہ جس قدر خوبصورت اور حسین وجمیل تھی اسی قدر خوب سیرت اور فہیم وعقیل بھی تھی۔ جب اس نے اپنے شوہر کو مصلّٰی پر کھڑے دیکھا تو فوراً وضو کر کے وہ بھی اُن کے پیچھے نوافل ادا کرنے لگی۔ نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کرنے کے بعد جب قاضی شریح اس کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ گویا ہوئی:

اے ابوامیہ! ذرا اطمینان سے تشریف رکھیے اور پہلے میری بات سن لیجیے۔ میں اوّل تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتی ہوں، اس سے مدد مانگتی ہوں، اس سے مغفرت

کا سوال کرتی ہوں اور نفس امارہ کی شرارتوں سے اس کی پناہ چاہتی ہوں۔ اس سے اپنی خطاؤں اور کوتاہیوں سے درگزر کرنے کا سوال کرتی ہوں اور اس بات کی گواہی دیتی ہوں کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر اَن گنت درود وسلام نازل فرمائے۔

سنیئے میں نو وارد خاتون ہوں اور مجھے آپ کی پسند اور ناپسند کا کچھ پتہ نہیں لہٰذا آپ مجھے اپنی پسند اور ناپسند کے متعلق بتا دیں تا کہ میں وہ کام کروں جو آپ کو پسند ہوں اور ان سے بچوں جو آپ کو ناپسند ہوں۔

دیکھیے آپ کی برادری میں بھی خواتین موجود تھیں جو آپ کے نکاح میں آ سکتی تھیں اور میری برادری میں بھی مرد موجود تھے جو میرا جوڑ تھے، لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہے وہ ہو کر رہتا ہے اس لیے اگر میں آپ کو پسند ہوں تو مجھے اچھائی کے ساتھ اپنے پاس رکھئے ورنہ مجھے احسان کے ساتھ رخصت کر دیجیے۔ میری بات ختم ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو خوش وخرام رکھے اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائے۔ اب آپ مجھے اپنی ترجیحات سے آگاہ فرمائیں میں غور سے آپ کی باتیں سنوں گی۔ (ان شاء اللہ)''

قاضی شریح تو اس کے بے مثال حسن و جمال پر فدا ہو رہے تھے، اس کی گفتگوئے شیریں اور لحن انگیں نے انھیں مزید مست کر دیا۔ اس دوران ان کے کان تو اس کی گفتگوئے شیریں سن رہے تھے لیکن دل میں جذبات کا تلاطم برپا تھا۔ محبت کی شیریں لہریں بار بار نہاں خانہ دل سے اٹھتیں اور پورے بدن کو مست کر دیتیں۔

قاضی شریح نے اپنے جذبات پر کنٹرول کر کے نہایت اطمینان سے جواب دیا: اے سعادت مند خاتون! عقل و دانش سے بھرپور باتیں جو تم نے اس موقع پر کہی ہیں، اگر تو ان پر پوری اتری تو فبہا ورنہ یہ تم پر حجت ہوں گی۔

سنیئے ! اگر تمہیں میرے ساتھ زندگی بسر کرنا گوارا ہو تو میری کوتاہیوں پر پردہ پوشی کرنا اگر کوئی خوبی نظر آئے تو اسے علی الاعلان بیان کرنا۔ فلاں اور فلاں قبیلے کے لوگ برے ہیں، انھیں میرے گھر میں گھسنے نہ دینا۔ فلاں اور فلاں قبیلے کے فلاں فلاں آدمی اچھے ہیں انھیں ہمارے ہاں آنے کی اجازت ہے انھیں نہ روکنا۔''

''جناب !اگر میرے ماں باپ اور بہن بھائی یہاں میرے پاس آئیں تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟ (مہہ جبیں گویا ہوئی۔)

انھیں آنے کی اجازت ہے، لیکن ان کا یہاں تین دن سے زیادہ ٹھہرنا مجھ پر گراں گزرے گا۔ (قاضی شریح نے وضاحت کی۔)

اتنی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے اس کے ساتھ زندگی کی پرلطف رات گزاری اور ساری زندگی کوئی ایسی بات نہ دیکھی جو ناراضگی کا باعث ہو۔ عرصہ بیس سال کے دوران صرف ایک مرتبہ اس پر ناراض ہوئے، لیکن اس وقت بھی خود آپ ہی ناحق پر تھے۔ چنانچہ یہ کہا کرتے تھے۔

رَأَیْتُ النَّاسَ یَضْرِبُوْنَ نِسَاءَ هُمْ ۔۔۔ وَ شَلَّتْ یَمِیْنِیْ حِیْنَ اَضْرِبُ زَیْنَبَا

زَیْنَبُ شَمْسٌ وَالنِّسَاءُ کَوَاکِبٌ ۔۔۔ اِذَا طَلَعَتْ لَمْ تَبْقِ مِنْهُنَّ کَوْکَبَا

''میں لوگوں کو دیکھتا رہتا ہوں کہ وہ اپنی بیویوں کو مارتے پیٹتے ہیں۔
جس دن میں زینب کو مارنے کا ارادہ کروں تو خدا کرے میرا داہنا ہاتھ
شل ہو جائے۔ زینب سورج ہے اور دیگر عورتیں ستارے جب سورج
طلوع ہوتا ہے تو ستارے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔''

حضرت نبی کریم ﷺ نے ایسی وفادار بیویوں کے جنتی ہونے کی بشارت دی ہے اور فرمایا:

((اَلنَّبِیُّ فِی الْجَنَّةِ وَالصِّدِّیْقُ فِی الْجَنَّةِ وَالشَّهِیْدُ فِی الْجَنَّةِ

وَالْمَوْلُوْدُ فِي الْجَنَّةِ وَالْمَرأةُ فِي الْجَنَّةِ الَّتِيْ اِذَا غَضَبَتْ وَضَعَتْ يَدَهَا عَلٰى يَدِ زَوْجِهَا وَ قَالَتْ لَا اَذُوْقُ غَمْضًا حَتّٰى تَرْضٰى))

”نبی جنت میں، صدیق بھی جنت میں، شہید بھی جنت میں، (نابالغ) بچہ بھی جنت میں اور وہ عورت بھی جنت میں ہے جو ناراض ہو جائے تو اپنے خاوند کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دے اور کہے میں اس وقت کھاؤں گی نہ پیوں گی جب تک تو مجھ پر راضی نہ ہو جائے۔“

......☆......

[1] اس قصے کا اصل اعلام النبلاء امام ذہبی میں ہے۔

امیر المؤمنین کی فراستِ مؤمنانہ

جونہی یہ خوش رنگ اور فولاد بدن نوجوان دربار خلافت میں پیش ہوا تو حاضرین مجلس اس کے دلکش گورے بدن کا غور سے مشاہدہ کرنے لگے۔ اس جواں سال کا قدرے بڑا سر، خوبصورت چوڑی پیشانی اور اس پر لٹکے ہوئے خم دار سیاہ بال، ہلکی باریک بھویں، دراز پلکیں، سرگیں آنکھیں، خوشنما رخسار، نازک ہونٹ اور اولوں جیسے شفاف دندان اور خوشنما دبلا پیٹ اور چوڑا سینہ اور چاند سے بڑھ کر حسین چہرہ دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ حاضرین اسے دیکھتے اور بار بار دیکھتے تھکتے نہ تھے، اسے دیکھ کر امیر المؤمنین عمر فاروقؓ کو یقین آ گیا کہ واقعتاً یہی وہ نوجوان ہے، جس کا جمال مقناطیس کی طرح راہ چلتی خواتین اور گھر بیٹھی دوشیزاؤں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور وہ رات کی تاریکیوں میں جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے حسن کے گیت گا رہی ہیں۔ آپ نے خواتین کو اس کے دلربا حسن کے فتنے سے بچانے کے لئے اس کا سر مونڈنے کا حکم دے دیا۔

اس بے چارے کو بارگاہ خلافت کا حکم ٹالنے کا یارا نہ تھا اس لئے یہ حجام کے آگے بیٹھ گیا اور اپنا سر منڈانے لگا جب وہ سر منڈوا چکا تو اس کی پیشانی یوں نمودار ہوئی کہ گویا وہ چاند کا ٹکڑا ہو اور وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آنے لگا یہ دیکھ کر آپ نے دوسرا حکم جاری کیا کہ اس کے سر پر امہ پہنایا جائے۔ چنانچہ وہ عمامہ پہن کر مزید خوبصورت نظر آنے لگا جب وہ مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کے لئے جاتا تو راہ چلتی خواتین کی نگاہیں اس کی سرگیں آنکھوں پر مرکوز ہونے لگیں اور وہ اسے گلی

کوچوں میں دیکھ کر مبہوت رہ جاتیں، یہ دیکھ کر امیر المؤمنین نے حکم دیا کہ اے نوجوان تم اس شہر میں نہ رہو اور بصرہ چلے جاؤ اس نے وجہ پوچھی تو آپ نے صرف اتنا ہی جواب دیا کہ یہ میرا حکم ہے اور مزید کچھ نہ بتایا اس بے چارے نے بارگاہ خلافت کے حکم کے سامنے سر تسلیم تو خم کر دیا لیکن اسے سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا گیا جب اس نے امیر المؤمنین کے کسی ہم نشین سے اس کارروائی کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ معاملہ دراصل یہ ہے کہ گذشتہ رات جب دارالخلافہ کی رعایا میٹھی میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔

تو امیر المؤمنین حسب معمول دارالخلافہ کی گلی کوچوں کا گشت کر رہے تھے کہ نصف شب کے قریب ایک دروازے پر سے ان کا گذر ہوا تو ان کے کانوں میں ایک خاتون کی آواز پڑی جو بڑی پُرسوز آواز سے شعروں میں اپنی آرزو کا اظہار کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی:

هَلْ مِنْ سَبِيلٍ إِلىٰ خَمرٍ فَأَشْرَبُهَا   وَهَل مِن سَبِيلٍ إِلىٰ نَصرِ بْنِ الْحَجَّاجِ

إِلىٰ فَتًى مَاجِدِ الأعْرَاقِ مُقْتَبلٍ   سَهْلِ الْمُحَيَّا كَرِيمٍ غَيرَ مِلْجَاجِ

سَامِي الْمُوَاطِنِ مِن بَهْزٍ لَهُ نَهَلٌ   تُضِئُ صُورَتُهُ لِلْحَالِكِ الدَّاجِ

”بھلا کوئی صورت بن سکتی ہے کہ میں شراب پی سکوں اور بھلا کوئی راہ نکل سکتی ہے کہ میں نصر بن حجاج کے پاس پہنچ جاؤں۔“

”اس نوجوان کے پاس پہنچ جاؤں جو شریف النسل ہے، نوخیز ہے خوبرو ہے، عزت دار ہے اور ضدی بھی نہیں ہے۔“

”وہ بلند مجلسوں والا ہے، ہمسروں کو واپس دھکیل دینے والے قبیلے سے ہے، قابل دید جوانی میں قدم رکھ چکا ہے، اس کا چاند کا سا مکھڑا تاریک رات کو جگمگا دیتا ہے۔“

جونہی آپ کے کانوں میں یہ اشعار پڑے تو فرمایا: اچھا! میرے ہاں اس شہر میں

ایسا نوجوان بھی جس کے حسن و جمال کا تذکرہ، نوجوان خواتین اپنے پردوں میں بھی کر رہی ہیں۔ تو انہوں نے فوراً حکم دیا کہ اس نوجوان کو میرے سامنے لاؤ۔

تو ان کے حکم سے آپ کو یہاں بلایا گیا ہے۔ جب حاضرین نے آپ کے سرو جیسیقد اور مضبوط کاٹھ اور خوبصورت چہرے کو دیکھا تو مان گئے کہ واقعی یہ ایسا نوجوان ہے کہ اگر اس کی خوبصورتی کو مصنوعی طریقے سے کم نہ کیا گیا تو خواتین کے بہک جانے کا خطرہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خیال میں آپ کی خوبصورتی کم کرنی چاہی تو آپ پہلے سے بھی بڑھ کر خوبصورت نظر آنے لگے اور انہیں حساس رپورٹیں ملنے لگیں اور وہ سوچنے لگے کہ اگر اس پاکیزہ دل نوجوان کو یہاں رہنے دیا گیا تو یہ کسی دن کسی کے تیر نگاہ کا شکار ہو جائے گا۔ اس لئے انہوں نے آپ کو بصرہ بھیجنے اور وہاں بسانے کا پروگرام بنایا ہے۔ لہٰذا اللہ کا نام لیجئے اور رخت سفر باندھ لیجئے۔ امیر المؤمنین آپ کو بصرہ بھیجنے کا عزم مصمم کر چکے ہیں اور وہ اس ارادے سے ٹلنے والے نہیں۔

حضرت حجاج سلمیؓ کا یہ خوبصورت اور حسین و شکیل بیٹا (نصر بن حجاج) اپنی بیوہ ماں کا بڑا خدمتگار اور اس کی آنکھوں کا تارا تھا یہ جب کبھی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا اس کی آنکھوں میں جہاں اندھیر ہو جاتا اور کھانا پینا بھول جاتی اور اس کے متعلق موہوم خطرات میں گھر جاتی اور جونہی یہ اس کے سامنے آجاتا تو اس کے لئے جہاں روشن ہو جاتا اسے مدینہ چھوڑ کر بصرہ میں جابستا گوارا تو نہ تھا لیکن امیر المؤمنین کے حکم کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی اس بے چارے نے اپنا دل مضبوط کر کے امیر المؤمنین سے پوچھا بھی کہ امیر المؤمنین میرے خوبصورت ہونے اور خواتین کے میری طرف دیکھنے میں میرے کسی طرح کے قول و فعل کا دخل ہو تو بتائیے لیکن آپ نے کوئی جواب نہ دیا اور فرمایا:

"اے نوجوان، یہ میرا انتظامی حکم ہے جو حتمی ہے۔"

امیر المؤمنین نے بصرہ کے گورنر کو اسے بصرہ میں گھر مہیا کرنے اور گذر بسر کے

لئے جاگیر الاٹ کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ چنانچہ اس نوجوان نے اپنی پیاری والدہ کو اللہ اور پھر اپنے بھائیوں کے سپرد کیا اور خود اونٹ پر سوار ہو کر طویل و عریض صحراؤں اور بلند و بالا پہاڑوں کے ذروں کو عبور کرنے لگا۔ اور کئی دنوں کی صعوبت سفر برداشت کرنے کے بعد بصرہ پہنچ گیا۔

ادھر جب اس شادی شدہ خاتون کو امیر المؤمنین کے اس اقدام کا علم ہوا تو وہ اپنے انجام سے ڈر گئی کہ کہیں اب میری باری نہ آ جائے تو اس نے چپکے سے درج ذیل اشعار لکھ کر کسی کے ہاتھوں آپ کی طرف بھجوا دیئے۔

قُلْ لِلامَامِ الَّذِی تُخْشٰی بَوَادِرُهٗ — مَالِي وَلِلْخَمرِ اَوْ نَصْرِ بنِ الْحَجَّاجِ

إِنِّی مُنِیبٌ أَبَا حَفْصٍ بِغَیرِهِمَا — شُربَ الْحَلِیبِ وَ طَرفٍ فَاتِرٍ سَاجِ

إِنَّ الْهَوٰی زَمَّهٗ التَّقوٰی فَحَبَّسَهٗ — حَتّٰی أَقَرَّ بِالْجَامِ وَ إِسْرَاجِ

مَا مُنیَةٌ لَمْ أَرُبْ فِیهَا بِضَائِرَةٍ — وَالنَّاس مِن صَادِقٍ فِیهَا وَمِن دَاجِ

تَجْعَلِ الظَّنَّ حَقًّا أَو تَیَقُّنَهٗ — أَنَّ السَّبِیلَ سَبِیلَ الخَائِفِ الرَّاجِ

”اس امیر المؤمنین سے گذارش کر دیجئے جس کے ناگہانی غصہ کے تصور سے بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے کہ میرا شراب نوشی یا نصر بن حجاج سلمی سے کوئی واسطہ نہیں۔“

”میں ابو حفص (عمر فاروقؓ) سے معافی مانگتی ہوں اور انہیں بتانا چاہتی ہوں کہ مجھے نصر بن حجاج اور شراب کے بدلے تازہ دودھ اور نیچے دیکھنے والی آنکھ میسر ہے۔ اس لئے مجھے شراب پینے اور نصر بن حجاج کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”میرے عشق کو دوزخ کے خوف نے لگام دے رکھی ہے اور اب وہ اس لگام پر مطمئن و پرسکون ہو گیا ہے۔“

”جس امنگ اور آرزو کو پورا کرنے کا اہتمام نہ کیا گیا ہو اسے جرم قرار

نہیں دیا جاسکتا اور پھر لوگ اپنی تمناؤں میں سچے بھی ہوتے ہیں اور سیاہ کار بھی۔"

"لہٰذا آپ غیر یقینی بات کو یقینی بات کا درجہ نہ دیں کیونکہ گناہ کی معافی مانگنے والے کی راہ ہی صحیح راہ ہے۔"

جب امیرالمؤمنین نے یہ اشعار ملاحظہ کیئے تو رو دیئے اور فرمایا: سب تعریفوں کے لائق اللہ مالک الملک کی ذات ہے جس کے خوف نے اس خاتون کو ناجائز طریقے سے اپنے نفس کی خواہش پوری کرنے سے روک رکھا ہے۔

نصر بن حجاج سلمی کے بصرہ میں رہائش پذیر ہونے کے بعد اس کی والدہ اس کی جدائی کے غم میں نڈھال ہوگئی کیونکہ اس کے اس اطاعت شعار بیٹے نے اسے ضروریات زندگی سے مالا مال کر رکھا تھا اور اپنے والد حجاج کی وفات کے بعد اسے کسی چیز کی کمی نہ آنے دی تھی اب اسے کمی تھی تو صرف اپنے لخت جگر کے دیدار کی کمی تھی جو کسی جرم کے بغیر ہی مدینہ بدر کر دیا گیا تھا، وہ بڑھاپے میں مدینہ منورہ کو چھوڑنا بھی نہ چاہتی تھی اور نہ ہی اس میں بیٹے کو بزور بازو واپس لانے کی ہمت تھی۔

البتہ ایک دن اس نے جرأت کر کے امیرالمؤمنین کو مسجد جاتے ہوئے راستے میں جا لیا اور کہا۔ اے امیرالمؤمنین میں روزِ قیامت اللہ کے سامنے دو زانو ہو کر آپ کے ساتھ جھگڑوں گی، آپ تو اپنے عاصم اور عبداللہ کے درمیان سوتے ہیں جبکہ میرے اور میرے نور نظر کے درمیان وسیع و عریض صحراء اور سنگلاخ کوہستان موجود ہیں۔

آپ نے فرمایا: اے نصر بن حجاجؒ کی ماں، نوجوان پردہ نشین خواتین اپنے پردوں میں عاصم اور عبداللہ کے گیت نہیں گاتیں (جبکہ انہوں نے تیرے صاحبزادے کے حسن و جمال کے گیت اپنے پردوں میں بھی گانے شروع کر دیئے ہیں) یہ سن کر بوڑھی خاتون صبر کے گھونٹ پیتی ہوئی واپس مڑ گئی اور امیرالمؤمنین نماز پڑھانے میں مشغول ہو گئے۔

اس عرصے میں نصر بن حجاج سلمی کو بوڑھی والدہ اور مدینہ منورہ کے ساتھیوں کی یاد ستانے لگی چنانچہ اس نے امیر المؤمنین سے مدینہ منورہ میں حاضری کی اجازت طلب کرنے کا پروگرام بنایا۔ اور اپنی درخواست کو اشعار کی صورت میں لکھنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے ان دنوں حضرت عتبہ بن غزوانؓ امیر المؤمنین کا کوئی پیغام لے کر بصرہ تشریف لے آئے اور وہ اپنا کام مکمل کر کے واپس مدینہ روانہ ہونے لگے تو ان کے منادی نے آواز لگائی کہ جو کوئی مدینہ منورہ ڈاک بھیجنا چاہے وہ جلد از جلد اپنی ڈاک ہمارے حوالے کر دے، نصر بن حجاج نے اس موقعہ کو غنیمت جان کر اپنی درخواست لفافے میں بند کر کے ان کے حوالے کر دی چند دنوں بعد وہ ڈاک مدینہ منورہ پہنچ گئی جب امیر المؤمنین نے اپنی ڈاک کھولی تو اس میں سلام مسنون کے بعد بے قصور جلاوطن نصر بن حجاج کے درج ذیل اشعار نظر پڑے:

لَعَمْرِی لَئِن سَیَّرتَنِی وَ حَرَّمْتَنِی ۔۔۔ فَمَا نِلتَ مِن عِرضِی عَلَیکَ حَرَامُ

وَ مَا لِی ذَنْبٌ غَیرَ ظَنٍّ ظَننتَهٗ ۔۔۔ وَفِی بَعضِ تَصدِیقِ الظُّنُونِ آثَامُ

أن غَنَّتِ الذَلْفَاءُ یَومًا بِمُنْیَةٍ ۔۔۔ و بَعضُ أمَانِیِّ النِّسَاءِ غَرَامُ

ظَنَنتَ لِیَ الأمْرَ الَّذِی لَیس بعده ۔۔۔ بَقَاءٌ فَمَا لِی فِی النَّدِیِّ کَلَامُ

فَأصبَحتُ مَنفِیًّا عِلٰی غَیر رِیبَةٍ ۔۔۔ و قَد کَان لِی بِمَکتَینِ مقامُ

وَ یَمنَعُنِی مِمَّا تَقُول تَکَرُّمِی ۔۔۔ وَآبَاءُ صِدقِ سَابِقُونَ کِرَامُ

وَیَمنَعُهَا مِمَّا تَقُول صَلَاتُهَا ۔۔۔ وَحَالٌ لَهَا فِی قَومِهَا وَصِیَامُ

فَهَا تَانِ حَالَانَا فَهَل أنتَ رَاجِعِی ۔۔۔ فَقَد جُبَّ مِنَّا غَارِبٌ وَ سَنَامُ

’’اے امیر المؤمنین آپ نے جو مجھے بے توقیر کر کے مدینہ منورہ اور دوستوں میں رہنے سے محروم کر دیا ہے ایسا کرنا آپ کے لئے جائز نہ تھا۔‘‘

’’میرے متعلق آپ کا تصور محض گمان ہی ہے حقیقت یہ ہے کہ میں بے

قصور ہوں اور بعض گمانوں کی تصدیق کرنا بھی گناہ ہے۔"

"محض اس بنا پر کہ ستواں ناک والی ایک دن اپنی آرزو کا اظہار کر بیٹھی حالانکہ عورتوں کی بعض خواہشات محض تاوان تصور کی جاتی ہیں۔"

"آپ نے میرے متعلق ایسی بات متصور کر لی جس کے بعد میں کسی مجلس میں بات کرنے کے قابل نہ رہا۔"

"اور میں بغیر کسی تہمت کے جلاوطن کر دیا گیا حالانکہ میرا حرمین میں قیام ہوا کرتا تھا۔"

"اور مجھے میرا مرتبہ و مقام اس کی آرزو کی تکمیل کرنے سے روکتا ہے اور پھر میرے بزرگ کس قدر سچے عزت دار تھے۔"

"اور اسے اس کی نماز اور روزہ اور قومی شرافت بُری آرزو کی تکمیل سے روکتی ہے۔"

"ہماری یہ دونوں حالتیں ہمارے کسی طرح کے ممکنہ ارتکاب گناہ میں حائل ہیں تو کیا آپ مجھے لوٹنے کی اجازت دیتے ہیں۔"

امیر المؤمنین نے یہ پڑھ کر فرمایا کہ میری امارت میں تو ایسا نہیں ہو سکتا۔

امیر المؤمنین پر اللہ رحم فرمائے آپ اپنے خیال اور تصوّر میں بالکل سچے تھے کہ یہ نوجوان بھی کسی نہ کسی دن کسی نیلم پری کی زلف گرہ گیر کا شکار ہو سکتا ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب یہ نوجوان مستقل طور پر بصرہ میں رہنے لگا تو اس نے شہر کے عامل (ڈپٹی کمشنر) مجاشع بن مسعود سلمی کے دفتر میں آنا جانا شروع کر دیا اس نے اسے اپنی برادری کا برخوردار سمجھ کر اپنے گھر لے جانا شروع کر دیا چنانچہ یہ کچھ عرصہ تک ان کے ساتھ اس کے گھر میں جاتا اور ان کے ساتھ واپس آ جاتا اسی دوران ان کی بیوی خضیراء جو اپنے دور کی خوبصورت عورت تھی، اس خوبصورت نوجوان پر نظر رکھنے لگی اور اس پر انتہا درجے کی نوازشیں کرنے لگی جس کی وجہ سے اس کا دل

بھی پگھل گیا اور اس نے اسے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے زمین پر لکھ دیا کہ مجھے تجھ سے اس قدر محبت ہے کہ اگر وہ تیرے اوپر ہو تو وہ تجھ پر سایہ فگن ہو اگر نیچے ہو تو تجھے ہتھیلیوں پر اٹھا لے۔

یہ تحریر پڑھ کر نوجوان خاتون بے ساختہ پکار اٹھی کہ میں بھی اللہ کی قسم۔ نوجوان خاتون کے یہ الفاظ اس کے شوہر نے سن لئے تو اس نے اس سے پوچھا۔ تیرے (میں بھی اللہ کی قسم) کہنے کا کیا مطلب؟ اس نے کہاہ کہ نصر نے ہماری اونٹنی کو دیکھ کر اشارتاً کہا ہے کہ یہ اونٹنی کس قدر خوبصورت ہے!

مجاشع نے کہا کہ تیرا یہ کہنا کہ (اللہ کی قسم میں بھی) اس بات کا جواب نہیں ہے مجھے سچ سچ بتا کہ تو نے ایسا کیوں کہا؟

اس نے کہا۔ سچ پوچھتے ہو تو وہ یہ ہے کہ اس نے کہا ہے کہ تمہارا گھر کتنا خوبصورت ہے۔ مجاشع نے کہا کہ یہ بات بھی غلط ہے۔ تیرا کلام دراصل کسی بات کا جواب ہے اور تو مجھے جان بوجھ کر وہ بات نہیں بتا رہی اسی دوران اس کی نگاہ زمین پر لکھی ہوئی عبارت پر پڑی تو اس کے دل میں خیال آیا کہ شاید میری بیوی کے الفاظ اس تحریر کا جواب ہی ہوں، اس نے اس تحریر پر ایک بڑا سا مٹی کا برتن الٹا کر کے رکھوا دیا اور نصر کے جانے کے بعد اسے اپنے سیکرٹری سے پڑھوایا تو پتہ چل گیا کہ خضیراء کا کلام دراصل اسی بات کا جواب ہے۔

جب نصر بن حجاج ؒ کو اپنے اس معاملے کے افشاء ہونے کا علم ہوا تو وہ مارے شرم کے زمین میں گڑ گیا اور اسے اپنی اس حرکت پر اتنا افسوس ہوا کہ اسے بستر سے اٹھنے کا یارا نہ رہا اور لاغر ہو کر چوزے ہو گیا جب مجاشع بن مسعود کو اس کی حالت کا پتہ چلا تو اس نے اپنی بیوی خضیراء سے کہا کہ اب جا اور میرے بیمار برخوردار کو اپنے سینے کے سہارے بیٹھا کر اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا شاید کہ اسی طرح ہی اس کی صحت بحال ہو جائے۔ خضیراء نے یہ مطالبہ پورا کرنے سے جواب دے دیا لیکن مجاشع

بطور شوہر ہونے کے بھی اس بات پر اصرار کیا تو وہ مان گئی اور اسے کھانا کھلا کر واپس آ گئی۔ بعدازاں مجاشع نے حضرت ابوموسیٰ اشعری گورنر کوفہ سے اس بات کا تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا۔ بس اسی وجہ سے تو امیر المؤمنین نے اسے مدینہ منورہ سے بصرہ بھجوایا تھا۔ چنانچہ انہوں نے نصر بن حجاج کو بصرہ سے فارس بھجوا دیا جہاں حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ گورنر تھے۔ چنانچہ یہ وہاں سے کوچ کر کے فارس کے کسی قصبہ یا گاؤں میں آباد ہو گئے اور اسے وہاں آباد ہوئے کوئی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ گاؤں یا قصبہ کے سردار کی بیوی اس پر مر مٹنے لگی اور اسے چوری چھپے ملنے کے پیغام بھیجنے لگی جب اس بات کا علم گورنر فارس کو ہوا تو انہوں نے نصر بن حجاج سلمی کو اپنے ہاں بلایا اور اس نئے قضیے پر اپنی تشویش سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی اسے یہاں سے چلے جانے کا مشورہ دے دیا، اس نے کہا کہ اگر میں ارض اسلام میں کسی جگہ بھی نہیں رہ سکتا اور تم لوگ مجھے کہیں بھی سکون سے نہیں ٹھہرنے دیتے تو میں کہاں جاؤں! اللہ کی قسم اگر آپ نے ایسا کیا تو میں مشرکوں کی سرزمین میں رہنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ ورنہ میرا کوئی قصور بتایا جائے۔ جب حضرت عثمان بن ابی العاص نے یہ صورت حال امیر المؤمنین کو لکھ بھیجی تو انہوں نے نصر بن حجاج کو وہاں سے جلاوطن کرنے سے منع کر دیا اور حکم دیا کہ اسے گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر میں آنے جانے تک محدود کر دیا جائے اور اسے زیادہ عرصہ مسجد میں گزارنے دیا جائے تاکہ نہ یہ باہر نکلے اور نہ ہی کوئی فتنہ کھڑا ہو چنانچہ یہ نوجوان خلافت فاروقی تک فارس میں ہی جلاوطن رہا اور اس دور میں اس کی کڑی نگرانی ہوتی رہی جب امیر المؤمنین شہید ہوئے اور اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے تو یہ واپس مدینہ چلا آیا اور آزادی سے ایمان اور تقویٰ کی زندگی بسر کرنے لگا۔

......☆......

استقامت کی برکات[1]

لشکر اسلام کے یہ دونوں جانباز نہ صرف یہ کہ حسن و جمال میں بے مثال تھے، بلکہ عقل وفرزانگی اور شجاعت و مردانگی میں بھی کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ یہ میدان جنگ میں چیتے کی طرح جھپٹتے اور شیر کی طرح دشمن کو دبوچتے۔ آن کی آن میں دشمنان اسلام کے کشتوں کے پشتے لگا دیتے۔ قیصر روم کے نصرانی سپہ سالار نے جب انھیں اپنی صلیبی افواج پر عقابوں کی طرح جھپٹتے اور پلٹتے دیکھا تو دنگ رہ گیا کیونکہ یہ شہسواری، نیزہ بازی، تیر افگنی اور شمشیر زنی میں اپنی مثال آپ تھے۔

امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان کی جرأت و جسارت کی بنا پر انھیں ملک شام میں جہاد کرنے والے لشکر اسلام میں بھیج دیا تو یہ میدان کارزار میں شجاعتوں اور بسالتوں کے نئے باب رقم کرنے لگے۔ ان کی جنگی چالوں اور حربی صلاحیتوں کی وجہ سے نصرانی سپہ سالار نے اپنے کمانڈروں اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ کسی نہ کسی طرح ان دونوں بھائیوں کو زندہ پکڑ لیا جائے کیونکہ ان کی گرفتاری سے مسلمانوں کی کمر ٹوٹ جائے گی اور وہ کسی بھی معرکے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔

چنانچہ نصرانی کمانڈروں نے اپنے سپہ سالار کے فرمان کے مطابق اپنی تمام تر توجہ انھیں زندہ گرفتار کرنے پر مرکوز کر دی اور طویل جدوجہد کے بعد ایک کو قتل کرنے اور دوسرے کو زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

نصرانی سپہ سالار نے جب اس جانباز کو دیکھا تو اس کے حسن و جمال اور عزم و

استقلال کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ کیونکہ اس نے ان کے متعلق جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا۔ اس کے چہرے سے شرافت اور بزرگی ٹپک رہی تھی۔ وہ باوجود بلا کا بہادر اور شجاع ہونے کے فرشتوں کی طرح معصوم نظر آ رہا تھا۔

اس نے اس کی گرفتاری سے قبل سن رکھا تھا کہ مسلمان مجاہدین کی فتوحات کا اصل راز یہ ہے کہ وہ رھبان اللیل اور فرسان النھار (یعنی رات کو عبادت گزار اور دن کو شہسوار) ہوتے ہیں۔ نہ وہ شراب پیتے ہیں، نہ زنا کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے پچھلے ان کی بیویوں کا احترام سگی ماؤں سے بڑھ کر کرتے ہیں لیکن اسے کسی مجاہد سے بالمشافہ ملاقات کا موقع پہلی دفعہ ہاتھ آیا تھا۔

چنانچہ جب اس نے اس جانباز کے اوصاف کمال دیکھے تو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ اس جیسے عابد وزاہد، خوبرو اور حسین مجاہد کو قتل کرنے کی بجائے اگر نصرانی بنا لیا جائے تو یہ بڑا نامور راہب اور سینٹ ثابت ہوگا۔ ہمارے مذہب کے لیے تقویت کا باعث بنے گا۔ جو شخص یہ ثواب کا کام کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اسے سلطنت کی طرف سے گرانقدر انعام دیا جائے گا۔

ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق جب دربار کے پادری نے ثواب اور انعام کا اعلان سنا تو اس کے منہ میں پانی آ گیا۔ اس نے بادشاہ سے درخواست کی: ''اس مسلمان جانباز کو میرے سپرد کر دیا جائے۔ میں چند دنوں میں اسے نصرانی بنا لینے کی ضمانت دیتا ہوں۔''

جب بادشاہ نے اس سے اس پروگرام کی تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا کہ بادشاہ سلامت یہ عرب لوگ عورتوں کے رسیا اور شوقین ہوتے ہیں۔ میرے پاس ایک نہایت حسین وجمیل بیٹی ہے۔ جب میں نے وہ اس کے سامنے کر دی تو یہ چند دنوں میں ہمارا دین قبول کر لے گا۔

بادشاہ نے جب یہ بات سنی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور اس نے اس مجاہد اسلام کو پادری کے گھر ٹھہرانے کا فرمان جاری کر دیا۔

چنانچہ پادری اس مجاہد کو خوشی خوشی اپنے گھر لے گیا اور اسے مہمان خانے میں بٹھا کر خود اندر چلا گیا۔ اپنی اٹھارہ، بیس سال کی خوبرو اور نوجوان بیٹی کو ثواب اور انعام پر آمادہ کرنے لگا، جس پر اس کی بیٹی نے مذہبی جوش وخروش سے اس فریضے کو سرانجام دینے کی حامی بھرلی۔

اس کی نوجوان بیٹی نہا دھو کر، زرق برق لباس زیب تن کر کے سر میں خوشبو، آنکھوں میں سرمہ اور گلے میں زیورات پہننے لگی۔ پادری نے اس عرصے میں شراب، کباب، پھل اور کھانا تیار کرلیا اور اپنی بیٹی کو مہمان کی ہر خواہش کی تعمیل کرنے کا حکم دے کر، دروازہ بند کیا اور خود باہر چلا گیا۔ جب لڑکی نے بن سنور کر، اس نوجوان کے آگے کھانا رکھا اور تعمیل ارشاد کے لیے حاضر باش کھڑی ہوئی، تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس مجاہد اسلام نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اس نے اپنی نگاہ نیچی کر لی اور پانی کے ساتھ وضو کر کے عبادت میں مصروف ہو گیا۔ اللہ نے اسے سریلی آواز اور خوش الحانی سے قرآن کی تلاوت کرنے کا ملکہ نصیب فرمایا تھا۔ جب اس نے میٹھی آواز سے قرآن پڑھنا شروع کیا تو اللہ نے اسے ایمان کی پختگی اور قلب کی سلامتی عطا کر دی۔ وہ حورتمثال اپنا پروگرام بھول کر، تلاوت قرآن پر اس قدر فریفتہ ہوئی کہ وہ کھلانا پلانا بھول گئی اور وہ مسلمان ہونے کا سوچنے لگی۔ جب اس حال میں ساتواں دن گزرا تو لڑکی کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ اور وہ نوجوان کے قدموں میں بیٹھ گئی اور کہنے لگی:

”تجھے تیرے دین کا واسطہ دیتی ہوں ذرا میری بات تو سن اور میری طرف دیکھ تو سہی۔“

اس نے کہا: ''اچھا بات کر میں سن رہا ہوں۔''

کہنے لگی: ''مجھے مذہب اسلام سے آگاہ کیجیے کہ وہ کیسا مذہب ہے اور اس میں داخل ہونے کا طریقہ کیا ہے؟''

مجاہد اسلام نے اس کے سامنے اسلام کی خوبیاں بیان کیں تو وہ مسلمان ہوگئی اور نماز کا طریقہ سیکھنے لگی۔ جب اس نے نماز سیکھ لی تو کہنے لگی:

بندۂ خدا بے شک میں مسلمان ہوگئی ہوں لیکن رہنا میں نے تیرے ساتھ ہی ہے۔

کیا مطلب؟ نوجوان نے گھبرا کر پوچھا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ سے نکاح کرلو۔'' لڑکی نے دل کی بات کہی۔

یہاں نکاح کیسے ہوسکتا ہے۔ نہ کوئی ولی نہ گواہ۔ جبکہ اسلام میں ولی اور گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا۔ اگر تو یہاں سے رہائی کی کوئی تدبیر کرے تو ایسا ممکن ہے۔

یہ میری ذمہ داری ہے میں یہ کام کرسکتی ہوں۔

چنانچہ اس نے اپنے باپ کو بلایا اور کہا:

اے ابا جان! یہ مجاہد اسلام مجھ پر فریفتہ ہوگیا ہے اور اس کا دل نرم ہوگیا ہے میں نے اسے نصرانیت قبول کرنے کی دعوت دی ہے لیکن اس نے یہ عذر پیش کیا ہے کہ جس شہر میں میرا بھائی قتل ہوا وہاں میں یہ کام کیسے کرسکتا ہوں۔ ہاں اگر مجھے یہاں سے نکال کر کسی اور بستی میں رکھا جائے تو میرا دل قرار پکڑے گا اور جب میرے دل سے اپنے بھائی کے قتل کا غم دور ہوگیا تو ممکن ہے کہ میں تمھارا مقصد پورا کردوں۔ ابا جان! اگر آپ مجھے اس کے ساتھ دوسرے گاؤں بھیج دیں تو میں ضمانت دیتی ہوں کہ یہ ہمارے مذہب میں داخل ہو جائے گا۔

پادری نے جب نوجوان بیٹی کی یہ بات سنی تو پھولا نہ سمایا اور بڑی تیزی سے سپہ سالار کے پاس چلا گیا اور عرض کی:

محترم! امید بر آئی ہے۔ لیکن اتنی سی کسر رہ گئی ہے کہ دو دن صبر کر لیا جائے اور انھیں دوسرے گاؤں میں بھیج دیا جائے۔

سپہ سالار نے جب پادری کی زبانی تفصیل سنی تو بہت خوش ہوا۔ وہ اپنے مذہب کی ترویج و اشاعت کا بڑا متمنی تھا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ کاش دین نصرانیت دنیا کا بڑا مذہب بن جائے۔

چنانچہ یہ جوڑا قریبی گاؤں میں چلا گیا، لیکن کیا مجال کہ اس نے دن کی روشنی یا رات کی تاریکی میں اسے ہاتھ بھی لگایا ہو۔ تنہائی میں غیر محرم مرد اور عورت کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے لیکن مسلسل جہاد کرتے اور جان ہتھیلی پر رکھنے کی وجہ سے نوجوان کے ایمان میں اتنی قوت پیدا ہو چکی تھی کہ شیطان کو حملہ کرنے کی جرأت نہ رہی۔

جب تیسرے دن کی رات ہوئی تو یہ دونوں عشاء کے بعد وہاں سے نکل پڑے اور ساری رات چلتے رہے۔ جب صبح صادق کا وقت ہوا تو دونوں راستے سے الگ ہو کر نماز کی تیاری کرنے لگے۔

ابھی یہ نماز میں ہی تھے کہ یکا یک گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ نوجوان نے کہا: بندی خدا ہم پکڑے گئے یہ تو نصاریٰ کا دستہ ہے اور ہم پر چھاپہ مارنا چاہتا ہے۔ ساری رات چلتے چلتے ہمارا گھوڑا بھی تھک گیا ہے۔

وہ کہنے لگی: ''افسوس تم ڈر رہے ہو اور خوفزدہ ہو گئے؟

اس نے جواب دیا: ''ہاں'' وہ کہنے لگی:

وہ بات کہاں گئی جو آپ نے مجھے اپنے رب کی قدرت کاملہ کے متعلق بیان کی

تھی؟ آؤ ہم اللہ کے سامنے گریہ وزاری کریں۔ شاید وہ ہماری سن لے اور ہماری مدد فرمائے۔

اس نے کہا: ٹھیک ہے۔

چنانچہ دونوں نے بڑی آہ وزاری اور گریہ و بکا سے دعا کرنی شروع کر دی۔ ابھی یہ دعا کر ہی رہے تھے کہ انھیں ہاتف غیبی کی آواز سنائی دی۔

"غم نہ کرو اور نہ ہی خطرہ محسوس کرو۔ یہ آوازیں ملائکہ کی ہیں جنھیں اللہ نے تمھاری معاونت کے لیے بھیجا ہے اور یہ تمھارے نکاح کی تقریب میں شامل ہوں گے۔

چنانچہ یہ اپنے گھوڑے پر چلتے رہے۔ صبح کو مدینہ پہنچ گئے۔ اس وقت امیرالمومنین نماز فجر پڑھا رہے تھے۔ آپؓ کی عادت مبارک تھی کہ سوکر جاگنے والوں اور وضو کرنے والوں کی خاطر کہ وہ جماعت سے مل سکیں پہلی رکعت کو لمبا کرتے تھے۔ اس عرصے میں مسجد بھر جاتی۔ دوسری رکعت ہلکی پڑھتے۔

نماز فجر ادا ہوئی تو ان کی تقریب نکاح منعقد ہوئی اور یہ سلسلہ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔

......☆......

[1] اس کا اصل مشارع الاشواق الی مصارع العشاق میں ہے۔

سہم مسموم[1]

تزکیہ واحسان کی منازل طے کرنے والا خوبرو اندلسی نوجوان، عالم شباب میں ہی قدسیوں کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ یہ نوجوان ظاہری علوم یعنی قرات و تجوید، صَرف ونحو، تفسیر وحدیث، بیان ومعانی میں نادرہ روزگار تھا، تو باطنی علوم یعنی اخلاص وتوکل، زہدوورع، عبادت وریاضت میں بھی بے مثال انسان تھا۔

ہزاروں تشنگان علوم ومعارف اس کے آستانہ علم وفضل پر حاضری دیتے اور سیراب ہوکر جاتے اور اگلے روز پھر آجاتے۔نہ اس کا چشمہ علم خشک ہوتا، نہ ان کی پیاس بجھتی، وہ علوم ومعارف کے جام پیتے رہے اور یہ پلاتا رہا۔لوگوں کو معرفت الٰہی کے جام ہائے شیریں پلانے والا یہی عابد وزاہد نوجوان اپنے کسی کام کی غرض سے کسی جگہ جانے کو تیار ہوا، تو سینکڑوں علماء وطلبا اسے الوداع کرنے کے لیے چند فرلانگ تک ساتھ ساتھ چلے گئے اور خیر وعافیت کی دعائیں دے کر واپس لوٹ آئے۔

البتہ چند شاگرد اور مریدین ساتھ روانہ ہوگئے۔جن میں حضرت شبلی بھی تھے۔

استاد اور شاگردوں کا یہ مختصر سا قافلہ سنگلاخ پہاڑوں اور بے آب وگیاہ میدانوں، بستیوں اور شہروں کے دلفریب مناظر دیکھتا ہوا، ایک ایسی بستی میں پہنچ گیا جہاں مختلف مذاہب کے لوگ آباد تھے۔یہ لوگ وضو کے لیے ایک کنوئیں پر گئے جہاں چند عیسائی دوشیزائیں پانی بھرنے آئی ہوئی تھیں۔ان میں ایک حور تمثال، پندرہ بیس برس کے سن وسال، اپنی ہم جولیوں میں یوں نظر پڑی جیسے ستاروں میں

چودھویں کا چاند دمک رہا ہو۔

جونہی اندلسی نوجوان کی نگاہ اس غارت گر دین وایمان کے کاکل مشکیں اور صبح جبیں پر پڑی تو وہ اس کی آنکھوں کی پتلیوں کے راستے نہاں خانۂ دل میں اتر گئی۔ یہ یوں بیٹھ گئے جیسے اس کے پاؤں میں بیڑیاں لگ گئی ہوں۔ نہ وضو یاد رہا نہ نماز۔ نہ اپنی خبر اور نہ اپنے ساتھیوں ہی کی۔ یہ بے خودی کے عالم میں اس سرو قد کی چاند کی سی جبیں دیکھتے اور کبھی گردن بلوریں اور کبھی ساعد سیمیں اور کبھی پنجہ نگاریں اور کبھی اولوں جیسے دانت اور کبھی سینہ بے کینہ۔

جوں جوں نظر دوڑاتے، ایک سے ایک بڑھ کر وصفِ حسن و جمال نظر آتا، جو آتش شوق کو سلگانے لگتا اور یہ کھانا پینا بھی بھول گئے۔

هَنِيئًا لِأَرْبَابِ النَّعِيمِ نَعِيمُهَا وَلِلْعَاشِقِ الْمِسْكِينِ مَا يَتَجَرَّع

آنحضور رسول مقبول ﷺ کا فرمان ہے:

((اَلنَّظْرَةُ الْاُولٰى لَكَ وَالثَّانِيَةُ عَلَيْكَ))

لیکن یہ پہلی ہی نظر میں اس کے تیر نگاہ کا شکار ہو گئے۔ اس کے غمزہ ابرو نے انھیں تڑپا کر رکھ دیا اور دل نقد ہار بیٹھے۔ ساتھیوں نے دیکھا کہ اندلسی نوجوان زاہد کی نگاہیں اس پری پیکر نازنین کا پیچھا کر رہی ہیں، تھوڑی دیر بعد وہ سرد قامت، خرام رفتار اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھر کو روانہ ہونے لگی اور یہ نوجوان زاہد ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔

حالانکہ یہی وہ نوجوان تھا، جو اپنے وعظوں اور تقریروں کے ذریعے بڑے بڑے سنگ دل ڈاکوؤں اور سفاک مجرموں کو تڑپا دیتا تھا۔ آج خود ناوک مژگاں کے سامنے ثابت قدم نہ رہ سکا اور ڈھیر ہو گیا۔ کیونکہ تلوار سے گھائل ہونے والا انسان تو پھر بھی تڑپ اور پھڑک سکتا ہے، لیکن حسیناؤں کے غمزہ ابرو کا مارا ہوا تو پانی

بھی نہیں مانگتا اور بے جان ہو جاتا ہے، نہ شرم سے کسی کو اپنا روگ ہی بتا سکتا ہے اور اس کا علاج سوائے محبوب کے کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ نوجوان زاہد اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں جلوہ افروز ہونے والی خوبرو دوشیزہ کا اتا پتہ پوچھنے لگا۔

پتہ چلا کہ وہ اس گاؤں کے عیسائی سردار کی نوجوان لڑکی ہے جو سہیلیوں کے ہمراہ پانی لے کر گھر چلی گئی ہے۔ ''شمع در فانوس شد و پروانہ سرگردان بماند'' شاگردوں نے بہتیرا ہلایا جلایا، لیکن یہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا، کیونکہ اسے وہ آگ لگ گئی تھی جو ''لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے'' نماز کا وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ساتھیوں نے وضو کا پانی لا کر دیا اور خود بھی وضو کر کے نماز ادا کی، پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسے اس کے منصب اور مقام سے آگاہ کیا اور بدنامی سے ڈرایا، لیکن نوجوان زاہد ٹس سے مس نہ ہوا۔ سب کچھ سننے کے بعد شاگردوں اور مریدوں کو جواب دیا کہ عزیزو! میں آپ کو کیا بتاؤں کہ مجھے کیا ہو گیا ہے بس مجھے میرے حال پر چھوڑو۔ تمھارے جتن یہاں کام نہیں آ سکتے۔

چنانچہ شاگردوں اور مریدوں نے اپنے استاذ کی فہمائش پر اپنی توانائیاں صرف کرنے کے بعد واپس لوٹنے کا عزم کر لیا، تاکہ اپنی راہ تکنے والوں کو اپنے استاذ پر پڑنے والے ڈاکے سے آگاہ کر سکیں۔ جب اہل بغداد کو اپنے اعلیٰ سیرت والے خُوب صورت نوجوان استاذ کی متاع ایمان، عشق کے ہاتھوں لٹنے کی اطلاع ملی تو وہ دل پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کی ٹانگیں ان کا بوجھ اٹھانے سے جواب دینے لگیں۔

......☆......

ابلیس ملعون کی یہ عادت ہے کہ وہ پہلے تو گناہ کے کاموں کو خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے اور جب کبھی کوئی صاحب دین و ایمان مرد یا عورت اس کے جال میں

پھنس جائے تو ایسی چیخ لگاتا ہے کہ چھپ کر گناہ کرنے والے کے گناہ کی شہرت اخبارات و جرائد، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے پہاڑوں کی غاروں اور چوٹیوں، میدانی شہروں اور بستیوں میں پہنچا دیتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ مرد یا عورت کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے، بلکہ کتنے گناہ گاروں کو وطن سے بے وطن ہونا پڑتا ہے اور عزیزوں، رشتہ داروں سے بیگانگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ان حالات میں نیکوکاروں پر قیامت برپا ہو جاتی ہے اور بدکاروں کی عید بن جاتی ہے۔ وہ اپنی اور سارے جہاں کی برائیوں سے آنکھیں بند کر کے نیکوکاروں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور انھیں عدالتوں میں رسوا کرتے ہیں۔

اندلسی زاہد کی خبر، علماء وصلحاء پر بجلی بن کر گری اور وہ سوء قضاء اور شماتت اعداء سے ڈرنے لگے۔ نوجوان استاذ کی ہدایت کی دعائیں کرنے لگے۔ غرضیکہ درس گاہوں کے اساتذہ وطلباء اور خانقاہوں کے درویش وصلحاء اپنے استاذ کی صورت حال کا چشم دید مشاہدہ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے بالآخر اس گاؤں میں پہنچ گئے، جہاں عشق کا سانپ نوجوان زاھد کے ایمان کو ڈس گیا تھا۔ وہاں سے اپنے استاذ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ ادھر جنگل میں سوروں کا ریوڑ چرا رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی یہ حواس باختہ ہو گئے اور اس انہونی پر سر پیٹنے لگے۔ گاؤں والوں سے وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ آپ کے استاد کو ہمارے سردار کی نوجوان دوشیزہ سے عشق ہو گیا ہے۔ اس نے لڑکی کے باپ سے شادی کی درخواست کی جو اس نے اس شرط پر قبول کر لی کہ ''مذہب اسلام ترک کر کے عیسائی بننا ہوگا اور تین سال ان کے سوروں کی گلہ بانی کرنا ہوگی۔'' گاؤں والوں نے بتایا کہ آپ کے استاد جو نوجوان دوشیزہ کی محبت میں پگھلے جا رہے تھے، انہوں نے یہ شرط قبول کر لی ہے اور جنگل میں عصا لے کر اس کے سوروں کی گلہ

بانی کررہے ہیں۔

چنانچہ حضرت شبلی اور ان کے رفقاء روتے ہوئے جنگل کی طرف چلنے لگے، جہاں ان کے استاذ سور چرا رہے تھے۔ انہوں نے دور سے اپنے استاذ کے سر پر صلیب کے نشان والی ٹوپی اور کمر میں زنار بندھی دیکھی تو سمجھ گئے کہ لوگوں نے سچ بتایا ہے۔ جب وہ اپنے شیخ کے پاس پہنچے تو اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

شبلی: السلام علیکم

اندلسی زاہد: (سر جھکائے دبی زبان میں) وعلیکم السلام۔

شبلی: استاذ محترم! باوجود علم و فضل کے یہ کیا ہو گیا؟

اندلسی زاہد: مجھے خود معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟

شبلی: آپ تو ساتوں قراءتوں سے قرآن پڑھتے تھے، کیا وہ یاد بھی ہے یا نہیں؟

اندلسی زاہد: صرف ایک آیت یاد رہ گئی ہے ﴿وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ﴾ [سورۃ البقرہ:۱۰۸] جو کوئی ایمان کے بدلے کفر کو (اختیار کر) لے (وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا)

شبلی: اور وہ تیس ہزار احادیث، جو مع اسناد یاد تھیں، ان کا کیا بنا؟

اندلسی زاہد: صرف ایک حدیث یاد رہ گئی ہے۔

شبلی: وہ کون سی حدیث ہے؟

اندلسی زاہد: ((مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ)) (اپنا دین بدلنے والے کو قتل کردو)

واقعی جنون عشق، انسان کو اپنی عزت و آبرو، مرتبہ و مقام اور انجام کار سے اندھا کر دیتا ہے۔ نوجوان استاذ اس روایت کے ذریعے اشارے دے رہا تھا کہ اب اس راہ میں قتل ہونا منظور ہے لیکن واپسی منظور نہیں۔ سب دعائیں اور دوائیں دے چکے، لیکن یہ سب کچھ اس بیماری کا علاج نہیں۔ ان کا علاج بزبان شاعر یوں

تھا:

بِكُلِّ صُبحٍ وَ بِكُلِّ اِشْرَاقِ تُبْكِيكَ عَيْنِىْ بِدَمْعٍ فِرَاقِ
لَسَعَتْ حَيَّةُ الهوىَ كَبِدِىْ فَلاَ طَبِيبَ لَهَا وَلَا رَاقِ
اِلَّا الْحَبِيبَ الَّذِىْ شُغِفْتُ بِهٖ فَهُوَ رُقْيَتِىْ وَ تِرْيَاقِ

''طلوع آفتاب سے قبل اور بعد، میری آنکھیں تیری جدائی میں روتی رہتی ہیں۔ عشق کا سانپ میرے جگر کو یوں ڈس گیا ہے، کہ اس کا کوئی طبیب اور دم کرنے والا نہیں۔ البتہ اس کا دم اور تریاق وہ محبوب ہی ہے، جس سے مجھے عشق ہو گیا ہے۔ اگر وہ مل جائے تو بس شفاء ہی شفاء ہے۔''

چنانچہ اندلسی زاہد تمام دن سوروں کی گلہ بانی کرتے اور رات کو محبوب کی یاد میں تڑپتے رہتے۔ ادھر محبوبہ بھی اندلسی نوجوان کے اس حال سے بے خبر نہ تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اُڑ کر اس کے پاس پہنچ جائے لیکن حیاوار معاشرے میں ایسا کرنا قبیح ترین برائی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی تمنا اور آرزو میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہے۔

الغرض شبلی اور ان کے رفقاء اپنے استاذ کو بے بس جان کر واپس روانہ ہو گئے۔ ساری راہ اللہ سے دعائیں کرتے رہے کہ یامقلب القلوب ہمارے استاذ کو ایمان و ہدایت نصیب فرما۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ ان کی دعائیں رنگ لائیں اور انھیں اپنے سامنے نہر سے ایک شخص نہا کر نکلتا دکھائی دیا اور وہ بلند آواز میں پڑھ رہا تھا أشهد أن لا إله إلا الله و أشهد أن محمد رسول الله۔ یہ سن کر ان کے دل میں سرور و شادمانی کی لہر موجزن ہوئی کیونکہ وہ شخص ان کا استاذ ابو عبداللہ ہی تھا۔ جسے وہ سوروں کی گلہ بانی کرتے دیکھ آئے تھے، یہ ان سے گلے مل

کر بخوشی رو دیئے اور متاع ایمان کے واپس لوٹنے پر مبارکیں دینے لگے۔ اس کے بعد اندلسی زاہد نے پاکیزہ اور ستھرے کپڑوں کا مطالبہ کیا تاکہ نماز ادا کر سکیں جو انھیں مہیا کر دیئے گئے۔ پھر انہوں نے نہایت خشوع و خضوع سے نماز ادا کی اور شبلی اپنے رفقاء کے ساتھ پیچھے بیٹھ کر اللہ کا شکر ادا کرتے رہے۔ جب استاذ محترم نماز سے فارغ ہوئے تو شاگردوں نے ان سے متاع ایمان لٹنے کا سبب پوچھا۔ اندلسی زاہد یوں گویا ہوئے:

عزیزو! واقعہ کچھ یوں ہے کہ جب ہم اس علاقے میں داخل ہوئے تو ہم نے بہت سے لوگوں کو مبتلائے کفر و شرک دیکھا۔ کوئی سورج کی پرستش کر رہا تھا اور کوئی آگ کے سامنے ماتھا ٹیک رہا تھا اور کوئی صلیب کی پرستش کر رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میرے دل میں اپنی توحید پرستی پر تکبر پیدا ہوا اور تکبر اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا۔ مجھے غیب سے آواز آئی ''تکبر کس بنا پر کرتا ہے؟'' کیا ایمان و توحید پرستی کوئی تمھارا ذاتی کمال ہے؟ اگر ہماری توفیق شامل حال نہ ہو تو تم بھی ویسے ہو جاؤ گے۔ اس کے بعد مجھ پر ابلیس کا مسموم تیر چل گیا۔ اس خوبرو دوشیزہ پر جونہی میری نظر پڑی، یوں محسوس ہوا جیسے میرے قلب سے کوئی طائر خوش رنگ اڑ گیا ہے۔ اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ جنون عشق میں مجھ سے کیا سرزد ہوتا رہا۔ حضرت رسول مقبول ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلنَّظْرُ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ فَمَنْ تَرَكَهُ لِلّٰهِ عَوَّضَهُ اللّٰهُ اِيْمَانًا يَجِدُ حَلَاوَتَهُ فِيْ قَلْبِهِ))

''(غیر محرم عورتوں کو) دیکھنا ابلیس کے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔ جو شخص اللہ کے خوف سے ایسا کرنے سے باز رہا، تو اللہ اسے ایسا ایمان عطا فرمائے گا جس کی حلاوت وہ اپنے دل میں پائے گا۔''

اندلسی زاہد پر اللہ کی جو تقدیر وارد ہوئی، تو اس کا سبب بھی غیر محرم کے چہرے پر نظر گاڑنا ہی تھا۔ چنانچہ اس زہریلے تیر کی وجہ سے اندلسی زاہد عشق کے اندھے کنویں میں گر پڑا، پھر توفیق الٰہی شامل حال ہوئی تو ایمان کی دولت لوٹ آئی۔ بہر حال جب وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وطن مالوف کو روانہ ہوا تو بغداد میں شادیانے بج گئے۔ ویران عبادت گاہیں اور مدرسے از سر نو آباد ہو گئے۔

بعض مصنفین اپنی کتب میں ذکر کرتے ہیں، کہ جب عیسائی دوشیزہ کو ان کے واپس لوٹنے کا پتہ چلا تو وہ کوشش بسیار کے بعد اپنے محبوب کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ لیکن اب نوجوان زاہد کی وہ حالت نہ رہی تھی، بلکہ انہوں نے اس دوشیزہ کو مسلمان کر کے جنت میں ملنے کے وعدہ پر راضی کر لیا۔ بالآخر وہ بھی اللہ کی ہو کر رہ گئی۔

......☆......

[1] اس قصے کا اصل المستطرف من كل فن مستطرف میں ہے۔

مظلومین کا انتقام[1]

مُعِزّ الدَّولَہ کے دورِ حکومت میں بغداد اور اس کے اطراف میں چوری اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں عام ہونے لگیں۔ خطرناک مجرموں نے لوگوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اس صورت حال کا تدارک کرنے کے لیے حکومت وقت نے ایک سخت گیر پولیس افسر کو بغداد میں ایس پی مقرر کر دیا جس نے زبردست آپریشن کر کے خطرناک ڈاکوؤں اور مجرموں کو پکڑ کر جیل میں بند کر دیا۔ پھر خلیفہ وقت سے ان کو نشان عبرت بنانے اور ان کے سر قلم کرنے کی اجازت طلب کی، جو اسے مل گئی۔

چنانچہ اس نے بیس ڈاکوؤں کو دریائے دجلہ کے پُل پر سولی دینے اور انہیں قتل کرنے کے لیے جیل سے نکالا اور پولیس کے ایک دستے کی نگرانی میں انہیں پل پر سولی کے تختوں پر جکڑوا دیا تاکہ عام لوگ ان کے حشر سے عبرت حاصل کریں۔

ابھی آدھی رات نہ گزری تھی کہ پولیس اہلکاروں اور تھانیداروں کی آنکھ لگ گئی اور وہ سو گئے۔ انھیں اس وقت جاگ آئی جب ایک مجرم کسی حیلہ سے رسہ کاٹ کر چھلانگ لگاتا ہوا نیچے آ گرا اور اٹھ کر دوڑنے لگا۔ انہوں نے دیکھا تو اس کے پیچھے بھاگے لیکن اس کی قسمت میں ابھی زندگی کے کچھ دن باقی تھے وہ ہاتھ نہ آیا۔ اس کا پیچھا کرنے والوں نے سوچا کہ اگر ہم اس کے پیچھے بھاگتے رہے تو کہیں دوسرے مجرم بھی ایسے ہی فرار نہ ہو جائیں۔ چنانچہ وہ واپس پل پر آ گئے اور باقی مجرموں کی نگرانی کرنے لگے فرار ہونے والے مجرم کے متعلق وہ سوچنے اور آپس میں کہنے

لگے: ”صاحبو! ہمارا ایس پی بڑا سخت گیر انسان ہے۔ صبح اس نے ڈاکوؤں کی گنتی کرنی ہے، اگر بیس پورے نہ ہوئے تو وہ ہمارا ایسا حشر کرے گا کہ دنیا دیکھے گی۔

وہ کہے گا کہ تم نے رشوت لے کر مجرم بھگا دیا ہے۔ اگر ہم نے جان بچانے کے لیے اقرار کر لیا تو بھی مارے جائیں گے اور اگر اقرار نہ کیا تو بھی! وہ مسلسل پٹواتا رہے گا اور اس وقت تک نہیں چھوڑے گا جب تک ہم اقرار نہ کریں گے۔ چنانچہ ان کی آپس میں یہ رائے ٹھہری کہ وہ خود بھاگ جائیں۔ مگر جائیں کہاں؟ ہر جگہ پکڑے جائیں گے۔

قاضی بہلول نے جو اس وقت پولیس اہلکار تھا، پولیس افسر کو رائے دی کہ جناب من! ہمیں چاہیے کہ گلیوں، سڑکوں پر نکل جائیں اور کسی بدنصیب کو پکڑ لائیں اور اسے یہاں سولی پر جکڑ دیں کیونکہ آدھی رات گزر چکی ہے۔ لوگ اپنی اپنی خواب گاہوں میں سوئے ہوئے ہیں۔ کسی کو کیا پتہ کہ رات کو یہاں کیا واقعہ پیش آیا۔ صبح سویرے ایس پی آئے گا تو کہہ دیں گے کہ جناب آپ نے ہمیں بیس مجرم دیئے تھے اور یہ پورے بیس (۲۰) ہیں۔

چنانچہ چند پولیس اہل کار سڑکوں اور گلیوں میں اپنا شکار ڈھونڈنے نکل پڑے اور چلتے چلتے پل عبور کر کے شہر کے مغربی حصہ تک پہنچ گئے۔ وہاں انھیں پل کے نیچے ایک بدقسمت آدمی پیشاب کرتا نظر آیا، جسے انہوں نے پکڑ لیا اور اسے مارنے پیٹنے لگے۔ اسے یوں کھینچنے لگے جیسے قصاب بکرے کو مذبح خانے لے جا رہا ہو۔

وہ آدمی روتے اور چیختے ہوئے پوچھنے لگا: ظالمو! میرا گناہ کیا ہے؟ لیکن اس کی ایک بھی نہ سنی گئی اور بیس کی گنتی پوری کرنے کے لیے اسے لا کر سولی پر جکڑ دیا گیا۔ وہ طلوع آفتاب تک اتنا رویا اور چلایا کہ پولیس اہل کاروں کے کلیجے پھٹے جا رہے تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک بے گناہ اور مظلوم شخص ہے اور صبح اس کی بھی

گردن اڑا دی جائے گی لیکن اسے چھوڑا بھی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں ان کو اپنی جانوں کا خطرہ تھا۔

طلوع آفتاب کے بعد لوگ جمع ہونے لگے اور تھوڑی دیر بعد ایس پی بھی آ گیا۔ اسے دیکھ کر وہ شخص بری طرح چیخا، رویا اور یوں فریادی ہوا:

تمہیں واسطہ ہے اس دن کا جس دن آپ نے بھی اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ میری بات سن لیں۔ میں بے گناہ ہوں اور ان لوگوں میں شامل نہیں جن کے متعلق سولی دینے اور قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ میں تو اتفاقاً ان کے ہاتھ آ گیا ہوں اور انہوں نے مجھے یہاں جکڑ دیا ہے۔

ایس پی نے پوری کہانی سن کر باقی مجرموں کی گردنیں قلم کر دیں اور اسے اپنے سامنے کھڑا کرنے کا حکم دیا تا کہ مزید تفتیش کی جا سکے۔ اس دوران اس نے پولیس انسپکٹر اور اس کے اہل کاروں کو سرزنش کی کہ تم نے رشوت لے کر ملزم بھگا دیا ہے اور اس کی جگہ بے قصور آدمی کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا۔ اس کا جواب پولیس انسپکٹر اور اس کے ماتحت عملے نے یہ دیا کہ صاحب اس کا کیا ہے، سب ہی مجرم اپنے آپ کو بے گناہ کہتے ہیں۔ آپ نے ہمیں بیس آدمی دیئے ہیں، سو وہ سب حاضر ہیں۔

تاہم پولیس آفیسر (S-P) نے مزید تفتیش کے لیے جیل سے باقی قیدیوں اور دربانوں کو اپنے سامنے حاضر کیا اور ان سے پوچھا: ''کیا یہ شخص ان مجرموں میں سے ہے جو آپ کے ساتھ جیل میں تھے اور میں نے ان کے قتل کا حکم دیا تھا؟''

تمام دربانوں اور قیدیوں نے باری باری اس کا چہرہ بغور دیکھا اور متفقہ رائے دی کہ نہیں جناب یہ ان لوگوں میں سے نہیں جن کے قتل کا آپ نے حکم صادر کیا تھا کیونکہ وہ سب ہمارے ساتھ نظر بند رہے ہیں اور ہم انھیں اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔

پولیس آفیسر نے مکمل شہادتیں ملنے پر اسے چھوڑ دیا لیکن مزید پوچھ گچھ کے لیے اسے اپنی کچہری میں حاضر کر لیا اور پوچھا:

ہم نے مکمل شہادتیں ملنے کے بعد تجھے چھوڑ دیا ہے لیکن یہ تو بتا کہ تو آدھی رات کو یہاں کیوں آیا تھا؟ کیا تیرا گھر بار نہیں جہاں تو رات گزارتا، اِدھر سنسان اور ویران جگہ پر تو کیسے پہنچ گیا؟

ملزم: جناب میں اپنی کشتی میں سویا ہوا تھا اور مجھے رفع حاجت ہوئی۔ میں باہر آ کر بیٹھا ہوا تھا کہ انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔

پولیس آفیسر: لیکن تو اپنی کشتی ہی میں کیوں رات بسر کر رہا تھا؟ یہاں کشتی کھڑی کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟

ملزم: جناب بس میں اپنی کشتی ہی میں رات بسر کر رہا تھا لہٰذا رفع حاجت کے لیے ادھر نکلا تو انہوں نے مجھے پکڑ لیا۔

اس ایس پی کا طریقہ کار یہ تھا کہ تفتیش کے وقت ملزم کے پیچھے کوڑا بردار جلادوں کو یہ سمجھا کر کھڑا کرتا کہ جب میں اپنا سر کھجلاؤں تو ملزم پر پوری قوت سے کوڑا برسا دینا۔ اگر ملزم سچ سچ بتا دے تو ٹھیک ورنہ وہ دو یا تین دفعہ پوچھنے کے بعد پھر سر کھجلاتا اور کوئی جلاد اس پر کوڑے برسا دیتا اور وہ آفیسر خود جلاد سے کہتا:

ارے اسے کیوں مارتا ہے۔ ابھی مجھے پوچھ تو لینے دو۔ اللہ تیرے ہاتھ پاؤں کاٹے رک جا! اور ملزم سے کہتا آگے آ اور سچ بتا، تیری جان چھوٹ جائے گی۔

الغرض پولیس آفیسر نے اس سے دو یا تین مرتبہ پوچھنے کے بعد اپنا سر کھجلایا تو جلاد نے پوری قوت سے اس پر کوڑا برسا دیا جس کی شدت سے وہ یوں چلایا جیسے اس کی جان نکلنے والی ہو۔

ایس پی نے بظاہر جلاد کو ڈانٹ پلائی اور کہا ''اس بے گناہ کو کیوں مارتا ہے،

اللہ تیرا برا کرے یہ تو سچ سچ بتانے والا تھا، رک جا۔

ارے! آگے آ اور سچ سچ بتا تاکہ تیری جان جلدی چھوٹے اور تو اپنی راہ لے۔

ملزم: اگر میں سچ سچ بتاؤں تو آپ اللہ کے نام پر وعدہ کرتے ہیں کہ مجھے امان مل جائے گی اور میرے ہاتھ پاؤں سلامت رہیں گے؟

ایس پی: ہاں بالکل! سچ سچ بتاؤ۔

ملزم نے اپنی کہانی یوں بیان کی: ''صاحب میں فلاں گھاٹ پر چلنے والی کشتی کا ملاح ہوں۔ گزشتہ رات میں چاند کی چاندنی میں کشتی رانی کر رہا تھا کہ مجھے ساحلی محلے کی طرف سے آواز سنائی دی۔ میں اس طرف گیا تو ایک اجنبی نے مجھے ایک درہم دیا اور کہا کہ اس عورت اور اس کی دو بچیوں کو باب شماسیہ پر چھوڑ آؤ۔ چنانچہ میں اسے لے کر چل پڑا۔ ابھی تھوڑا ہی سفر طے کیا تھا کہ اس عورت نے اپنے چہرے سے نقاب اتارا۔ جونہی میری نظر اس پر پڑی تو مجھے اپنے پر قابو نہ رہا۔ میری نیت میں فتور آ گیا اور کشتی کو موڑ کر دریا کے وسط میں لے گیا۔ کشتی کے چپو اندر رکھ کر عورت سے حرام کاری کا مطالبہ کر دیا جسے وہ نہ مانی اور سختی سے انکار کرنے لگی۔ میں نے پورا جتن کیا لیکن وہ اپنا دفاع کرتی رہی۔ میں نے اس سے پوچھا یہ دونوں بچیاں کس کی ہیں؟ اس عورت نے بتایا یہ دونوں میری بچیاں ہیں۔

میں نے کہا یا تو مجھے موقع دے ورنہ میں تیری اس بچی کو دریا میں غرق کر دوں گا۔ لیکن وہ نہ مانی اور سختی سے انکار کرتی رہی چنانچہ میں نے ایک بچی کو اٹھا کر دریا میں پھینک دیا۔ جب وہ چیخی تو میں بھی اس کے ساتھ ہی چیخ پڑا تاکہ اگر کوئی آواز سن بھی لے تو سمجھ نہ سکے کہ ماجرا کیا ہے اور اس کے منہ پر ہاتھ بھی رکھ دیا۔ وہ روتی ہوئی خاموش ہوگئی۔ میں نے پھر مطالبہ کیا تو اس نے کہا اللہ کی قسم! ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں نے اس کی دوسری بچی بھی پکڑی اور اسے دھمکی دے کر مطالبہ کیا کہ اگر

موقع نہ دے گی تو اسے بھی غرق کر دوں گا۔ جب اس نے انکار کیا تو میں نے دوسری کو بھی دریا میں پھینک دیا۔ وہ چیخی اور واویلا کرنے لگی تو میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا وہ کہنے لگی اگر تو مجھے قتل بھی کر دے تو میں تجھے موقع نہیں دوں گی۔ میں نے اس عورت کے ہاتھ پکڑے اور اسے دریا میں پھینکنے پر تیار ہو گیا۔ وہ ہمت ہار گئی اور اس نے ڈر کر اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا اور میں نے حرام کاری کی خواہش پوری کر لی۔

......روز اول سے شیطان کا موثر طریقہ رہا ہے کہ وہ انسانوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے عورت کو ذریعہ بناتا ہے اور جب کوئی انسان اس کے جال میں پھنس جاتا ہے تو وہ اسے یوں اندھا کر دیتا ہے گویا نشے میں مدہوش آدمی کہ پھر اپنے انجام کا پتہ ہی نہیں رہتا۔ کتنے عاشقوں اور معشوقوں کو اس نے اسی وہم ڈالا کہ کسی کو تمھارا کیا پتہ؟ اور اگر کسی کو پتہ چل گیا تو کوئی تمھارا کیا بگاڑ سکتا ہے؟

ایک دفعہ کسی عورت کو اس کے خاوند نے بدکاری کرتے ہوئے موقعہ پر پکڑ لیا۔ تو وہ اپنے خاوند کے سامنے یوں اکڑ کر سامنے آئی جیسے چوہا شراب پی کر بلی کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کا آشنا تو کپڑے چھوڑ کر فرار ہو گیا لیکن یہ بدقسمت خاوند کو للکارنے لگی۔ خاوند کے ہاتھ میں چھرا تھا، جو اس نے عورت کے سینے میں پیوست کر دیا اور اس کی لاش ٹکڑے ٹکڑے کر دی۔

نبی مکرم ﷺ نے سچ فرمایا ہے کہ جب کوئی مرد کسی اجنبی عورت سے تنہائی میں ملتا ہے تو ان میں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنی چاہئے کہ اپنی عورتوں کو تنہا سفر پر بھیجنا کس قدر خطرناک ہے اور ان کو پردہ نہ کرانا کتنے خطرات کا پیش خیمہ ہے۔ اس ملاح پر شیطان یوں سوار ہوا کہ اس نے جب تک شیطنت پوری نہ کر لی اسے انجام کار سے مدہوش رکھا ورنہ یہی ملاح ہزاروں مردوں

عورتوں کے اجتماعی قافلوں کو منزل مقصود تک پہنچا چکا تھا چنانچہ اس نے بتایا:

جب میں نے اپنی ہوس پوری کر لی تو دل میں خیال آیا کہ اب اس عورت کو اگر منزل مقصود تک پہنچانے جاتا ہوں تو یہ وہاں مجھے پکڑوا دے گی۔ اگر واپس لے جاتا ہوں تو بھی مارا جاؤں گا۔ خلاصی کی راہ یہی ہے کہ اسے بھی غرق کر دوں۔ چنانچہ میں نے اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ کر اسے دریا میں پھینک دیا۔ پھر خطرہ پیدا ہوا کہ اب یہاں رہا تو پہچانا جاؤں گا اور ورثاء مجھے پکڑ کر پوچھ گچھ کریں گے تو سوچا کہ کشتی کو کسی نہر میں ڈال کر اندرون شہر پہنچ جاؤں اور غائب ہو جاؤں۔ بس اسی تگ ودو میں مصروف تھا کہ مجھے اس جگہ پہنچ کر قضائے حاجت کی مجبوری آڑے آئی اور میں کشتی سے نکل کر یہاں قضائے حاجت سے فارغ ہوا ہی چاہتا تھا کہ انہوں نے آ کر مجھے پکڑ لیا اور اس فرار ہونے والے ڈاکو کی جگہ سولی پر جکڑ دیا۔

بادی النظر میں اگرچہ یہ شخص بے قصور پکڑا گیا تھا اور اس کی آہ وفغاں کو سن کر پولیس والوں کے دل پگھل رہے تھے اور سولی پر اس کی چیخ پکار درو دیوار کو ہلا رہی تھی۔ لیکن رب العالمین کی بارگاہ میں یہ سنگدل مجرم تھا۔ نامعلوم اس نے کتنے بے گناہوں کو قتل کیا ہوگا جن کا کوئی قصور نہ تھا اور اس عورت کی عزت پر ڈاکہ ڈالا جس پر اس کا کوئی حق نہ تھا۔ بظاہر ان مظلوموں کا داد رس نظر نہیں آ سکتا تھا۔ پکڑنے والے ارادتاً اسے پکڑنے نہ آئے تھے لیکن مظلوموں کی آہیں عرش الٰہی سے جا ٹکراتی ہیں اور اللہ رب العزت اپنے جلال کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں ان کی مدد کر کے رہوں گا اگرچہ کچھ دیر بعد ہی سہی۔

اگر اللہ چاہتا تو اسی وقت اس ظالم کو انجام تک پہنچا دیتا لیکن اس نے دنیا والوں کو بتانا بھی ہوتا ہے کہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے والوں کا انجام یوں بھی ہو سکتا ہے۔ تاکہ وہ شرع کے احکام کو معمولی نہ سمجھیں۔ نہ تو عورتیں اکیلی سفر کریں اور

نہ غیر محرم ڈرائیوروں کے ساتھ بیٹھیں اور نہ وہ ننگے منہ ہی پھرتی رہیں۔

S-P نے ظالم کی کہانی اس کی اپنی زبانی سن کر تسلی دی اور کہا میرے اور تیرے درمیان معاملہ کیسا تھا؟ جاؤ سلامتی کے ساتھ۔ جب وہ واپس پلٹ گیا تو اس نے اسے واپس بلایا اور کہا:

نوجوان تو نے جاتے ہوئے ہمارے حق کا بھی خیال نہ رکھا کہ ہم تجھ سے حلف لیں کہ آئندہ ایسا نہ کرنا۔ وہ واپس لوٹ آیا تو پولیس آفیسر نے کہا پکڑ لو اس سنگدل ظالم کو اور اس کے ہاتھ کاٹ دو۔

جب پولیس اہل کاروں نے اسے پکڑا اور اس کے ہاتھ کاٹنے شروع کیے تو وہ بولا: جناب! تم بدعہدی میں میرے ہاتھ کاٹ رہے ہو جبکہ تم نے مجھے امان دی تھی۔

S-P نے کہا:

اے خونخوار کتے! تیرے جیسے کے لیے امان کہاں؟ تین بے گناہوں کو تو مار چکا اور عزت لوٹ چکا ہے۔ چنانچہ پہلے تو اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور پھر اس کی گردن کاٹ کر اسے آگ میں جلا دیا گیا۔ یوں ظالم درندے کا قصہ تمام ہوا۔

......☆......

[1] اس قصے کا اصل المطالعة العربية مطبوعه الرياض سعودی عرب میں ہے۔

پردہ پوشی

یہ نوجوان بیوہ ہر اعتبار سے مثالی خاتون تھی۔ نیکی اور تقویٰ، عبادت و ریاضت، صوم و صلوۃ، صبر و شکیب، رضا بالقضاء جیسے اوصاف میں کوئی عورت اس کی ثانیہ نہ تھی۔ صبح سویرے اٹھتی، نماز فجر ادا کرتی اور ضروری ورد و وظائف سے فارغ ہونے کے بعد دن چڑھے تک تلاوت قرآن میں مصروف رہتی۔ پھر رزق حلال سے اپنا پیٹ پالنے کے لیے محنت مزدوری کرتی۔ لیکن ایک دن کسی بد طینت نے اس کی غربت و ناداری سے شہ پا کر اسے دبوچ لیا اور اس روتی پیٹتی مسکینہ کی عصمت تار تار کر دی۔

اگر یہ خاتون کسی پنچائت یا عدالت میں اپنے اوپر ٹوٹنے والے پہاڑ کی داستان سناتی اور اس ظالم درندے کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ کرتی تو یہ اس کا حق تھا۔ لیکن بگڑے ہوئے معاشرے میں غریب کی فریاد کون سنتا ہے۔ ایسے ناداروں کو تھانوں سے دھکے دے کر باہر نکال دیا جاتا ہے۔ عدالتوں میں اس کی جگ ہنسائی ہوتی ہے اور رہی سہی آبرو بھی خاک میں مل جاتی ہے۔ یہ بے چاری رو دھو کر خاموش ہو گئی اور جا کر گھر بیٹھ گئی۔ چند ماہ بعد حمل کے آثار ظاہر ہونے لگے اور یہ بدنامی کے خوف سے لرزنے کانپنے لگی۔ آنے والا ہر دن اور ہر رات اس کی پریشانی میں اضافہ کر رہے تھے۔ نہ سو سکتی، نہ بیٹھ سکتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ سنگدل رشتہ دار اس کی مجبوری و مقہوری کو سنے بغیر اسے قتل کر دیتے اور اس کی لاش ٹکڑے

ٹکڑے کر ڈالتے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا اس کی مصیبت بڑھتی جاتی اور موت گھورنے لگتی۔

ایسی صورت میں بدنامی سے بچنے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ وہ خودکشی کر لیتی لیکن یہ دین دار عورت تھی اور جانتی تھی کہ اس طرح خودکشی کرنے والے کو اللہ نہیں بخشتا۔ لہٰذا اس نے اس صورتحال سے بچنے کے لیے مختلف تدابیر پر غور شروع کر دیا۔ سوچتے سوچتے اس نتیجے پر پہنچی کہ اس سلسلے میں کسی خدا ترس اور متقی عالم کا تعاون حاصل کیا جائے، جو مسلمان کی پردہ پوشی کی فضیلت اور اہمیت سے آگاہ ہو اور اس معاملے کو اپنی ذات تک محدود رکھے۔ چنانچہ اس کے دل میں آیا کہ امام ابوجعفر احمد بن مہدی کے سوا یہاں اور کون ہے جو میری مجبوری پر ترس کھائے اور میرا پردہ رکھے۔ مسلمان کی پردہ پوشی کرنا محض عمدہ خلق ہی نہیں بلکہ افضل عبادت بھی ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

((مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ))

''جس نے کسی مسلمان کے گناہ پر پردہ ڈالا، اللہ اس کے گناہوں پر دنیا و آخرت میں پردہ ڈالے گا۔''

بلکہ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول مقبول ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ وَمَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

''مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے وہ نہ تو اپنے بھائی پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے کسی مصیبت میں پھنسا ہی دیکھ سکتا ہے۔ جو کوئی مسلمان اپنے بھائی

کی حاجت روائی کے لیے تگ و دو کرتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی
حاجت روائی کرتا رہتا ہے اور جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی مشکل
آسان کردیتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی مشکلات آسان
فرمادے گا۔ جوکوئی انسان کسی مسلمان کی لغزش پر پردہ ڈالے گا اللہ
تعالیٰ قیامت کے دن اس کے گناہوں پر پردہ ڈال دے گا۔‘‘

امام ابوجعفر احمد بن مہدی جیسے محدثین کرام نہ صرف یہ کہ جمع علوم و حفظ متون، جرح و تعدیل اور اجتہاد و استنباط کے دلدادہ تھے، بلکہ وہ علم و عمل، اخلاص و توکل، بذل و عطا، جودُ وسخا، حق گوئی و بیباکی، خودداری و غمگساری، ایثار و قربانی اور صدق و صفا، افشاء سلام و اطعام الطعام میں اپنی مثال آپ تھے۔

اکلِ حلال و صدقِ مقال، امانت و دیانت، شرافت و صداقت، بے لوثی و بے نفسی میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ وہ فرسان النہار اور رھبان اللیل ہوتے تھے۔

سیر اعلام النبلاء، صفوۃ الصفوۃ، طبقات حنابلہ، شذور الذھب وغیرہ کتب ان کے اخلاق جمیلہ و اوصاف حمیدہ سے بھری پڑی ہیں۔

یہ لوگ خلیفۂ وقت کے علاوہ نہ تو کسی شیخ کے دست حق پرست پر بیعت تھے اور نہ ہی کسی سجادہ نشیں کے خلیفۂ مجاز۔ ان کے اندر یہ اوصاف حمیدہ اور اخلاق جمیلہ حدیثِ رسول ﷺ کی برکت سے آئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے علم، عمل کی نیت سے پڑھا تھا۔ جس کے نتیجے میں انھیں عمل کی توفیق ملی تو ان کے اندر ایمان کے چشمے ابلنے لگے اور زبان پر حکمت کی آبشاریں رواں ہوگئیں۔ دنیا ان کے فیضان عمل سے سیراب ہونے لگی۔

بہر حال وہ عورت شرماتی، لڑکھراتی ہوئی امام ابوجعفر احمد بن مہدی اصفہانی کی خدمت میں پیش ہوئی اور انھیں تنہائی میں عرض کرنے لگی:

حضرت میں زنا بالجبر کا شکار ہوئی ہوں اور حمل بھی ٹھہر گیا ہے۔ میں بدنامی اور فضیحت سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو تمھاری بیوی ظاہر کر کے آئی ہوں۔ خدا کے لیے میرا پردہ رکھئے اللہ آپ کا پردہ رکھے گا۔

اس کی درخواست سن کر امام ابوجعفر خاموش ہو گئے اور وہ چلی گئی مدت مقررہ پر اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو لوگ اس عورت کے دعویٰ کے مطابق آپ کو مبارک باد دینے آئے۔ آپؒ نے سب کی مبارک باد قبول کی اور فرداً فرداً سب کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد آپ نے بچے کی گزران کے لیے ہر ماہ دو دینار عورت کی طرف بھیجنے شروع کر دیئے۔ بالآخر وہ بچہ دو سال کی عمر میں فوت ہو گیا تو لوگ آپ کے پاس تعزیت کے لیے آئے۔ آپ نے اس پر بھی سب کا شکر ادا کیا اور انہیں دعائے خیر دی۔ چند دنوں بعد وہ عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی: جَزَاکَ اللّٰہ خَیْرًا...... جس طرح آپ نے میرا پردہ رکھا اللہ تعالیٰ آپ کا پردہ رکھے۔ یقیناً آپ نے میرے ساتھ بڑی نیکی کی ہے۔

اور یہ ہیں وہ دینار جو آپ میرے پاس بھیجتے رہے میں نے انہیں سنبھال سنبھال کر رکھا ہے تا کہ آپ کی امانت آپ کو لوٹا دی جائے۔

آپ نے فرمایا: بی بی! میں نے یہ دینار واپس لینے کے لیے نہیں دیئے تھے بلکہ میں نے اس بچے کو بطور صلہ رحمی کے دیئے تھے لہٰذا اس کے یہ دینار وراثت میں تمھارے حق میں چلے گئے۔ برائے مہربانی اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔

اللہ اکبر! مسلمان عورت کی پردہ داری اور حسبتاً للہ غیر کے بچے پہ خرچ کرنا سوائے اللہ والوں کے اور کون کر سکتا ہے۔

......☆......

رزق حلال کی بارش

رمضان المبارک کی آمد ہوئی تو ربع مسکون کے مختلف ملکوں میں بکھری ہوئی رونقیں مکۃ المکرمہ میں جمع ہونا شروع ہو گئیں۔ دنیا کے ہر گوشے میں رہنے والے امیر اور غریب، شاہ اور گدا، ایرانی اور تورانی، کالے اور گورے، عربی اور عجمی صاحب استطاعت مسلمان بیت اللہ الحرام کے دیدار سے مشرف ہونے کے لیے عمرہ کرنے چلے آرہے تھے کیونکہ رمضان المبارک میں عمرے کا اتنا ثواب ہوتا ہے کہ گویا حضرت رسول مقبول ﷺ کے ساتھ مل کر حج کر لیا ہو۔[1]

قاضی ابو بکر انصاری رحمۃ اللہ تعالیٰ اسی سعادت کو حاصل کرنے کی غرض سے مکۃ المکرمۃ پہنچ گئے، مکہ المعظمہ میں اللہ تعالیٰ کا وہ مقدس گھر ہے جسے حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن اور اسکے سعادت مند بیٹے حضرت اسماعیل علیہما السلام نے تعمیر کیا تھا اور وہاں (بغیر کسی لاؤڈ سپیکر اور براڈ کاسٹنگ اسٹیشن کے) اعلان کیا تھا کہ

"لوگو اللہ نے تم پر اس گھر کا حج فرض کیا ہے اس لیے تم اس کا حج کرو۔"

چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کی آواز کو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا اور حاجیوں کے پہنچنے سے پہلے ہی ان کے لیے بے آب و گیاہ، پتھریلی اور پہاڑی زمین میں ہمہ قسم پھلوں کا رزق پہنچا دیا۔ صاحب استطاعت مسلمان جی بھر کر وہاں مناسک حج ادا کرتے ہیں اور من پسند پھلوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اللہ کے اس بندے نے ابتدائی دنوں میں اپنی آرزو کے مطابق جی بھر کر

بیت اللہ کا طواف کیا اور صفا و مروہ کے درمیاں سعی کی اور دنیا جہان کے سب سے مقدس پانیسے اپنی پیاس بجھائی اور بیت اللہ کے جن نظاروں کو کانوں نے سنا تھا، انھیں آنکھوں سے دیکھا،

عبادت میں اس قدر سرور آیا کہ بیان سے باہر ہے، دل کو موہ لینے والی اذانیں اور پرلطف نمازیں، دلکش تلاوتیں اور رلا دینے والی دعائیں سنیں اور دلوں کو شفا بخشنے والا آب زم زم پیا۔ وہاں باہمی محبت و مروت کے ایسے مناظر دیکھنے میں آئے جو دنیا جہاں میں کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ جی میں آیا کہ سب کچھ چھوڑ کر باقی عمر یہیں گزار دی جائے، لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ کچھ عرصہ بعد درہم و دینار خرچ ہو گئے اور کھانے پینے کو کچھ نہ بچا۔ کچھ دن تو فقر و فاقے سے گزر گئے لیکن ایک رات بھوک کی انتہا ہو گئی۔ بایں ہمہ غیر تمند طبیعت نے دست سوال دراز کرنے سے روکے رکھا اور یہ اس امید پر کہ شاید اللہ تعالیٰ کوئی سبب پیدا کر دے۔ گھر سے اٹھے اور مکہ کی گلیوں میں پھرنے لگے تاکہ کسب حلال مل جائے تو چند ایام آرام سے گزر جائیں۔

ان دنوں مکہ مکرمہ میں بڑی چہل پہل تھی، عربی اور عجمی، مراکشی اور انڈونیشی، چینیا ور جاپانی، ترکی اور ایرانی، مصری اور یمنی، اردنی اور لبنانی، سوڈانی اور شامی، کالے اور گورے، بلند و بالا اور کوتاہ قد، مرد اور عورتیں حج اور عمرہ کے لیے بستیوں اور شہروں صحراؤں اور دریاؤں، اور سمندری جزیروں سے نکل کر اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے اتر کر بیت اللہ الحرام کے دیدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنے آئے ہوئے تھے۔

ان میں سے ایک بزرگ کی حریری تسمے سے بندھی ہوریشمی تھیلی کہیں گر گئی جو اتفاقاً ابوبکر انصاری کے ہاتھ لگ گئی۔ یہ اسے لے کر اپنے گھر روانہ ہو گئے جب اسے کھول کر دیکھا تو اس میں موتیوں کا لاثانی ہار موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی بھوک کا احساس ختم ہو گیا اور مضمحل قویٰ میں طاقت پیدا ہو گئی۔ جی میں آیا کہ اس سے کچھ

خرچ کر کے ضرورت پوری کر لی جائے لیکن مثالی مومن کے ایمان نے ایسا کرنے نہ دیا کیونکہ یہ مثالی مومن ایک ایسا صاحب استقامت مسلمان تھا جسے رومیوں نے ڈیڑھ سال تک اپنی قید میں رکھا اور مسلسل پانچ ماہ تک اس کی گردن میں وزنی طوق اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پہنائے رکھی تھیں۔ ہر روز اس سے مطالبہ کیا جاتا کہ حضرت مسیح کے ابن اللہ ہونے کا اقرار کرلو تو اعزاز و اکرام سے رہا ہو کر اعلیٰ منصب پر فائز کر دیے جاؤ گے لیکن ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ چنانچہ نہ تو انہوں نے عقیدہ بدلا اور نہ قید کی حالت میں وقت ضائع کیا بلکہ وہاں سے رومی زبان سیکھ لی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایمان میں کسی وقت بھی تغیر آ سکتا ہے لیکن انسان ہر وقت اللہ سے ایمان کی سلامتی کی دعا کرتا رہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ ایمان جیسی نعمت کی حفاظت فرماتا ہے۔

ابوبکر انصاری تھیلی کو محفوظ مقام پر رکھ کر گھر سے باہر آئے تو ایک بزرگ آواز لگاتے سنائی دیئے:

”جو شخص میری موتیوں بھری تھیلی واپس کر دے وہ پانچ صد دینار (خالص سونے کے سکوں) کا حقدار ٹھہرے گا۔“

ابوبکر انصاری کے جی میں آیا کہ میں بھوکا اور محتاج ہوں۔ اگر میں تھیلی واپس کر کے پانچ صد دینار لے لوں تو اس میں کیا حرج ہے؟ لیکن فوراً ضمیر بیدار ہوا کہ کیا گمشدہ چیز کو واپس کرنا فرض نہیں ہے؟ اور کیا ایمان داری اور دیانت داری کی قیمت وصول کرنا ٹھیک ہے؟ دل سے آواز اٹھی کہ یہ امانت من و عن واپس کرو اور اپنے خالق و مالک سے رزق کا سوال کرو۔ چنانچہ انہوں نے بزرگ کا ہاتھ تھاما اور اسے اپنے گھر لے گئے۔ بڑے اکرام واحترام سے بٹھا کر کچھ سوالات کیے:

شیخ محترم! آپ کی تھیلی کی علامت کیا ہے۔؟

جی وہ ریشم سے بنی ہوئی ہے۔

اس تھیلی میں تسمہ کیسا ہے؟

جی وہ بھی ریشم کا بنا ہوا ہے۔

آپکے موتیوں کا رنگ کیسا ہے اور ان کی تعداد کتنی ہے؟

جی وہ مختلف رنگوں کے ہیں اور بیسیوں کی تعداد میں ہیں۔

جس دھاگے میں وہ پروئے ہوئے ہیں وہ کس رنگ کا ہے؟

وہ ریشمی اور سیاہ رنگ کا ہے۔

لیجئے صاحب یہ ہے آپ کی وہ تھیلی، آپ کی امانت جوں کی توں محفوظ ہے۔

شیخ نے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ تھیلی وصول کر لی اور موتی گننے لگا۔ جب تعداد پوری نکلی تو فرط مسرت سے جھوم اٹھا اور ''جزاک اللہ خیرًا'' کہنے لگا، اسے شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہ مل رہے تھے۔ چنانچہ اس نے حسب وعدہ پانچ صد دینار ابوبکر انصاری کی جھولی میں ڈال دیئے لیکن ابوبکر انصاری نے یہ کہہ کر واپس کر دیئے کہ:

شیخ محترم! گمشدہ چیز کا واپس لوٹانا واجب ہے اور اس امانت کا واپس کرنا مجھ پر مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے ویسے ہی فرض ہے لہٰذا اس دیانت داری کا آپ سے کبھی بدلہ نہ لوں گا۔

نہیں میرے عزیز! میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں یہ صلہ ضرور لیجئے گا۔

نہیں صاحب میں اس کا صلہ اپنے رب سے وصول کروں گا۔

اس کے بعد وہ بزرگ پر زور اصرار کرنے لگا لیکن ابوبکر انصاری اپنی بات پر قائم رہے اور وہ بوڑھا بزرگ وہاں سے شاداں وفرحاں اپنے وطن سدھار گیا۔

یہ شیخ اپنے وطن کا رئیس اور بہت مالدار شخص تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے یہ ہار اپنی

اکلوتی بیٹی کے لیے خریدا ہو۔ جب یہ شخص اپنے وطن میں پہنچ گیا تو تمام عمر اس نوجوان کی دیانت کا قصہ سناتا رہا بعدازاں وہ یہ خواہش کرتا کرتا فوت ہو گیا کہ کاش میں اس نوجوان مسافر کا نام اور پتہ پوچھ لیتا اور اس کے ساتھ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کر دیتا۔

کچھ عرصہ بعد ابوبکر انصاری مکہ مکرمہ سے نکلے اور اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے بحری جہاز پر سوار ہو گئے۔ اتفاق سے بحری جہاز سمندر کے درمیان پہنچ کر ٹوٹ گیا اور ابوبکر انصاری کے سوا تمام لوگ مع ساز و سامان غرق ہو گئے۔

خوش قسمتی سے انھیں لکڑی کا تختہ مل گیا اور بہت دنوں تک سمندری لہروں پر تیرتے رہے۔ انھیں چاروں طرف سے موت گھور رہی تھی۔ رات کی تاریکیاں، کالی گھٹائیں اور سمندر کی طوفانی لہریں "ظلماتٌ بعضُها فوق بعض" کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا جب کبھی خوفناک ہچکولا آتا تو کلیجہ حلق میں اٹک جاتا اور "اللهم احفظني" کی صدا زبان پر آ جاتی۔ بالآخر کئی دنوں اور راتوں کے بعد وہ تختہ کسی سمندری جزیرے کے کنارے جا لگا یہ دن اس کے لیے انتہائی خوشی کا تھا۔ اسے اس قدر خوشی تھی کہ گویا جہنم کا پل عبور کر آیا ہو۔

ابوبکر انصاری تختے سے اتر کر سب سے پہلے وہاں کی مسجد میں گئے اور سجدہ شکر ادا کیا۔ لیکن اب جائیں تو جائیں کہاں؟ نہ جان نہ پہچان۔ ان دیکھے چہرے اور پرائے لوگ۔ بالآخر رحمت خداوندی شامل حال ہوئی اور علم کی شان نظر آئی۔

جب جزیرہ والوں نے انھیں مسجد میں تلاوت کرتے سنا تو وہ شدت اشتیاق سے ان کو دیکھنے آئے اور یکے بعد دیگرے ان کی ضیافت کرنے لگے۔

انہوں نے فرمائش کی کہ وہ ان کے بچوں، بچیوں، مردوں اور عورتوں کو قرآن مجید کی تعلیم دیں۔ چنانچہ انہوں نے پوری محنت اور ذمہ داری سے یہ خدمت سرانجام دی اور وہ بھی دل و جان سے ان کی خدمت کرنے لگے۔ ابوبکر فرماتے ہیں کہ ایک

دن انہوں نے مجھے مسجد میں مصحف شریف کے چند اوراق کا مطالعہ کرتے دیکھا تو فرطِ مسرت سے پوچھنے لگے۔

کیا آپ لکھ بھی سکتے ہیں؟

جب میں نے اثبات میں سر ہلایا تو انہوں نے اپنے بچوں کو کتابت سکھانے کا اشتیاق ظاہر کیا، چنانچہ ابوبکر انصاری نے بڑی محنت سے ان کے بچوں اور جوانوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھا دیا تو انہوں نے بڑی عقیدت سے اپنے بچوں کے استاد پر مال وزر نچھاور کرنا شروع کر دیا۔ یہ چند مہینوں میں جزیرے کے محترم اور مالدار انسان بن گئے۔

علم کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے قدر دانوں کو تحت الثریٰ سے فوق الثریا لے جاتا ہے۔ ابوبکر انصاری کے ساتھ ان کی عقیدت اس حد تک بڑھی کہ انہوں نے اسے مستقل اپنے پاس ٹھہرانے کے لیے اپنے جزیرے کی مالدار خاتون سے شادی کی پیشکش کر دی لیکن اس نے یہ پیشکش قبول نہ کی۔ البتہ جب ان کا اصرار بڑھا تو یہ آمادہ ہو گئے۔

چنانچہ بڑی دھوم دھام سے شادی کی تقریب منعقد ہوئی جب دلہن گھر لائی گئی تو یہ اپنی بیوی کے چہرے کو دیکھنے کی بجائے اسکی گردن اور سینے پر نظر جما کر بیٹھ گئے کیونکہ جو ہار انہوں نے مکہ مکرمہ میں واپس لوٹایا تھا وہ بعینہ اس خاتون کے گلے میں تھا۔ جب لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو پوچھا: کیا یہ ہار اس خاتون سے زیادہ خوبصورت ہے جو آپ مسلسل اس پر نگاہ جما کر بیٹھ گئے ہیں؟

تب انہوں نے اس ہار کی گمشدگی اور بازیابی کی کہانی سنائی تو سننے والوں نے بے ساختہ اتنی بلند آواز سے نعرہ تکبیر لگایا کہ پورے جزیرے کے لوگ جمع ہو گئے۔ جب ابوبکر انصاری نے نعرہ لگانے والوں سے اس نعرے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ ہم نے جس خاتون سے آپ کا نکاح کیا ہے یہ اسی بزرگ کی

اکلوتی لخت جگر ہے اور وہ بزرگ ہمیں اس ہار کی گمشدگی اور بازیابی کا قصہ سنا کر فرمایا کرتے تھے کہ اس دنیا میں اگر کوئی صحیح معنوں میں مسلمان ہے تو وہی نوجوان ہے جس نے اس قدر قیمتی ہار مجھے واپس کر دیا تھا کاش کہ وہ مجھے مل جائے تو میں اپنی بیٹی سے اس کا نکاح کر دوں۔ اس کے بعد وہ دعا کیا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ اجْمَعْ بَيْنِي وَبَيْنَه حَتّٰى أُزَوِّجَهُ بِابْنَتِي))

''اے اللہ! مجھے اور اس نوجوان کو اکٹھا کرتا کہ میں اس سے اپنی بیٹی کی شادی کر دوں۔''

سبحان اللہ!

آج اس کی آرزو پوری ہوگئی اور وہی لڑکی اب آپ کے نکاح میں ہے۔

اللہ اکبر! اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو کوئی انسان اس کے خوف سے حرام مال سے بچ جائے گا تو وہ اسے حلال طریقے سے اتنا مال دے گا جو اس کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا۔

آگے سنیے!

علامہ ابوبکر انصاری فرماتے ہیں کہ اس کی بعد وہ خاتون ایک عرصہ تک میرے نکاح میں رہی۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس سے دو بیٹے عطا کیے۔ اس کے بعد وہ اللہ کو پیاری ہوگئی۔ مجھے اس ہار کا چوتھائی حصہ ترکہ میں ملا۔ کچھ عرصہ کے بعد میرے دونوں بیٹے بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ ہار سارے کا سارا میرے حصے میں آ گیا۔ چنانچہ میں نے اسے ایک کروڑ دینار میں فروخت کر دیا اور یہ مال جو تمہیں نظر آ رہا ہے یہ اسی ہار کی قیمت سے خریدا گیا ہے۔

---

[1] اس قصے کا اصل طبقات حنابلہ مؤلفہ زین الدین علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن رجب بغدادی میں ہے۔

حجِّ مَبرُور[1]

خوش نصیب مروزی عازمین حج کا اشتیاق قابل دید تھا۔ وہ عرصہ دراز سے بیت اللہ کی زیارت کے شوق میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔ برسہا برس کی جہد مسلسل کے بعد انہوں نے حج کا زادِ راہ جمع کر لیا تھا۔ ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اتنی محنت شاقہ سے رقم جمع کرنے کے بعد اگر مناسک حج مکمل نہ کر سکے یا ادھورے رہ گئے تو ایسے حج کا فائدہ؟

کیوں نہ ہو کہ یہ سفر کسی عالم ربانی کے ساتھ کیا جائے جو انھیں مناسک حج بھی مکمل کروائے اور ایمان افروز دروس بھی دیتا رہے چنانچہ نگاہ انتخاب حضرت عبداللہ بن مبارکؒ پر پڑی جو ہر سال تین ماہ فریضہ حج کی ادائیگی میں، تین ماہ طلب حدیث اور، تین ماہ تجارت اور تین ماہ جہاد میں صرف کرتے تھے اور برسوں سے اس راہ کے مسافر بھی چلے آرہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اس صدی کے عالم لاثانی تھے۔ جہاں کہیں جاتے ایک عالم ان کے دیدار کو اُمڈ آتا اور جب تک کسی شہر میں قیام پذیر رہتے، وہاں رونقیں ہی رونقیں نظر آتیں اور جب کسی شہر سے کوچ کرتے تو رونقیں بھی ساتھ ہی لے جاتے بلکہ مروزی شاعر تو ان کے جانے کے بعد یہ شعر گنگنایا کرتے تھے۔

مَا سَارَ عَبْدُ اللّٰهِ عَنْ مَروٍ بِلَيْلَةٍ　　　فَقَدْ سَارَ عَنْهَا نُورُهَا وَجِمَالُهَا

"جس روز عبداللہ بن مبارکؒ مرو سے کوچ کرتے ہیں شہر کا نور و جمال

بھی ساتھ ہی رخصت ہو جاتا ہے‘‘

الغرض مروزی عازمین حج کی تمنا اور آرزو انہیں پہنچا دی گئی جو انہوں نے خندہ پیشانی سے قبول کر لی لیکن چند شرائط کے ساتھ۔ ایک تو یہ کہ ہر عازم حج کو روانگی سے قبل اپنی تمام رقم ان کے حوالے کرنی ہوگی اور کوئی آدمی اس کے متعلق باز پرس کا مجاز نہ ہوگا۔ وہ عبداللہ کی مرضی پر منحصر ہے کہ اس سے جتنا چاہے خرچ کرے اور جہاں چاہے خرچ کرے۔

اس شرط کو سن کر حجاج کرام لمحہ بھر سوچنے لگے۔ بالآخر انہوں نے بخوشی یہ شرط منظور کر لی۔ کیونکہ عبداللہ بن مبارکؒ ایسے انسان تو نہ تھے جو وفد حج کے امیروں کی طرح ان کی رقم اینٹھ کر اپنا سفر خرچ بچا لیتے۔ جیسا کہ آج کل کے کاروباری حجاج ہر سال حج کے نام پر اپنے ساتھیوں سے عموماً کرتے ہیں۔

دوسری شرط یہ کہ ان کے سوا کوئی دوسرا شخص سفر حج کے دوران حاجیوں کی خدمت نہ کر سکے گا، الا یہ کہ وہ عبداللہ بن مبارکؒ سے اجازت حاصل کر لے۔ مروزی حجاج کرام نے حیرانی کے بعد یہ شرط بھی پہلی شرط کی طرح قبول کر لی اور ان کے لیے ایسا کرنا بڑی سہولت کا باعث تھا کیونکہ اکٹھا چلنے، اکٹھا خرچ کرنے، اکٹھا خریدنے اور اکٹھا عبادت کرنے میں برکت ہی برکت ہے اور پھر انہیں تجربہ بھی نہ تھا۔ چنانچہ تمام مروزی عازمین حج اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ گئے اور حسب وعدہ اگلے دن اپنا اپنا سفر خرچ لے کر حضرت عبداللہؓ کی فرودگاہ پر حاضر ہو گئے۔

حضرت نے ہر ایک سے اس کی تھیلی وصول کر کے اس کی رقم گن کر اس کا نام اور تاریخ وصولی درج کر لی۔ تمام تھیلیاں صندوق میں رکھوا کر اسے تالا لگا دیا اور تمام عازمین حج کو مکمل تیاری کے ساتھ مقررہ تاریخ پر قافلہ میں شامل ہونے کی تاکید کر دی۔

......☆......

ان دنوں سفر کے لیے ہوائی جہازوں، ریلوں اور بسوں کا وجود نہ تھا کہ جھٹ سوار ہوئے اور دو گھنٹے بعد جدہ ائر پورٹ پر اتر گئے بلکہ مہینوں کا سفر پیدل یا دبلے پتلے اونٹوں پر کرنا پڑتا تھا چنانچہ مقررہ تاریخ پر یہ قافلہ خراسان سے ایران، ایران سے عراق، عراق سے حجاز مقدس تک چٹیل میدانوں اور سنگلاخ پہاڑوں کو عبور کرتا رہا۔ راستہ میں جہاں کہیں فجر کو ناشتے اور دوپہر کو کھانے اور ستانے کے لیے دستر خوان سجانے اور خیمہ زنی کی نوبت آتی تو حضرت عبداللہ بن مبارکؒ ان کے لیے عمدہ عمدہ کھانے ٹھنڈے اور شیریں مشروبات مہیا کرتے۔ رات کو خیمہ نصب کرنے اور بستر بچھانے کی ڈیوٹی بھی سرانجام دیتے۔

ساتھیوں نے بارہا خدمت میں حصہ لینا چاہا لیکن یہ انھیں اپنی شرط یاد دلا کر روک دیتے اور خود ان کی خدمت میں مشغول رہتے۔

عازمین حج: حضرت! اگر ہمارے ہوتے ہوئے سارے کام آپ ہی نے کرنے ہیں تو ہم کس مرض کی دوا اور کس بیماری کا علاج ہیں؟

عبداللہ بن مبارک: صاحبو! میرے ساتھ کیے ہوئے عہد پر قائم رہو اور جو عہد میں نے تم سے روانگی کے وقت لیا تھا اس پر پورے اترو۔ اگر حج جیسے مقدس سفر میں بھی یہ عہد پورا نہ ہوا تو پھر کس موقع پر ہوگا؟

عازمین حج: حضرت ہمیں کیا معلوم تھا کہ آپ ہمیں اپنی شرائط سے یوں باندھ لیں گے کہ ہم معمولی خدمات بھی سرانجام نہ دے سکیں۔

عبداللہ بن مبارک: میں نے یہ شرطیں کچھ ایسے ہی نہیں لگائی تھیں بلکہ اس امید پر لگائی تھیں کہ میں اور آپ ان پر پورا اتریں۔

عازمین حج: حضرت! ہمیں بستر بچھانے، کھانا پکانے اور برتن دھونے کی تو اجازت دیجیے۔ یقین جانیے ہمیں آپ کو خدمت سرانجام دیتے دیکھ کر شرم آتی ہے۔

عبداللہ بن مبارک: نہیں صاحبو! میرے لیے اس سے بڑھ کر اور سعادت کیا ہو سکتی ہے کہ میں ضیوف الرحمٰن کا خادم بنوں۔

اس موقعہ پر اس بات کو بتا دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ اس دور کے عازمین حج ایسی شرائط کیوں لگاتے اور خدمت اپنے ذمے کیوں لیتے تھے۔ وجہ یہ ہے کہ حضرت رسول کریم ﷺ فرماتے ہیں: ((الحج المبرور لیس له جزاء إلّا الجنة)) ''کہ حج مبرور کا ثواب جنت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔'' اور حج مبرور کی وضاحت بھی فرما دی کہ ((إطعام الطعام وإفشاء السلام وطیب الکلام)) ''کہ دوسروں کو کھانا کھلانا اور سلام میں پہل کرنا اور میٹھا بولنا۔''

حضرت خالد بن معدان کی مرسل روایت ہے کہ حضرت نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: اگر کسی شخص میں یہ تین خصلتیں نہ ہوں تو اسے اس گھر کا حج کرنے سے کیا حاصل ہوگا؟

(۱) تقویٰ و پرہیز گاری جو اسے اللہ کے حرام کردہ کاموں سے بچائے۔

(۲) بردباری جو اسے بجا اور بے جا غصہ اور جہالت کے کاموں سے بچائے۔

(۳) حسن رفاقت جو اپنے ہم سفروں سے کرنی پڑتی ہے۔

حضرت ربیعہ فرماتے ہیں کہ سفر میں مروت تین کاموں میں ہے۔

(۱) اپنا مال دوسروں پر خرچ کرنا۔

(۲) ساتھیوں کی مان لینا اور مخالفت نہ کرنا۔

(۳) اور دل لگی کرنا ایسی دل لگی جس میں اللہ کی ناراضی نہ ہو۔

حضرت ابو قلابہؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک وفد آیا اور اپنے کسی ساتھی کی تعریف کرنے لگا کہ اگر وہ ہمارے ساتھ چلتا تو تلاوت قرآن میں مصروف رہتا اور ہم پڑاؤ کرتے تو وہ نوافل ادا کرتا رہتا۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا

اس کی سفری ضرورتیں کون پوری کرتا تھا۔ آپ نے ان ضرورتوں کا نام لے لے کر پوچھا: حتی کہ یہ بھی پوچھا: اس کی سواری کو چارہ کون ڈالتا تھا؟ انہوں نے کہا کہ ہم سب! تو آپ نے فرمایا تم سب اس سے بہتر ہو۔

سلف صالحین میں سے ایک بزرگ جب حج کو نکلتے تو وہ ساتھیوں کے ساتھ شرط کر لیتے کہ سفر حج میں خدمت وہ خود ہی سرانجام دیں گے۔ چنانچہ وہ ساتھیوں کے کپڑے دھوتے اور انھیں غسل کراتے۔ اگر کوئی ساتھی خود اپنا کام کرنا چاہتا تو یہ اسے روک دیتا اور کہتا کہ یہ میری شرط ہے۔ چنانچہ جب وہ فوت ہوئے تو انہوں نے غسل دیتے وقت اس کے ہاتھ کی جلد کے نیچے اور گوشت کے اوپر یہ لکھا ہو پڑھا: ”من أهل الجنة“

بهيم عجلى بڑے عابد وزاہد بزرگ تھے۔ تلاوت قرآن اور نماز میں اپنے آنسوؤں پر کنٹرول نہ رکھ سکتے تھے۔ وہ ایک مال دار تاجر کے ہمراہ سفر حج کے لیے نکلے تو اس دن کو یاد کر کے رو دیئے جب دنیا قبروں سے اٹھ کر اللہ کے سامنے پیش ہو گی۔ تاجر کو اپنا سفر حج بوجھل اور بور ہوتا نظر آیا۔ لیکن جب حج سے واپس لوٹے تو بهيم عجلى کو تاجر کے ساتھ بھجوانے والے دوست نے تاجر سے بهيم کا حال احوال پوچھا۔ اس نے بتایا کہ شاید آج کل اس دنیا میں اس جیسا انسان موجود نہ ہو۔ میں جوان وہ بوڑھا، میں مالدار وہ فقیر لیکن اس کے باوجود وہ اپنا پیسہ میرے اوپر خرچ کرتا اور خود روزے سے ہوتا۔ مجھے کھانا پکا کر کھلاتا اور دوران سفر نماز اور تلاوت قرآن کے وقت خود بھی روتا اور ہمیں بھی رلاتا۔

الغرض عبداللہ بن مبارکؒ نے بھی اپنے حج کو مبرور بنانے کے لیے ساتھیوں سے خدمت کی شرط منظور کرالی۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھیوں کے کپڑے دھوتے، دسترخوان بچھاتے اور کھانا کھلاتے رہے۔ ساتھیوں نے تمام امور سے بے فکری کی

بنا پر خوب جی بھر کر طواف کیے، نمازیں پڑھیں، صفا مروہ کی سعی کی، من پسند قربانیاں کیں۔ من مرضی کا کھایا اور من مرضی کا پہنا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہماری رقم مشترکہ ہے اور وہی خرچ ہو رہی ہے۔

مناسک پورے ہونے کے بعد آتش شوق بجھانے کے لیے مدینہ الرسول ﷺ کا قصد کیا تاکہ اپنے اس ہادی و مرشد کے شہر اور مسجد کی زیارت کریں جس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو صراط مستقیم پر گامزن کیا اور اس رحمۃ للعالمین پر دورد پڑھیں جس پر اللہ اور اس کے فرشتے بھی دورد بھیجتے ہیں۔

چنانچہ شدت شوق کی وجہ سے ان کے قدم زمین پر ٹک نہ سکتے تھے۔ جونہی انہیں ثنیۃ الوداع کی پہاڑیاں نظر آئیں، ان کے دل سینوں میں رقص کرنے لگے۔ وہاں کی جھلسا دینے والی گرمی ایمان کے برفاب سے بادنسیم محسوس ہونے لگی۔ سیدھے مسجد نبوی ﷺ میں گئے تو اس کی رونق نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ نہایت خشوع و خضوع سے تحیۃ المسجد ادا کر کے روضۃ الرسول ﷺ کی طرف چلے، بید کی طرح لرزتی کانپتی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر درود کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنکھوں میں عقیدت و محبت کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

......اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ حضرت رسول مقبول ﷺ فرما گئے ہیں کہ میرے بعد میرے ایسے بھی امتی ہوں گے جو خواہش کریں گے کہ کاش انھیں اپنے پیغمبر کا دیدار نصیب ہو جائے۔ اگرچہ ان کی خاطر ان کے اہل و عیال قربان ہو جائیں۔

المختصر وہ مدینہ کی زیارت سے آنکھیں روشن کرنے کے بعد واپس مکہ آئے اور الوداعی طواف کیا۔ اس کے بعد انھیں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے جمع کر کے فرمایا؛ اب وطن واپسی کا مرحلہ درپیش ہے۔ لہٰذا اپنے اہل خانہ کے لیے تحائف اور ہدیہ جات کے متعلق کھل کر بتانا کیونکہ ہمارے پاس کافی رقم موجود ہے۔

سب نے اپنی اپنی پسند کی چیزیں بتائیں تو آپ ان کو لے کر مکہ کے بازاروں میں چلے گئے۔ حجاج کرام جس چیز کو ہاتھ لگاتے، آپ وہ چیز اس کے لیے خرید لیتے۔ جب تمام ساتھیوں نے جی بھر کر تحائف اکٹھے کر لیے تو واپسی کا سفر شروع ہوا۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ حسب سابق خدمات سرانجام دیتے رہے۔ چنانچہ مروزی حجاج کرام کا یہ قافلہ شہروں اور بستیوں، پہاڑوں اور میدانوں، سرسبز کھیتوں اور ندی نالوں کو عبور کرتا ہوا سرزمین مرو میں داخل ہوا۔ عزیز واقارب، پڑوسیوں اور شہریوں کا جلوس مارے خوشیوں کے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

اہل ایمان کے ساتھ مخلوق الٰہی کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا

[مریم]

''بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، اللہ ان کے مقدر میں محبت ومودت کر دے گا۔''

جس شہر اور بستی میں عبداللہ بن مبارکؒ کی آمد کی اطلاع ہوتی، وہاں کے باسی ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے امڈ آتے۔ رقہ میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی آمد کی اطلاع جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ پورا شہر ان کے استقبال کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ خلیفۃ المسلمین ہارون الرشید کی بیوی اپنے محل پر چڑھی تو اسے شہر کے گلی کوچے لوگوں سے خالی نظر آئے۔ اس نے وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ آج عبداللہ بن مبارکؒ آ رہے ہیں۔ شہر کے مرد وزن، خرد وکلاں ان کے استقبال کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں۔ وہ حیران ہو کر کہنے لگی: لوگوں کے دلوں پر حکمرانی تو عبداللہ بن مبارکؒ کی چل رہی ہے۔ میرے خاوند کے استقبال کے لیے ڈنڈوں کے بغیر کوئی نکلنے کو تیار نہیں جبکہ ان کے لیے از خود پورا شہر خالی ہو گیا۔ اسی طرح اہل مروزی عوام

ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تابانہ نکل آئی۔ اور پھر ضیوف الرحمٰن جو بیت اللہ کا تازہ دیدار کر کے آئے ہوں، ان کا استقبال کرنا باعث اجر وثواب بھی ہے۔

الغرض ضیوف الرحمٰن کے خاندانوں نے انہیں اپنے بازوؤں میں لے کر سینوں سے چپکایا اور تین ماہ کے طویل فراق کی وجہ سے روتے ہوئے انھیں اپنے گھروں میں لے گئے۔ ہفتہ عشرہ کے اندر اندر حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے اپنے ساتھی حجاج کرام کی دعوت کی اور تناول طعام کے بعد انہیں بٹھا کر دوران سفر کسی کوتاہی کی معذرت کی جس پر سب حجاج کرام شرما کر کہنے لگے حضرت جی! معذرت کس بات کی؟ کاش کہ آپ کا شکریہ ادا کرنے کی کوئی سبیل نکل آئے کیونکہ آپ نے ہمیں آرام وسکون مہیا کیا۔ ہم تو اتنے آسان سفر حج کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے اپنے گھر سے وہی صندوق منگوایا جس میں ان کی تھیلیاں رکھی ہوئی تھیں اور ان سے کہا: آپ کو وعدہ یاد ہے جو آپ نے میرے ساتھ کیا تھا؟

حجاج کرام: کون سا وعدہ جناب؟

عبداللہ بن مبارک: کہ آپ لوگ میرے کسی کام پر اعتراض نہ کریں گے۔

حجاج کرام: جی ہاں اور ہم اس پر قائم بھی رہے۔ سارے سفر میں آپ نے ہمیں اعتراض کا موقعہ بھی نہیں دیا اور ہمیں خدمت میں حصہ نہ لے سکنے پر شرمندگی بھی ہے۔

عبداللہ بن مبارک: صاحبو! ابھی آپ کے ایفائے عہد کا امتحان باقی ہے۔

حجاج کرام: حضرت وہ کیا ہے؟

عبداللہ بن مبارک: (غلام کو آواز دیتے ہوئے) اللہ کے بندے ادھر آ اور صندوق کھول۔

حجاج کرام حیرت میں ڈوب گئے اور سوچنے لگے کہ پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے۔ اس نے صندوق کھولا اور تھیلیوں کی گٹھڑی نکال کر ان کے آگے رکھ دی۔ حضرت عبداللہ تھیلیوں پر نتھی کی گئی پرچیوں پر نام پڑھ کر ایک ساتھی سے کہنے لگے: صاحب! یہ لو اپنی تھیلی۔ یہ آپ ہی کی ہے نا! اسے کھولیے اور گن لیجیے ان شاء اللہ آپ کی رقم پوری ہوگی۔ اس کے بعد سب ساتھیوں کے آگے ان کی تھیلیاں رکھ دیں اور انھیں گن لینے کا حکم دیا۔ حجاج کرام حضرت عبداللہ بن مبارک کے اس عمل پر دنگ رہ گئے اور بیک زبان ہو کر بولے: حضرت آپ نے یہ کیا کیا؟ آپ ہماری رقوم یہیں چھوڑ گئے تھے۔

عبداللہ بن مبارک: آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے؟

حجاج کرام: ہم اعتراض نہیں کر رہے لیکن ہم نے یہ رقوم حج بیت اللہ کے لیے عرصہ سے جمع کر رکھی تھیں اور آپ ہمیں واپس کر رہے ہیں۔ ہمارے حج کیسے ہوئے اور خرچ کہاں سے کرتے رہے؟

عبداللہ بن مبارک: آپ اپنے حج اللہ کے مال سے کرتے رہے اور ان شاء اللہ آپ کو ثواب بھی پورا ملے گا۔

حجاج کرام: ہماری تو ایک پائی بھی خرچ نہ ہوئی تو پورا ثواب کیسے ملے گا؟

عبداللہ بن مبارک: خلوص، حسن نیت اور حسن عمل کی بنا پر۔

حجاج کرام: حضرت! آپ نے ہمیں پہلے کیوں نہ بتایا کہ کھانے پینے اور تحائف خریدنے میں احتیاط سے کام لیتے۔ واللہ! ہم تو آج تک یہی سمجھتے رہے کہ آپ ہم پر ہمارا ہی پیسہ خرچ کر رہے ہیں اور باوجود یہ کہ ہمارے دلوں میں کھٹکا پیدا ہوتا تھا کہ ہمارا پیسہ اتنا تو نہ تھا جتنا خرچ ہو رہا ہے لیکن یہ سوچ کر خاموش ہو جاتے کہ شاید اکٹھا کھانے اور اکٹھا خرچ کرنے اور اکٹھا خریدنے

کی برکت ہو۔

عبداللہ بن مبارک: بھائیو! اگر میں یہ عمل پہلے بتا دیتا تو ممکن تھا کہ آپ مناسک حج میں وہ محنت نہ کرتے جو آپ نے اپنا پیسہ خرچ ہونے کے خیال سے کی۔ اب آپ کا حج بھی ہو گیا اور رقم بھی محفوظ رہی۔

حجاج کرام: حضرت! آپ یہ رقوم اپنے پاس رکھیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حسن نیت کا اجر نصیب فرمائے گا اور حسن عمل کا بھی۔ ہمیں یہ رقوم گھر لے جاتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔

عبداللہ بن مبارک: اللہ تعالیٰ آپ کو بھی آپ کی نیت اور حسن عمل کا ثواب دے گا اور مجھے بھی اور رقوم کی واپسی کے بغیر وعدہ پورا نہ ہو گا۔ للہ وعدہ پورا کیجیے۔

حجاج کرام اس منفرد جود و سخا اور اخلاص عمل پر دیوانہ وار شکریہ ادا کرنے لگے اور اپنی اپنی رقوم لے کر گھروں کو لوٹ گئے۔

......☆......

[1] اس قصے کا اصل لطائف المعارف ابن رجب میں ہے۔

ہونہار محدث [1]

ابراہیم حنظلی کو اپنے گھر بیٹا پیدا ہونے کی نوید ملی تو اس کا دل وفورِ مسرت سے لبریز ہوگیا اور اس کا جی چاہا کہ وہ اُڑ کر گھر چلا جائے لیکن اس کے بدن کو پر تو لگے ہوئے نہ تھے، جن سے وہ اُڑتا اور گھر کے صحن میں جا اُترتا۔ بندہ بشر ہونے کی وجہ سے اسے زمین پر ہی چل کر جانا تھا، سو وہ گھر کی طرف چل دیا، البتہ اس سفر میں اس کے قدم زمین پر ٹکتے نہ تھے، وہ اس قدر تیز چل رہا تھا کہ گویا وہ ہوا کے دوش پر اُڑ رہا ہو۔ وہ دنوں کا سفر گھنٹوں اور گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے کرتا ہوا گھر جا پہنچا، گھر کا صحن بچے کا دیدار کرنے اور مبارک باد دینے والوں سے بھرا ہوا تھا، یہ ان کے درمیان تیزی سے یوں گذرا جیسے وہ کوئی جامعہ سے ممتاز پوزیشن حاصل کرنے والا طالب علم ہے، جو تمغہ امتیاز وصول کرنے کے لیے اسٹیج کی طرف جا رہا ہے۔ اس نے جاتے ہی اپنے بیٹے کو اس کی ماں کے پہلو سے اُٹھایا، اس کا منہ چوما اور سینے سے چپکایا اور پھر اسے اس کی ماں کے پہلو میں لٹکا دیا اور ذرا پیچھے ہٹ کر اسے غور سے دیکھنے لگا، اسے اپنے چاند سے بیٹے کی شکل وصورت بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ اسی دوران اس کی نظر بچے کے کانوں کی لو پر پڑی تو ان میں ایک ایک باریک سوراخ نظر آیا، یہ سوراخ دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہ اس بچے کے کانوں کی لو میں سوراخ کیسے ہوگئے۔ آیا یہ کسی کی نظر بد کا اثر ہے یا کسی کے جادو ٹونے کا یا یہ کوئی پیدائشی امر ہے۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ سیدھا امام فضل بن موسیٰ سینانی کے پاس چلا گیا

اور ان سے پوچھنے لگا۔

حضرت میرے گھر میں اللہ کے فضل و کرم سے چاند سا بچہ پیدا ہوا ہے، جو ہے تو بہت خوبصورت لیکن اس کے دونوں کانوں کی لو میں ایک ایک باریک سوراخ ہے، اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟

انھوں نے فرمایا کہ اصل وجہ تو میں بھی نہیں جانتا کہ ان میں یہ سوراخ کس سبب سے ہے لیکن میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تیرا یہ بیٹا یا تو دین میں امام ہوگا یا دنیا میں۔

یہ بات انھوں نے اس بنا پر کہی کہ یہ بچہ جو پیدائشی طور پر عام بچوں سے منفرد ہے، تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ شخصیت کے اعتبار سے بھی منفرد ہوسکتا ہے، اس لیے اس نے اندازہ لگالیا کہ اس بچے کو یا تو دینی ریاست ملے گا یا دنیاوی۔

ابراہیم حنظلی یہ بات سن کر واپس آگئے اور تا زندگی اسی دعا میں لگے رہے کہ اے ربّ العالمین! میرا یہ بچہ خیر میں ہی امام اور پیشوا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے کی نہاں خانہ دل سے نکلنے والی دعا قبول فرمائی اور اس کے بچے نے دو تین سال بعد اللہ کے نام سے اپنی تعلیم کی ابتداء کردی۔ اللہ نے اسے اس قدر شاندار حافظہ عطا فرمایا کہ وہ جو کچھ پڑھتا وہ اسے حفظ ہو جاتا اور جو کچھ حفظ ہو جاتا وہ زندگی بھر نہ بولتا اور اسے پڑھی ہوئی کتاب کے مضامین اور صفحوں اور سطروں اور لفظوں سمیت یاد رہتے، اس کے حافظے کی مثال، صدیوں بعد وجود میں آنے والے کمپیوٹر سے دی جاسکتی ہے۔ جس میں پورا کتب خانہ فیڈ کر کے فوراً یا سالوں بعد اس کا لفظ بلفظ پرنٹ لیا جاسکتا ہے۔ غرضیکہ یہ بچہ اللہ کے فضل و کرم اور بے مثال حافظے اور خلوص کی بدولت اپنے دور کا نامور محدث بن گیا، اس دور کے مسلمانوں کو جب کبھی کسی مسئلہ کی تحقیق مطلوب ہوتی

اور وہ اس سے پوچھتے تو یہ سالہا قبل پڑھی ہوئی کتابوں کے الفاظ تک سنا دیتا۔ اس کے حافظے کی مضبوطی اور تیزی دیکھ کر میرا خراسان عبداللہ بن طاہر بن حسین اور اس کا پورا دربار عش عش کر اُٹھتا۔

امیر عبداللہ جو امیر المؤمنین مامون الرشید کے نامور جرنیل طاہر بن حسین کا بیٹا تھا، وہ اپنے باپ کی طرح علماء و فضلاء کا بڑا قدر دان تھا اور علمائے ربانیین کی جوتیاں سیدھا کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا، اسے کسی مسئلہ کی تحقیق مطلوب ہوئی تو اس نے اپنے بھرے دربار میں اس محدث سے وہ مسئلہ دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ اے امیر محترم اس مسئلے میں نبوی طریقہ تو اس طرح ہے، البتہ امام نعمانؒ بن ثابت اور ان کے رفقاء کا فتویٰ اس کے خلاف ہے اور پھر ان کے فتویٰ کے الفاظ بیان کر دیے۔

اس مجلس میں امام نعمانؒ کے معتقد جناب ابراہیم بن صالح بھی موجود تھے، ان سے یہ بات برداشت نہ ہوسکی اور وہ آگ بگولہ ہو کر بولے کہ انھوں نے اس حدیث کے برخلاف کوئی فتویٰ نہیں دیا۔

ائمہ کرام رحمہم اللہ علیہم اجمعین کے مقلدین میں اس دور سے لے کر آج تک یہ بات چلی آرہی ہے کہ انھیں اپنے غیر معصوم ائمہ کے غیر مستند اقوال، معصوم امام الانبیاء کی مستند اور صحیح احادیث سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ جتنی آسانی سے صحیح احادیث ردّ کر دیتے ہیں، اتنی آسانی سے اقوال آئمہ ردّ نہیں کرتے، بلکہ ان کی خاطر بڑے بڑے مناظرے اسٹیج کر لیتے ہیں ان کی بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ مسائل کے دلائل میں صحیح الاسناد احادیث رسول پیش کرنے والا ناکام ہو جائے اور اقوال ائمہ پیش کرنے والا جیت جائے، اسی جذبے اور خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر جناب ابراہیم بن صالح بھی دربار عام میں کود

پڑے اور انھوں نے اس محدث کو سرعام جھٹلا دیا تاہم اس محدث نے برا نہ منایا اور بڑی سنجیدگی سے جواب دیا کہ میں نے ان کا یہ فتویٰ تیرے دادا کی فلاں کتاب میں پڑھا تھا اور یہ اس دور کی بات ہے جب وہی اور میں اکٹھے ایک ہی کتاب سے پڑھا کرتے تھے۔

جناب ابراہیم بن صالح کھڑے ہوئے اور بولے:

اے امیر محترم، اللہ تجھے درست رکھے، اس نے میرے دادا پر جھوٹ بول دیا ہے، میرے دادا کی کتاب میں ان کا ایسا فتویٰ ہرگز موجود نہیں۔

اس محدث دوراں نے اس بات کا بھی برا نہ منایا اور بڑی متانت سے بولے:

اے امیر محترم! آپ کسی آدمی کو بھیج کر اس کتاب کی جلد نمبر فلاں منگوائیں، میں آپ کو اس میں ان کا یہ فتویٰ ابھی دکھا سکتا ہوں۔

امیر عبداللہ نے کسی آدمی کو بھیج کر محولہ کتاب کی مطلوبہ جلد منگوالی اور اس کے اوراق پلٹ پلٹ کر امام نعمان اور ان کے رفقاء کا فتویٰ تلاش کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر اس نابغہ محدث نے فرمایا:

اے امیر! اللہ تعالیٰ آپ کو راہِ مستقیم پر گامزن رکھے، آپ اس کتاب کے شروع والے اکیس اوراق پلٹ کر اکیسویں ورقے کی ساتویں سطر پر یہ فتویٰ پڑھ لیں۔

جب امیر عبداللہ نے اکیس اوراق گن کر ساتویں سطر پر نظر ڈالی تو وہ یہ دیکھ دنگ رہ گیا کہ اس میں نعمان اور ان کے رفقاء رحمہم اللہ کا فتویٰ بعینہٖ موجود ہے۔ پھر کہنے لگا:

حضرت مجھے آپ کی یادداشت پر تعجب تو ہوا ہے لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ آپ کو اس دور کی پڑھی ہوئی کتاب کی جلد نمبر، صفحہ نمبر اور سطر نمبر بھی یاد ہے!

جی ہاں! تا کہ اللہ تعالیٰ، آپ کے سامنے اس طرح کے اعداء السنہ کو رسوا کرے۔ یہ سن کر امیر عبداللہ نے پوچھا:

"مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کو ایک لاکھ اسنادِ حدیث یاد ہیں، کیا یہ بات صحیح ہے؟"

آپ نے فرمایا:

ایک لاکھ اسنادِ حدیث والی بات تو میں نہیں جانتا، لیکن اتنی بات صحیح ہے کہ میں جو چیز پڑھ یا سن لیتا ہوں وہ میرے حافظے میں محفوظ ہو جاتی ہے اور پھر وہ مجھے زندگی بھر نہیں بھولتی۔

فضل بن موسیٰ سینانیؒ کی فراست مومنانہ کے مطابق یہ بچہ اللہ کے بے پایاں فضل و کرم سے اپنے دور کا یگانہ محدث اور فقیہ ثابت ہوا۔ اس نے اپنے ملک میں معتزلہ، جھمیہ، معطلہ اور دیگر اہل بدعت کی کمر توڑ دی اور بڑی دلیری کے ساتھ، توحید وسنت کا پرچم اُٹھائے رکھا یہ محدث یگانہ، فقہ القرآن، فقہ السنہ، جرح وتعدیل اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں اپنے دور کا منفرد اور لاثانی پیشوا ثابت ہوا۔ اور بڑے بڑے ائمہ دین کا استاد بنا، اس کے علم وفضل کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ امام محمد بن اسلم طوسی نے اپنے کسی ہم عصر سے کہا کہ سفیان بن سعید ثوری آج زندہ ہوتے تو حصولِ علم میں اس محدث کے محتاج ہوتے۔

جب ان کی اس بات کی خبر امام احمد بن سعید رباطی کو دی گئی تو اس نے کہا:

اللہ کی قسم! اگر امام سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ اور امام حماد بن سلمہ اور امام حماد بن زید بھی زندہ ہوتے تو اس کے علم کے محتاج ہوتے۔

جب ان کی اس بات کی خبر، امام محمد بن یحییٰ صفان کو دی گئی، تو اس نے کہا:

اللہ کی قسم! اگر امام حسن بصریؒ آج زندہ ہوتے تو بہت سے مسائل سمجھنے میں

ان کے محتاج ہوتے۔

محترم قارئین! آپ جانتے ہیں کہ اس نابغہ روزگار شخصیت کا نام کیا تھا؟
اس کا نام تھا اسحٰق بن ابراہیم حنظلی المعروف ابن راھویہ، جنھیں امام احمد بن حنبل، امام بخاری جیسے سینکڑوں ائمہ دین کا استاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

مَضَتِ الدُّهُوْرُ وَمَا اَتَيْنَ بِمِثْلِهٖ　　وَلَقَدْ اَتٰى فَعَجَزْنَ عَنْ نُظَرَائِهٖ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

......☆......

[1] اس قصہ کا اصل تحفۃ المودود باحکام المولود میں ہے۔

علم وفضل کی تکریم

خلیفہ المسلمین مامون الرشید عباسی ہاشمی کو اپنے زیرِتعلیم بیٹوں کے خوشگوار تنازع کی اطلاع ملی تو وہ ناراض ہونے کی بجائے خوشی سے جھوم اٹھا اس نے آن کی آن میں اپنے بیٹوں کے اتالیق امام اللغة والنحو یحییٰ بن زیاد فرّاء کو اپنے محل میں بلایا اور ان کی شایان شان ضیافت کر کے ان سے بصد ادب دریافت کیا کہ حضرت بھلا اس وقت دنیا میں معزز ترین شخصیت کون ہے؟

انہوں نے فرمایا: میرے علم کے مطابق امیر المومنین کی شخصیت ہی معزز ترین ہے۔

امام یحییٰ بن زیاد فرّاد نے یہ بات کسی طرح کی خوشامد میں نہ کہی تھی بلکہ اس وجہ سے کہی تھی کہ مامون الرشید ہاشمی خاندان کا چشم وچراغ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑا محدّث اور بلند پایہ فقیہ اور مایہ ناز ادیب بھی تھا اور اس دور کی ایسی سلطنت کا حکمران تھا جس کی ہیبت سے یورپی سلطنتیں لرزاں وترساں رہتی تھیں لیکن امیر المومنین مامون الرشید نے ان کی اس بات سے اتفاق نہ کیا اور کہا کہ میرے علم کے مطابق تو اس وقت دنیا کی معزز ترین شخصیت وہ ہے جس کے جوتے سیدھے کرنے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے امیر المومنین کے بیٹے آپس میں الجھ پڑیں اور ان میں سے ہر ایک کی خواہش یہ ہو کہ استاد کے جوتے سیدھے کرنے کا شرف اسے ہی حاصل ہو۔

امام یحییٰ بن زیاد فرّاء یہ بات سن کر چوکنا ہو گئے اور سمجھ گئے کہ امیر المومنین مجھے ہی مراد لے رہے ہیں کیونکہ ابھی کل ہی کی بات تھی جب وہ امیر المومنین کے صاحبزادوں کو پڑھا کر محل سے باہر جانے کے لیے اُٹھے تو دونوں شہزادے لپک کر

دروازے پر جا پہنچے اور ان کے جوتے سیدھے کرنے کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے آپس میں الجھنے لگے ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ وہ اکیلا ہی یہ سعادت حاصل کرلے ان کے اس جھگڑے کے دوران ہی انکے استاد محترم دروازے پر آ گئے اور ان دونوں سے کہا کہ تم جھگڑا ختم کرو اور ایک ایک جوتا سیدھا کرلو۔ چنانچہ انہوں نے ایک ایک جوتا سیدھا کرنے کا شرف حاصل کرلیا تھا۔ عرض کیا کہ اے امیر المومنین اس وقت میرے جی میں آیا تھا کہ میں انہیں اس طرح کرنے سے روک دوں لیکن میں یہ سوچ کر رُک گیا کہ وہ احترام استاد کا شرف حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھے ہیں اگر میں انہیں روک دوں تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا اور پھر اس وجہ سے بھی کہ ایک مرتبہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کسی کام کے لیے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آئے تو آپ نے اس وقت تک ان کی سواریوں کی رکابیں تھامیں رکھیں جب تک ان کا کام پورا نہ ہوا اور وہ اطمینان سے واپس نہ چلے گئے ان کے جانے کے بعد حاضرین میں سے کسی نے کہا اے رسول اللہ کے چچازاد بھائی آپ نے بزرگی کے اعتبار سے بڑا ہونے کے باوجود بھی ان کی سواریوں کی رکابیں تھامے رکھیں؟ آپ نے فرمایا: اے جاہل خاموش ہو جا، فضیلت والوں کی قدر و منزلت فضیلت والے ہی جانتے ہیں یہ سن کر ماموں الرشید نے کہا اگر تو ان کو اس فعل سے روک دیتا تو میں نے تم پر ناراض ہونا تھا اور تمھیں قصوروار ٹھہرانا تھا ان کے اس فعل سے ان کی شان کم نہیں ہوئی بلکہ بلند ہوئی ہے اور مجھے ان کے اس فعل کی وجہ سے ان کے اندر فراست وفرزانگی کا ثبوت ملا ہے۔ یاد رکھو کہ تین آدمیوں کا احترام کرنے سے کسی انسان کی قدر و منزلت میں کمی نہیں ہوئی اپنے حاکم کا احترام کرنے سے۔ اپنے والد کا احترام کرنے سے، اپنے استاد کا احترام کرنے سے۔ میں تمھیں دس ہزار درھم اور ان دونوں کو دس دس دینار دینے کا اعلان کرتا ہوں کیوں کہ تم نے انہیں ادب واحترام کی قدر و قیمت سے آگاہ کیا اور ان دونوں نے احترام کا ثبوت دیا۔

اللہ رے مامون الرشید کی فہم وبصیرت کہ اس نے اپنے والد امیر المومنین ہارون اور دادا امیر المؤمنین مھدی اور پردادا امیر المومنین منصوراور جد اعلیٰ سیدنا عبد اللہ بن عباس ہاشمی کی کامیابیوں کا راز جان لیا اور اس حقیقت کا ادراک کر لیا کہ ادب واحترام کے بغیر علم میں برکت نہیں ہوتی اور حضرت عبداللہ بن عباس کو جو علم وفضل کا سمندر ملا تھا تو اللہ کی مہربانی اور رسول اللہ کی دعا کے بعد حضرت زید بن ثابت انصاری جیسے اساتذہ کے احترام کی بدولت ہی ملا تھا اور اسی ادب واحترام کی برکت سے ہی سادات بنی ہاشم کا اقتدار نصف النہار تک جا پہنچا تھا وہ عظیم ترین مملکت اسلامیہ کا حکمران ہونے کے باوجود امام مالک بن انس کی چوکھٹ پر حاضری دیتے اور ان کا کمال درجے کا اکرام کرتے اور طفل مکتب کی طرح مؤدب ہو کر ان کے حلقہ درس میں بیٹھتے تھے امام سھل بن عبداللہ تستری پر اللہ کروڑوں رحمتیں برسائے انہوں نے کیا خوب فرمایا:

کہ لوگ اس وقت تک خیریت وعافیت سے رہیں گے جب تک وہ علماء اور حکمران کی تکریم وتوقیر کرتے رہیں گے، اگر انہوں نے ان کی تکریم وتوقیر کی تو اللہ تعالیٰ ان کی دنیا اور آخرت سنوار دے گا اور اگر انہوں نے ان کی بے توقیری کی تو اللہ ان کی دنیا وآخرت برباد کر دے گا

امیر المؤمنین عبدالملک بن مروان اموی قرشی فرماتے تھے کہ عقل مند آدمی کو زیبا نہیں کہ وہ تین طرح کے آدمیوں کو معمولی سمجھ کر خاطر میں نہ لائے: حکمران، علماء حق اور بھائی۔

جس نے حکمران کو اہمیت نہ دی اس نے اپنی دنیا تباہ کر لی اور جس نے علماء کو اہمیت نہ دی اس نے اپنے آخرت تباہ کر لی اور جس نے اپنے بھائیوں کو اہمیت نہ دی اس نے اپنی مردانگی تباہ کر لی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حضرت رسول کریم ﷺ نے فرمایا وہ آدمی ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے بڑے کا احترام نہ کرے اور ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے عالم کا اکرام نہ کرے۔

......☆......

ادب واحترام کی برکات

شبانوش روڑ بصرہ کی جامع مسجد کا صحن، عبید بن معمر سے تعزیت کنندگان سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور صحن میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی، سوگ کی اس مجلس میں اشراف بھی تھے اور عوام بھی، آقا بھی تھے اور غلام بھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ فوت ہونے والی پاکباز خاتون کا باپ بصرہ کا رئیس اور غربا کا بڑا ہمدرد تھا، اس نے اپنی اس بیٹی کا بہتیرا علاج معالجہ کرایا لیکن وہ جانبر نہ ہوسکی اور اللہ کو پیاری ہوگئی اس کے باپ نے اس کا سوگ منانے کے لیے مسجد کا صحن پسند کیا، تاکہ مسجد کے احترام کی وجہ سے لوگ ادھر اُدھر کی باتوں سے بچیں اور اپنی توجہ تعزیت اور آخرت پر مرکوز رکھیں۔

مشہور صحابی رسول ﷺ ابو بکرۃ ثقفیؓ کے نامور صاحبزادے جناب عبید اللہ بن ابی بکرہؓ کو اپنے کریم النفس مسلمان بھائی پر نازل ہونے والی اس مصیبت کی اطلاع ملی تو وہ اپنے غلام کے ہمراہ ان سے تعزیت کرنے کے لیے سوگ کی مجلس میں آئے لیکن مسجد کے صحن میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، تعزیت کرنے والے اشراف بصرہ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ چکے تھے، انھوں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نظر نہ آئی، اسی دوران اگلی صفوں میں سے ایک نادار مؤدب آدمی اُٹھا اور ان کی طرف چلا آیا اور نہایت ادب احترام کے ساتھ انھیں اپنی نشست پر بیٹھنے کی دعوت دی، جب آپ آگے بڑھ کر خالی کردہ نشست پر بیٹھ

گئے تو وہ مؤدبانہ طور پر تمام لوگوں کے پیچھے بیٹھ گیا، معزز آقا نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ اس مہذب اور سلیقہ مند آدمی کے ساتھ ساتھ رہے اور مجلس برخاست ہونے کے بعد اُسے جانے نہ دے، چنانچہ جب مجلس تعزیت برخاست ہوئی تو آپ اس شخص کے پاس آئے اور اس سے پوچھا:

کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟

"جی ہاں! میں آپ کو جانتا ہوں۔"

بھلا آپ بتا سکتے ہیں، کہ میں کون ہوں؟

"آپ عبید اللہ بن ابی بکرہ ثقفی ہیں، آپ کے والد، رسول اللہ ﷺ کے صحابی تھے۔"

آپ نے میرے لیے نشست کیوں چھوڑ دی؟

"اس لیے کہ آپ صحابی رسول کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے میرے جیسے آدمیوں پر آپ کا خصوصی احترام واجب کیا ہے۔"

کیا آپ میرے ساتھ میرے نخلستان تک جا سکتے ہیں؟

"جی ہاں! میں آپ کے ساتھ جا سکتا ہوں۔"

چنانچہ وہ مؤدبانہ طریقے سے آپ کے ساتھ چلنے لگا، اور یہ دونوں چلتے چلتے بصرہ سے دُور نہر مکحول پر واقع نخلستان میں چلے گئے، اس نخلستان کے وسط میں خوبصورت مرمریں اینٹوں اور ساگوانی دروازوں والا محل موجود تھا، چنانچہ آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے نخلستان کا ایک ایک پیڑ دکھانا شروع کر دیا، جب بھی آپ اسے کوئی پیڑ دکھاتے تو اس سے پوچھتے: بتاؤ یہ کیسا پیڑ ہے؟ اس کے پھل پھول، انگور اور کھجور کیسے ہیں؟ یہ جواب دیتا اللہ کی قسم! میں نے آج تک اتنے پھلوں، پھولوں اور کھجوروں والا باغ نہیں دیکھا۔ جب آپ اسے سارا نخلستان دکھا چکے تو

اسے خوش خبری سنائی کہ یہ نخلستان اور جو کچھ اس میں ہے آج کے بعد یہ سارے کا سارا تیری ملکیت ہے، میں آج ہی اس کا اشٹام لکھ کر تیرے حوالے کر دوں گا۔

اس نادار و قلاش انسان نے جب یہ بات سنی تو خوشی سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے اور اس کا دل سینے میں رقص کرنے لگا، اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے:

''آپ نے تو مجھے اور میرے اہل وعیال کو قدموں پر کھڑا کر دیا۔''

عبیداللہ: ''تیرے اہل وعیال کی کتنی تعداد ہے؟''

''میرا کنبہ تیرہ افراد پر مشتمل ہے۔''

عبیداللہ: میں نے تیرے اہل وعیال کو اپنے اہل وعیال میں شامل کر لیا ہے، جب تک میں زندہ ہوں اس وقت تک ان کا خرچ میرے ذمہ ہے، اس کے بعد عرب سردار عبیداللہ ثقفی نے سوچا کہ اس جاگیر اور نخلستان کے مالک کا ایک گھر بصرہ کے اندر بھی ہونا چاہیے، چنانچہ اس نے لمحہ بھر پہلے کے نادار اور موجودہ وقت کے جاگیردار ساتھی سے کہا: ہم ان شاء اللہ آپ کو باغ کے مالک ہونے کے ناطے بصرہ میں شایانِ شان گھر اور غلام خرید کر دیں گے جو زندگی بھر آپ کی خدمت کریں گے، آپ نے کل ہمارے ہاں ضرور تشریف لانا ہے، چنانچہ وہ آدمی صبح سویرے ان کے گھر گیا تو آپ نے اسے دس لاکھ روپے کی مالیت کا محل خرید کر دیا اور بیس لاکھ نقد دیے اور اس تمام جائیداد کا ملکیت نامہ لکھ کر اس کے حوالے کیا اور ایک خوبصورت سواری اور عمدہ قسم کا خچر اور بہترین سوٹ اور ایک سائیس مہیا کر کے اسے الوداع کیا۔

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد ہر کہ خود رادید محروم شد

☆

احترامِ علما کے ثمرات[1]

قاضی اسماعیل بن اسحاق بغدادی کے دل میں غریب الحدیث جیسی لاثانی کتاب کے مؤلف علامہ ابراہیم بن اسحاق حربی کی ملاقات کا شوق پیدا ہوا تو اس نے اپنے پیغام رساں کے ذریعے انہیں اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دی، حضرت امام ابرہیم حربی کو ان کی ملاقات سے انکار تھا نہ عار تھی لیکن چونکہ وہ عبد صالح تھے انہیں حکام کے درباروں میں آنا جانا پسند نہ تھا نہ ہی ان کے پاس اتنا فالتو وقت تھا کہ وہ اسے صرف کرنے کے لیے ان کے ہاں چلے جاتے اگر وہ ایسا کرتے تو فقہ وحدیث و تفسیر، ادب، لغت کی بے مثال خدمات سرانجام نہ دے سکتے علاوہ ازیں انہیں اس بات سے بھی چڑ تھی کہ حکام وقت اپنے دروازوں پر دربان بٹھا کر اندر فرعون بن جاتے ہیں اور ان کے اندر تکبر و فرعونیت موجزن ہو جاتی ہے

اس لیے انہوں نے جواب دیا کہ میں اس قاضی سے ملاقات کرنا پسند نہیں کرتا جس نے اپنے دروازے پر دربان بیٹھا رکھا ہے۔

قاضی اسماعیل بن اسحاق جو کہ بذات خود ایک بہت بڑے محدّث اور فقیہ تھے اور قدر زر زرگر شناس وقدر جوہر جوہری کے بمصداق اہل علم وفضل کے قدر دان تھے اور همچوما دیگرے نیست جیسے احساس برتری سے مبرا تھے وہ امام ابراہیم حربی جیسے یگانہ روزگار محدّث اور فقیہ لغوی اور ادیب کی ملاقات کی خاطر ہر قربانی دینے کو تیار ہو گئے انہوں نے فرمایا میں اپنے دروازے سے دربان اٹھا دیتا

ہوں اور وہ جو کچھ فرمائیں میں اس کی تعمیل کرنے پر تیار ہوں جب امام ابراہیم حربی کو معاصرت سبب المنافرت سے پاک اور خلوص وللّٰہیت سے معمور قاضی اسماعیل کی آرزوے ملاقات کا عزم معلوم ہوا تو آپ نے ملاقات کرانے کی حامی بھرلی اور بغداد تشریف لے آئے اور سیدھے قاضی اسماعیل کے دردولت پر چلے آئے جب اس کے کمرے میں داخل ہونے لگے تو آپ نے دروازے پر اپنے جوتے اتار دیئے اور قالین پر برہنہ پا چلتے ہوئے میزبان سے بغل گیر ہوئے جب قاضی اسماعیل کے سٹینوگرافر محمد بن یوسف کی نظر ان کے رُخ زیبا پر پڑی تو وہ بڑی عقیدت کے ساتھ استقبال کے لیے اٹھے اور سلام کرنے کے بعد چپکے سے دروازے سے پر چلے گے اور وہاں بیٹھ کر اپنی قیمتی شال کے ساتھ ان کے جوتوں سے گردوغبار جھاڑنے پونچھنے لگے جب انہوں نے جوتوں کو اچھی طرح صاف کرلیا تو انہیں اپنے بیش قیمت رومال میں لپیٹ کر اپنی نشست پر لے آئے اور بڑی خاموشی کے ساتھ دونوں بزرگوں کی گفتگو سننے لگے جب ان کی محفل برخاست ہوئی اور امام ابراہیم حربی کمرے سے باہر نکلنے لگے تو اس نے دروازے پر جا کر اپنے قیمتی رومال سے انکے جوتے نکالے اور بڑے احترام کے ساتھ ان کے سامنے رکھ دیئے جب امام ابراہیم حربی نے محمد بن یوسف کو یوں کرتے دیکھا تو بیساختہ ان کی زبان سے نکلا۔

اَکرَمَکَ اللّٰهُ کَمَا اَکرَمْتَ الْعِلْمَ. وَاَعَزَّکَ اللّٰهُ فِي الدُّنیَا وَالْاٰخِرَةِ

(کہ جس طرح تو نے علم کا احترام کیا ہے اس طرح اللہ تجھے بھی احترام عطا فرمائے اور تجھے دنیا وآخرت میں عزت عطا فرمائے)

جب آپ اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے پوچھا کہ حضرت آپ نے قاضی اسماعیل بن اسحاق کو کیسا پایا؟ قاضی صاحب نے فرمایا: وہ تو علم کا پہاڑ ہیں، میں تو ان کے علم وفضل سے دنگ رہ گیا ہوں اور جب قاضی اسماعیل بغدادی

کے حاشیہ برداروں نے اس سے امام ابراہیم حربی کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا وہ تو لاثانی اور بے مثال عالم ہے۔

مجھے تو اس جیسا عالم کہیں نظر نہیں آیا۔ جب اللہ تعالیٰ کسی عالم کو حقیقی عالم بنا دیتا ہے تو اس میں تواضع وفروتنی آ جاتی ہے اور وہ خودستائش سے منہ موڑ لیتا ہے اور اپنے آپکو دوسروں سے چھوٹا اور دوسروں کے اپنے آپ سے بڑا سمجھنا شروع کر دیتا ہے

اور جب کوئی عالم اللہ کی درگاہ سے دھتکارا جاتا ہے تو وہ اشتہارات پر اپنے نام کو نمایاں اور سب سے اوپر دیکھنے کا خواہش مند بن جاتا ہے اور وہ لوگوں کی نگاہوں میں اتنا ذلیل ہو جاتا ہے جیسے وہ کوئی کتا ہے یا خنزیر بلکہ ان سے بھی بدتر۔ محدثین کرام پر اللہ تعالیٰ کروڑوں رحمتیں برسائے وہ امام ابراہیم حربی اور قاضی اسماعیل بغدادی کی طرح ہی ایک دوسروں کی خوبیوں کے معترف ہوا کرتے تھے ان میں باہمی حسد نام کو بھی نہ تھا اسی لیے اللہ ان کی دعائیں سنتا اور قبول کرتا تھا چنانچہ عرش عظیم کے مالک نے محمد بن یوسف کے حق میں امام ابرہیم حربی کے دعا قبول کر لی اور اسے اسی عدالت کا قابل احترام جسٹس بنا دیا اور اسے اتنی عزت بخشی کہ وہ عزت واقبال کی منزلیں طے کرتے ہوئے پوری مملکت اسلامیہ کے چیف جسٹس بن گئے اور لوگ انکی عقل ودانش کی مثالیں دینے لگے اور جب وہ مر کر اللہ کی عدالت میں پیش ہوئے تو اللہ نے انہیں بخش دیا اور جب وہ خواب میں اپنے کسی دوست کو ملے تو ان کے دوست نے ان سے پوچھ لیا کہ بتا تیرے ساتھ تیرے رب نے کیا کیا؟ تو انہوں نے جواب دیا: اللہ نے میرے بارے میں عبد صالح (ابراہیم حربی) کی دعا قبول کر لی اور مجھے بخش دیا

اللہ تعالیٰ امام سھل بن عبداللہ تستری پر رحم فرمائے انہوں نے کیا خوب فرمایا۔

((لَایَزَالُ النَّاسُ بِخَیرٍ مَاعَظَّمُوا العُلَمَاءَ وَالسُّلطَانَ وَاِنْ عَظَّمُوا هَذَینِ اَصلَحَ اللهُ دُنیاهُم وَاُخرَاهُم وَاِنِ استَخَفُّوا هَذَینِ

اَفسَدَ اللّٰہُ دُنیاھُم واُخرٰھُم))

"کہ لوگ اسی وقت تک خیریت سے رہیں جب تک علماء اور حکمران کا احترام کرتے رہیں گے اور اگر وہ ان کا احترام کریں گے تو اللہ ان کی دنیا اور آخرت سنوار دے گا اور اگر انہوں نے انہیں حقیر سمجھا تو اللہ ان کی دنیا اور آخرت تباہ کر دے گا۔"

امیر المومنین عبدالملک بن مروان قرشی اموی فرماتے ہیں کہ عقل مند آدمی تین آدمیوں کو حقیر نہ سمجھے گا.. علما، سلطان، اخوان، جس نے علماء کو حقیر سمجھا اس نے اپنی آخرت تباہ کر لی اور جس نے سلطان کو حقیر سمجھا اس نے اپنی دنیا تباہ کر لی اور جس نے اپنے بھائیوں کو حقیر سمجھا اس نے اپنی مروّت تباہ کر ڈالی۔

امیر المومنین ہارون الرشید ہاشمی عباسی نے اہل علم وفضل کو اپنے گھر میں کھانا تناول کرنے کی دعوت دی جب وہ کھانا تناول کر کے اپنے ہاتھ دھونے لگے تو ہارون الرشید نے خاموشی سے نابینے عالم ابومعاویہ کا ہاتھ تھاما اور بڑے احترام کے ساتھ کونے میں لے گیا اور چوکے پر بٹھا کر ان کے ہاتھ دھلوانے لگا جب ہاتھ دھلوا کر فارغ ہوئے تو انہیں بڑے احترام اور خاموشی سے اہل علم کے ساتھ مجلس خاص میں بٹھا دیا اور جب نشت برخاست ہوئی تو ان سے پوچھا حضرت آپکو پتہ ہے کہ کس نے آپکے ہاتھ دھلوائے ہیں؟ نابینے عالم نے نفی میں جواب دیا تو ہارون نے بتایا کہ آپ کی اس خدمت کی سعادت بذات خود امیر المومنین نے حاصل کی ہے انہوں نے فرمایا۔آپ نے علم کا احترام کیا ہے اللہ آپکو عزت واحترام عطا فرمائے۔

یہ حقیقت آفتاب نیم روز سے بڑھ کر آشکارا ہوئی ہے کہ جس دنیا دار نے علماء ربانیین کا احترام کیا اللہ نے اس کا وقار واقتدار بڑھا دیا اور جس نے ان کا استخفاف کیا اللہ نے اس کا وقار اور اقتدار گھٹا دیا وقائع نگاروں نے امام محمد بن نصر مروزی

کے تذکرے میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ والی خراسان امیر اسماعیل بن احمد سامانی کے دربار میں تشریف لائے تو وہ ان کے احترام میں اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور لپک کران سے مصافحہ ومعانقہ کرنے لگا اتفاق سے اس وقت اس کے پاس اس کا بھائی امیر اسحاق بن احمد سامانی والی بخارٰی بھی بیٹھا ہوا تھا وہ یہ منظر دیکھ کر بگڑ گیا اور جب امام محمد بن نصر مروزی باہر تشریف لے گئے تو اس نے اپنے بھائی اسماعیل بن احمد سے کہا تو حاکم صوبہ ہوکر اپنی رعایا کے ایک فرد کا اس قدر استقبال کر رہا ہے؟ اس طرح تو تیرا وقار گھٹ جائیگا۔

جب رات ہوئی تو امیر اسماعیل بن احمد سامانی اپنی خواب گاہ میں سو گئے تو انہیں خواب میں حضرت نبی کریم ﷺ کی زیارت ہوئی آپ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ اللہ تعالی نے محمد بن نصر کے احترام کی بدولت تیری حکومت اور پھر تیرے بیٹوں اور پوتوں کی حکومت کو استحکام نصیب فرمادیا جبکہ تیرے بھائی اسحاق کی حکومت ختم ہوگئی کیونکہ اس نے محمد بن نصر کو رعیت کا عام آدمی سمجھ کر اس کا استخفاف کیا ہے۔

اگر چہ امیر اسحاق بن احمد سامانی بھی اپنے بھائی امیر اسماعیل کی طرح ہی امام محمد بن نصر مروزی کی طرف سالانہ چار ہزار درہم بھیجا کرتا تھا لیکن وہ اپنے آپکو ان کا محسن سمجھ کر کما حقہ ان کی عزت وتوقیر نہ کرتا جبکہ اس کا بھائی اتنا وظیفہ بھجوانے کے باوجود انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتا اور دل وجان سے ان کا احترام کرتا تھا اس لیے وہ حضرت رسول کریم ﷺ کی بشارت کا زندہ ثبوت بن گیا اور دنیا وآخرت کی سعادتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا کتب تاریخ میں مذکور ہے ...... کہ بلاد خراسان وافغانستان میں اس کی اور اسکی آل واولاد کی حکومت ایک سوانتیس برس قائم رہی۔

---

[1] اس قصے کا اصل سیر اعلام النبلاء میں ہے۔

گورنر سجستان کا حلم و کرم

گورنر سجستان معن بن زائدہ شیبانی محض شیر دل اور بہادر انسان ہی نہ تھا بلکہ وفا واخاء کا مجسمہ بھی تھا اور اُموی حکومت سے اپنی منصبِ وفاداری کی وجہ سے عباسی حکومت کا اشتہاری ملزم بن گیا تھا اور اس عرصے میں وہ بھیس بدل کر پہاڑوں کی غاروں اور بدوّوں کے خیموں میں زندگی کے بقیہ دن پورے کرنے لگا اس عرصے میں وہ اونٹوں کے چمڑے کے پرانے جوتے پہنتا رہا اور بکریوں کے چمڑوں سے تیار کئے گئے لحاف اوڑھتا رہا تا آنکہ ایک دفعہ راوندیوں نے امیر المؤمنین منصور عباسی ہاشمی کے خلاف بغاوت کر دی اور قصرِ خلافت کو گھیرے میں لے لیا، قریب تھا کہ وہ امیر المؤمنین پر قابو پا کر ان کو قتل کر دیتے، یکایک ایک نقاب پوش باغیوں پر عقاب کی طرح جھپٹا اور شمشیر زنی کرتا ہوا ان کے قلب میں جا گھسا اور ان کے کشتوں کے پشتے لگاتا ہوا دوسری طرف نکل گیا اور پھر وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح واپس پلٹا اور اپنی خون آشام تلوار سے ان کی لاشوں کے ڈھیر لگانے لگا یہ دیکھ کر سرکاری فوج کا حوصلہ بلند ہوا اور اس نے بھی بڑھ چڑھ کر حملہ کرنا شروع کر دیا تا آنکہ بغاوت فرو ہوگئی اور بچے کھچے باغی گرفتار کر لئے گئے تو امیر المؤمنین منصور نے نقاب پوش سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا تاکہ اس کی جرأت و اقدام اور شجاعت و بسالت پر اسے خراجِ تحسین پیش کرے اور اسے مناسب انعام سے نوازے جب یہ نقاب پوش ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو امیر المؤمنین نے اس

سے اس کا نام پوچھا تو اس نے اپنا نقاب اتار دیا اور بتایا کہ میں آپ کا انتہائی مطلوب ملزم معن بن زائدہ شیبانی ہوں جب امیر المؤمنین نے سابق اُموی حکومت کے حد درجہ وفادار اور اپنی حکومت کے انتہائی مطلوب ملزم کو اپنے سامنے موجود پایا تو شرم وندامت سے اس کی آنکھیں جھک گئیں اور اس نے انھیں گلے لگا لیا اور سابق حکومت سے ان کا جرم وفاداری معاف کر دیا اور اسے اپنا مصاحب خاص بنا لیا۔

لوگوں نے جب اس کی انتہا درجے کی شجاعت و بسالت وطلاقت وسماحت اور علم وحلم وعفو وکرم کے متعلق سنا تو ان کے تذکرے سے اپنی محفلیں پُر رونق کرنے لگے اور جب کوئی شخص ان کے متعلق اپنا بیان شروع کرتا تو پکار اٹھتے۔ حَدِّث عَنِ الْبَحْرِ وَلَا حَرَجٍ وَحَدِّثْ عَنْ مَعْنٍ وَلَا حَرَجٍ ''کہ سمندر میں چھپے ہوئے خزانوں اور معن بن زائدہ کی خوبیوں کے بیان میں مبالغہ آرائی سے نہ ڈر، کیونکہ ان دونوں کی خوبیوں کا تذکرہ بیان سے باہر ہے۔''

امیر المؤمنین مہدی بن منصور عباسی ہاشمی نے اس کی انہیں خوبیوں کی بدولت انھیں بجستان کا گورنر نامزد کر دیا چنانچہ جب یہ گورنر ہاؤس میں داخل ہوا تو بجستان کے وفود ان کو مبارکباد دینے کے لئے جوق در جوق آنے لگے اور داد و دہش سے جھولیاں بھرنے لگے، اسی دوران ایک بادیہ نشین بزرگ شاعر اس کے حلم وکرم کو آزمانے کے لئے بغیر اجازت ہی ان کے محل میں گھس آیا اور لوگوں کی موجودگی میں ہی کہنے لگا:

اَتَذْكُرُ إِذْ لِحَافُكَ جِلْدُ شَاةٍ   وَإِذْ نَعْلَاكَ مِنْ جِلْدِ الْبَعِيرِ

''کیا تجھے وہ دن یاد ہیں؟ جب تیرا لحاف بکری کی کھال کا ہوتا تھا اور تیرے جوتے اونٹ کے چمڑے کے ہوتے تھے۔''

معن نے کہا: ہاں مجھے یاد ہے اور میں ان دِنوں کو کیسے بھول سکتا اور کسی انسان کو اپنے ایسے دن بھولنے بھی نہ چاہئیں۔

بادیہ نشین شاعر نے کہا:

فَسُبْحَانَ الَّذِیْ أَعْطَاکَ مُلْکًا وَعَلَّمَکَ الْجُلُوْسَ عَلَی السَّرِیْرِ

''وہ ذات ہر طرح کے نقص سے پاک ہے جس نے تجھے بادشاہی عطا کی اور تجھے تخت پر بیٹھنے کا سلیقہ عطا کیا۔''

معن نے کہا: میں ہر حال میں اس ذات کی تقدیس بیان کرتا ہوں۔

بادیہ نشین شاعر نے کہا:

فَلَسْتُ مُسَلِّمًا مَا عِشْتُ دَهْرًا عَلٰی مَعْنٍ بِتَسْلِیْمِ الْأَمِیْرِ

''میں جب تک زندہ رہا اس وقت تک معن کو وہ سلام نہ کروں گا جو امیر کو کیا جاتا ہے۔''

معن نے کہا: اے میرے عرب بھائی سلام کہنا سنت ہے۔لہٰذا اسے ترک نہ کر البتہ جس طرح تیرا جی چاہے اسی طرح سلام کہہ مجھے سلام امارت پر کوئی اصرار نہیں۔

بادیہ نشین شاعر نے کہا:

سَأَرْحَلُ عَنْ بِلَادٍ أَنْتَ فِیْهَا وَلَوْ جَارَ الزَّمَانُ عَلَی الْفَقِیْرِ

''میں اس ملک سے کوچ کرنے والا ہوں جس کا تو گورنر بنا ہے اگرچہ حالات زمانہ فقیر آدمی کو کچل کر رکھ ہی دیں۔''

معن نے کہا: اگر تو ہمارا پڑوسی بن کر رہنا چاہے تو مرحبا اگر تو جانا چاہے تو اللہ آپ کو سلامت رکھے۔

بادیہ نشین نے کہا:

فَجُدْلِیْ یَابْنَ نَاقِصَةٍ بِشَیْئٍ فَإِنِّیْ قَدْ عَزَمْتُ عَلَی الْمَسِیْرِ

''اے نکمی ماں کے بیٹے مجھ پر کچھ سخاوت کر کیونکہ میں یہاں سے کوچ کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہوں۔''

معن نے باوجود اپنی توہین کے اپنے خزانچی سے کہا: اے غلام اسے تین ہزار دینار (ساٹھ ہزار روپے) دے دے۔

بادیہ نشین نے کہا:

قَلِيلٌ مَا أُتِيتُ بِهِ وَإِنِّي لَأَطْمَعُ مِنكَ بِالْمَالِ الْكَثِيرِ

''جو کچھ مجھے دیا گیا ہے یہ تو بہت کم ہے جبکہ میں تو بہت سارے مال کی امید لے کر آیا تھا)

معن نے اپنے غلام سے کہا: اے غلام اسے اتنا اور دے دے۔

چنانچہ غلام نے اسے تین ہزار (ساٹھ ہزار روپے) اور دے دیئے تو بادیہ نشین نے کہا:

سَأَلْتُ اللهَ أَنْ يَبْقِيكَ ذُخْرًا فَمَالَكَ فِي الْبَرِيَّةِ مِنْ نَظِيرِ
فَمِنكَ الْجُودُ وَالإِفْضَالُ حَقًّا وَفَضْلُ يَدَيْكَ كَالْبَحْرِ الْغَزِيرِ

''میں نے اللہ سے سوال کیا ہے کہ وہ تجھے ہمیشہ سلامت رکھے کیونکہ مخلوق میں تیرے جیسا کوئی انسان موجود نہیں تو تو واقعی جود وسخا اور بذل وعطا کا پیکر ہے اور تیرے ہاتھ تو ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی طرح سخاوت کرتے ہیں۔''

معن نے کہا: اے غلام چھ ہزار دینار (ایک لاکھ بیس ہزار روپے) تو ہم نے اسے اپنی توہین کرنے پر دیئے ہیں اب اسے چھ ہزار دینار اپنی مدح کرنے پر بھی دے دے۔

چنانچہ بادیہ نشین شاعر نے بارہ ہزار دینار (دو لاکھ چالیس ہزار روپے) اپنی جھولی میں ڈال لئے اور شکریہ ادا کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

......☆......

حبشی غلام کی فیاضی

عرب سردار عمر بن عبداللہ اپنے گھر سے تو اس مقصد کے لیے نکلے تھے کہ اپنے نخلستان اور کھیتوں میں کام کرنے والے غلاموں اور مزدوروں کی کارکردگی کا جائزہ لیں اور انہیں مناسب ہدایات دیں لیکن راستے میں ان کا گزر ایک ایسے حبشی غلام پر ہوا جو کسی جاگیردار کے نخلستان میں بیٹھا روٹی کھا رہا تھا اور اس کے سامنے ایک کتا پاؤں بچھا کر بیٹھا ہوا تھا وہ جب بھی کوئی لقمہ اپنے منہ میں ڈالتا تو ساتھ ہی ایک لقمہ کتے کے آگے پھینک دیتا اور کتا وہ لقمہ کھا لیتا وہ اس طرح کرتا رہا تا آنکہ دستر خوان خالی ہو گیا اس طرح اس نے آدھا کھانا خود کھایا اور آدھا کتے کو کھلا دیا جب وہ کھانے سے فارغ ہو گیا تو یہ آگے بڑھے اور اس سے پوچھا:

عمر بن عبداللہ: اے جوان دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں تیرے لیے کتنی مرتبہ کھانا آتا ہے؟

حبشی غلام: ایک ہی مرتبہ

عمر بن عبداللہ: اور تو رات کو کیا کھاتا ہے؟

حبشی غلام: دن کے اگلے پہر کھانا وافر ہوتا ہے اور میں اس میں سے کچھ بچا لیتا ہوں اور رات کو وہ کھا لیتا ہوں

لیکن آج تو، تو نے آدھا کھانا کتے کو کھلا دیا ہے اور آدھا خود کھایا ہے لہذا تو رات کو کیا کھائے گا؟

حبشی غلام: کوئی بات نہیں، میں صبر کر کے رات گذاروں گا لیکن یہ بے چارہ کتا جو روٹی کے چند لقموں کی امید پر یہاں آ کر بیٹھ گیا تھا اگر یہاں سے بھوکا اُٹھ جاتا تو اس کے جی پر کیا گذرتی لہذا مجھے شرم آئی کہ میں ایسی ذی روح مخلوق کے سامنے بیٹھ کر تنہا کھاؤں جو دو آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی ہو۔

حبشی غلام کے یہ الفاظ سُن کر سردار عمر بن عبداللہ کے دل پر گہرا اثر ہوا کہ یہ غلام بھی کیا خوب انسان ہے جو ایک حیوان کے سامنے بھی اکیلا کھانے سے شرم محسوس کر رہا ہے ورنہ کتنے سارے گورے رنگ کے انسان ہیں جو بھوکے انسانوں کے سامنے بیٹھ کر عمدہ عمدہ کھانے کھاتے رہتے ہیں اور وہ اس وقت تک کسی کوّے یا کتے کو بھی ہڈی نہیں ڈالتے جب تک وہ خود شکم سیر نہ ہولیں اور ان کے پیٹ میں گنجائش باقی نہ رہے۔

اس کے جی میں آیا کہ ہمارے دین میں کسی غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا اپنے آپکو جہنم سے آزاد کرانے کے مترادف ہے تو کیوں نہ میں اس حبشی انسان کو غلامی سے آزاد کرادوں شاید کہ اللہ تعالی میری اس نیکی کو قبول کر لے اور مجھے جہنم سے آزاد کردے اس نے یہ سوچ کر اس حبشی غلام سے پوچھا

اس باغ کا مالک کون ہے؟

اس نے بتایا کہ اس باغ کا مالک بنی عاصم کا فلاں شخص ہے اور وہ فلاں بستی میں رہائش پذیر ہے۔

عمر بن عبداللہ نے اپنا ذاتی پروگرام منسوخ کر دیا اور لوگوں سے پوچھتا پچھاتا اس بستی میں جا پہنچا جہاں اس باغ اور غلام کا مالک رہائش پذیر تھا اس نے باغ کے مالک سے کہا:

صاحب، آپ اس غلام کو فروخت کرنا چاہتے ہیں جو آپ کے باغ میں

رکھوالی کرتا ہے؟

جی ہاں اگر آپ خریدنا چاہتے ہیں تو۔

جناب میں یقیناً اسے خریدنا چاہتا ہوں۔

اور باغ کے متعلق کیا خیال ہے وہ بھی فروخت کر سکتے ہو؟

جی ہاں اگر آپ خریدنا چاہتے ہیں تو۔

جناب میں وہ بھی خریدنا چاہتا ہوں۔

قیمت کیا لو گے؟

مناسب ہی لیں گے۔

عمر بن عبداللہ بھی کیا خوب سردار تھے ان کی جگہ اگر ہمارے دور کا کوئی شوم سردار ہوتا تو اس نے کیا دیکھنا اور کیا سوچنا تھا کیونکہ ہمارے دور کے اکثر سردار اس قدر شوم ہیں کہ بغیر خوف اور لالچ کے کسی کو ایک روپیہ دینے پر آمادہ نہیں ہوتے بلکہ اگر انہیں اپنے نوکروں کے گھر گائے یا بھینس بندھی نظر آ جائے تو ان کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں اور جب تک وہ اسے چُرا کر ٹھکانے نہ لگا دیں، آرام کی نیند نہیں سوتے، ان سے تو وہ سفید پوش زمیندار اور تاجر لاکھ بھلے ہیں جو بھرپور طریقے سے کماتے ہیں اور غریب غرباء پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔

عمر بن عبداللہ اس دور کے بڑے بڑے سخی سرداروں میں سے ایک سردار تھے انہوں نے مطلوبہ رقم کی ادائیگی کا قول وقرار کر کے غلام اور نخلستان خرید لیا اور بڑی خوشی کے ساتھ واپس آ گئے اور آتے ہی حبشی غلام کو مژدہ سنایا کہ

اے غلام خوش ہو جا آج اللہ نے تجھے اس شخص کی غلامی سے آزاد کر دیا ہے۔

غلام نے بڑی متانت اور خوشی سے کہا:

میں پہلے تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے غلامی سے آزادی عطا

کی اور پھر آپ کا شکر یہ کہ آپ نے مجھے اس کی خوشنودی کی خاطر آزاد کروایا۔

سردار عمر بن عبداللہ نے مزید خوش خبری یہ سنائی کہ میں نے یہ باغ بھی خرید لیا ہے اور یہ میں نے آپ کو اللہ کے نام پر ہبہ کر دیا ہے

آزاد کردہ غلام نے کہا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

آپ پھر گواہ ہو جائیں کہ میں نے یہ باغ مدینہ منورہ کے فقراء کو ہبہ کر دیا ہے تاکہ وہ اس کی آمدن سے گزارہ کرتے رہیں کیوں کہ وہ بے چارے مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہیں عمر بن عبداللہ نے کہا:

افسوس ہے تجھ پر اب تو کھائے پیئے گا کہاں سے؟ کیونکہ آج کے بعد تو تیرا سابقہ آقا کھانا نہیں بھیجے گا۔

سردار صاحب، اللہ مالک ہے وہ رازق جس کی خوشنودی کی خاطر آپ نے مجھے آزاد کیا ہے وہ مجھے بھوکا نہیں رہنے دے گا کیا میں صدقہ کر کے اس مالک کا شکریہ ادا نہ کروں جس نے آپ کو میری طرف بھیجا اور آپ نے مجھے آزاد کرایا۔

......☆......

محدّثِ خراسان کا ایثار

امام احمد بن حنبل شیبانی رحمہ اللہ کے علم وفضل، فہم وفراست میں کونسی کمی رہ گئی تھی جو اللہ نے پوری نہ کی ہو۔ مسانید صحابہ رضی اللہ عنہم کی جمع وترتیب کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں۔ لیکن بایں ہمہ عالی اسناد کے حصول کی تلاش میں صحراؤں، دریاؤں، جنگلوں اور پہاڑوں کو عبور کرتے ہوئے اور شدائد کی خونی لہروں میں غوطے کھاتے ہوئے خراسان جا نکلے کیونکہ انھیں خبر ملی تھی وہاں کوئی عمر رسیدہ محدث رہتا ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ سے ثلاثی حدیث روایت کرتا ہے۔ یاد رہے کہ جس حدیث میں راوی حدیث اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تین واسطے ہوں وہ حدیث ثلاثی کہلاتی ہے۔ جس خوش نصیب محدث کو ثلاثی یا عالی سند کے ساتھ صحیح حدیث مل جاتی اس کا سر افتخار کے سبب اونچا ہو جاتا تھا۔

یہ محدثین کرام بھی اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نرالی مخلوق تھے۔ حدیثِ رسول ﷺ کی محبت نے انھیں گھر بنانے اور کنبہ آباد کرنے سے بے نیاز کر رکھا تھا۔ یہ لوگ علوم حدیث کی سماعت وکتابت کے لیے میدان وکہسار اور صحرائے پر خار میں گھس جاتے اور جہاں کہیں کوئی محدث مل جاتا اس سے حدیث روایت کرتے۔ اس راہ میں یہ لوگ بھوک اور پیاس، سردی اور گرمی، رنج وکلفت کی ذرہ بھر پروا نہ کرتے۔ جب انہیں گوہر مراد یعنی عالی سند کے ساتھ کوئی حدیث مل جاتی تو انھیں پر خطر جنگلوں اور لق ودق صحراؤں کی تھکاوٹیں بھول جاتیں۔ دکھ دُور ہو جاتے، بھوک

ختم ہو جاتی اور پیاس بجھ جاتی۔ یہ جو ہم سنن و آداب اور مسانید و معاجم جیسی کتب حدیث پڑھتے پڑھاتے اور سنتے سناتے ہیں، یہ انھیں کی کاوشیں ہیں۔ انہوں نے امت محمدیہؐ کے لیے صحیح اور ضعیف، راجح اور مرجوح، ناسخ اور منسوخ کی تمیز کر دی اور آج ہم آرام سے گھر بیٹھے بٹھائے ان سے استفادہ میں مصروف ہیں۔ علامہ ابو الحسنات عبدالحی لکھنویؒ فرماتے ہیں:

((فَلِلّٰهِ دَرُّ هُمْ وَعَلَيْهِ شُكْرُهُمْ كَيْفَ لَا وَهُمْ وَرَثَةُ النَّبِيِّ حَقًّا وَ نُوَّابُ شَرْعِهِ صِدْقًا حَشَرَنَا اللّٰهُ فِي زُمْرَتِهِمْ وَاَمَاتَنَا عَلٰى حُبِّهِمْ وَ سِيْرَتِهِمْ))

''پس اُن کی کمال درجے کی یہ خوبی اللہ کی خصوصی عنائت تھی۔ اور اسی کے ذمے اس کی جزا ہے۔ کیسے نہ ہو کہ درحقیقت وہی تو نبی مکرم ﷺ کے وارث تھے۔ اور وہ پوری صداقت کے ساتھ آپؐ کی شریعت کے نائب تھے۔ اللہ ہمیں بھی اُن کے زمرے میں اٹھائے، ان کی محبت وسیرت پر ہمیں موت دے۔''

چنانچہ امام احمد بن حنبل شیبانیؒ مصائب و آلام کے پہاڑ عبور کرتے ہوئے بڑی مشکل سے وہاں پہنچے اور اس محدث کو تلاش کیا۔ چنانچہ وہ حسن اتفاق سے مل گئے لیکن آپؒ اس وقت اُن کے پاس پہنچے جب وہ کتے کو روٹی کھلا رہے تھے۔ امام موصوفؒ نے انھیں سلام کہا۔ انہوں نے سلام کا جواب تو دیا لیکن ان کی طرف توجہ نہ کی اور اپنے کام میں مصروف رہے۔ جب وہ کتے کو روٹی کھلا کر فارغ ہوئے۔ تو ان کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے:

شاید آپ کے دل میں ناراضی پیدا ہوئی ہو، کہ میں نے کتے کو روٹی کھلانے کے دوران آپ کی طرف توجہ کیوں نہ دی۔ آپ نے فرمایا: ہاں

اس نے کہا سنو:

((حَدَّثَنِی اَبُو الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ قَطَعَ رَجَاءَ مَنِ ارْتَجَاهُ قَطَعَ اللّٰهُ رَجَاءَهُ مِنْهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَلَمْ یَلِجِ الْجَنَّةَ))

''مجھ سے ابوالزناد نے اعرج کے حوالے سے اورانہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے امید لے کر آنے والے کی امید منقطع کردی اللہ قیامت کے روز اپنی ذات سے متعلق اس کی امید منقطع کردے گا تو ایسا شخص جنت میں داخل ہونے سے محروم رہا۔''

اور ہماری یہ سرزمین ایسی ہے جہاں کہیں آس پاس بھی کتے نہیں رہتے اور یہ کتا کہیں دور دراز سے گھومتا پھرتا ادھر آ گیا ہے، اور جب اس نے بستی سے میرا کھانا آتے ہوئے دیکھا تو یہ بھوک کی وجہ سے کھانا لانے والے کے پیچھے پیچھے چلا آیا اور یہاں آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے جب اس کی حالت دیکھی تو مجھ سے کھانا نہ کھایا جا سکا کہ مبادا میں اس کی توقع اور امید منقطع نہ کر بیٹھوں۔ اس لیے میں نے تسلی سے اسے روٹی کھلا کر آپ کی طرف توجہ کی ہے۔ اب بتایئے! آپ کس لیے تشریف لائے؟

آپ نے فرمایا: ''میں اسی حدیث کی سماعت کے لیے حاضر ہوا تھا وہ آپ نے میرے پوچھنے سے پہلے ہی سنا دی ہے۔ اور مجھے یہی حدیث کافی ہے۔ سبحان اللہ یہ لوگ محض حدیثوں کے جامع اور حافظ ہی نہ ہوتے تھے بلکہ ان سے بڑھ کر کوئی اور عامل بھی نہ ہوتا تھا۔ غور فرمایئے! جو لوگ جانوروں کی توقعات اور امیدیں منقطع کرنے سے لرزتے تھے وہ انسانوں کی امیدوں پر پورا کیوں نہ اترتے ہوں گے۔

......☆......

لاثانی طرزِ سوال [1]

امیر عراق خالد بن عبداللہ قَسرِی اپنے مسلح محافظوں کے ہمراہ کسی دورے پر جا رہا تھا تو راستے میں ایک ایسے شکستہ دل اور بدحال شخص ملا اور اس سے کہنے لگا:

میں تجھے اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ اپنی تلوار سے میری گردان اُڑا دے۔

خالد بن عبداللہ: افسوس ہے تجھ پر کیا تو اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو گیا ہے؟ یا تو بال بچے دار ہو کر زنا کا ارتکاب کر بیٹھا ہے؟

یا تو کسی انسان کو ناحق قتل کر بیٹھا ہے؟

نہیں! بلکہ میں اسلام پر قائم ہوں اور اللہ اور اس کے رسول اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہوں اور میں نے کبھی زنا کا ارتکاب نہیں کیا، نہ شادی شدہ ہونے سے پہلے اور نہ شادی شدہ ہونے کے بعد اور میں نے کبھی کسی انسان کو قتل نہیں کیا، نہ کسی گنہگار کو اور نہ بے گناہ کو۔

خالد بن عبداللہ: تو پھر میں کس وجہ سے تیری گردن اُڑا دوں؟ اور تجھے ناحق قتل کر کے قصوروار بن جاؤں؟

وہ اس لیے کہ میرے پیچھے ایک کرخت دشمن لگا ہوا ہے جو نہ مجھے کہیں باہر جانے دیتا ہے نہ گھر بیٹھنے دیتا ہے، نہ کسی سے بات کرنے دیتا ہے، نہ خاموش بیٹھنے دیتا ہے، میں جب کبھی باہر نکلتا ہوں تو وہ مجھے گریبان سے پکڑ لیتا ہے اور جب واپس جاتا ہوں تو گدی سے پکڑ لیتا ہے اور جب چارپائی پر لیٹتا ہوں تو انگوٹھوں سے میرا

گلا دبا کر ڈیلے نکال دیتا ہے اور میرے خویش و اقارب میری حالت پر ترس کھانے کی بجائے خوش ہوتے ہیں اور میرے دشمن اسے مجھے مزید ذلیل کرنے اور مجھے اس سے بھی زیادہ دبا کر رکھنے کی شہ دیتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس سے میری جان چھڑوائے اور مجھے سکھ کا سانس لینے دے میں تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلا لہٰذا تو میرے ساتھ نیکی کر اور مجھے اور روز روز مرنے سے بچا اور ایک ہی دفعہ مار کر میرا قصہ تمام کر دے، کیونکہ اس دشمن نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔

خالد بن عبداللہ: افسوس، تیرا دشمن بڑا سنگدل اور کمینہ ہے جو تیری مجبوری پر ترس نہیں کھاتا اور تیرے عزیز و اقارب بڑے بے مرّوت ہیں جو تیری مدد کرنے کی بجائے تیری مصیبت پر خوش ہوتے ہیں۔

مجھے بتا اس کا نام کیا ہے اور وہ کہاں رہتا ہے تا کہ میں اس سے تیری جان چھڑواؤں اور تو اطمینان سے زندگی بسر کر سکے۔

جناب اس کا نام قرض ہے اور وہ میرے سر پر سوار رہتا ہے اور میرا خون خشک کرتا رہتا ہے اور مجھ میں اس سے جان چھڑوانے کی سکت نہیں ہے۔ میں نے قرض خواہوں سے ان کے قرض کی ادائیگی کے جتنے وعدے کیے وہ جھوٹے ثابت ہوئے اور اب حال یہ ہے کہ میں گھر سے باہر نکلتا ہوں تو میرا پیچھا کرے ہیں اور گھر میں داخل ہوتا ہوں تو وہ دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ باہر نہ نکلوں تو گالیاں دیتے ہیں اگر نکل پڑوں تو گریبان پکڑ لیتے ہیں اور میرے پاس ان سے جان چھڑدانے کا شرعی و اخلاقی جواز بھی نہیں ہے، قرض کا معاملہ اس قدر سنگین ہے کہ انسان مر بھی جائے تو معاف نہیں ہوتا۔ مجھے اس سے خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔

خالد بن عبداللہ: اے بھلے انسان تجھ پر کتنا قرض ہے؟

جناب! چار ہزار ۴۰۰۰ درہم

اگر چہ کاروباری آدمی کے سامنے چار ہزار ۴۰۰۰ درہم کا قرض کوئی زیادہ قرض نہیں، لیکن جب کسی آدمی کو خسارہ پڑ جائے اور اس کا دیوالیہ نکل جائے تو وہ لوگوں میں بدنام ہو جاتا ہے اور کوئی آدمی اسے اُدھار بھی نہیں دیتا، تاکہ وہ دوبارہ کاروبار کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکے اور پھر عزت دار اور حساس آدمی تو یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ کوئی اس کے دوازے پر کھڑا ہو اور اونچی آواز سے لوگوں کے سامنے اس سے قرض کی واپسی کا تقاضا کرے۔ وہ قرض خواہ کو دیکھ کر یوں لرزتا ہے جیسے وہ کوئی ملک الموت ہے۔ جو اس کی جان لینے آ رہا ہے۔ اس کے لیے چار ہزار درہم کی رقم بھی چار لاکھ درہم کے برابر ہوتی ہے، اس لیے اس نے اپنے گمان کے مطابق بہت زیادہ قرض بتایا جو پورا چار ہزار درہم تھا نہ کم نہ زیادہ۔

خالد بن عبداللہ قسری نے جب چار ہزار درہم کا جملہ سنا تو بلند آواز سے اللہ اکبر کہا اور پھر ساتھیوں سے کہا:

آج کے دن مجھ سے زیادہ منافع کسی آدمی نے حاصل نہ کیا ہوگا۔ میں نے اس آدمی کو تیس ہزار درہم عطا کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، لیکن اس نے چار ہزار درہم بتا کر گویا مجھے چھبیس ہزار درہم واپس کر دیئے،

جب اس آدمی نے یہ سنا تو اس کی باچھیں کھلی رہ گئیں اور اس نے فوراً یہ بات کہی:

اللہ ہمارے امیر کو اپنے ارادے پر قائم رکھے۔ میں نے تو اپنا ظرف ہی آپ کے سامنے کیا تھا، مجھے تو پتا ہی نہ تھا کہ آپ کا ہاتھ اس قدر کشادہ اور ظرف اس قدر فراخ ہے ورنہ میں اس سے زیادہ کا سوال کر دیتا۔ آپ اپنے ارادے پر قائم رہیں۔ اپنے متعلق میرے موجودہ گمان کو کم نہ کریں۔

خالد بن عبداللہ: آپ بے فکر ہو جائیں، ہم ابھی اس دشمن سے تیری جان چھڑواتے ہیں اور اگر تیرا یہ دشمن پھر کبھی تیرا پیچھا کرے تو پھر ہمیں یاد کرنا ہم پھر بھی تمھیں اس کی قید سے ادا کریں گے۔ یہ کہہ کر اس نے تیس ہزار درہم ادا کرنے کا حکم دیا اور آگے بڑھ گیا اور مقروض آدمی ان کے خزانچی کے پاس گیا اور تیس ہزار درہم وصول کر کے شکریہ ادا کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

......☆......

[1] اس قصے کا اصل [illegible]

حقیقی مردمؤمن

ملک شام کے اس پاکیزہ فطرت نوجوان کے دل میں یہ سوچ پیدا ہوئی کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے رسول کی رسالت پر ایمان لانے اور ارکانِ اسلام پر عمل کرنے سے جنت مل سکتی ہے، لیکن اس طرح کے بارِ شریعت کو اٹھا جنت کی طرف سفر کرنا خاصا کٹھن معاملہ ہے اور کتنے سارے مسلمان ہیں جو اس بارِ شریعت کو اٹھا کر جنت کا طویل راستہ طے نہیں کر پا رہے اور ہمت ہار کر فسق و فجور کی راہ پر چل رہے ہیں، لہٰذا کوئی ایسا عمل کیوں نہ اختیار کیا جائے جو عنداللہ مقبول بھی ہو اور اس کے ذریعے جنت کی طرف جانے والا سالہا سال کا طویل سفر مہینوں میں اور مہینوں کا سفر، ہفتوں میں اور ہفتوں کا سفر دنوں میں طے ہو جائے تو اس کے جی میں آیا کہ جہاد فی سبیل اللہ ایک ایسا عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کو بہت ہی پیارا ہے اور زندگی بھر بلاناغہ مسلسل نمازیں پڑھتے رہنا اور روزے سے رہنا اس کے پل برابر نہیں ہو سکتا اور اس کے ذریعے طویل سفر سمٹ سکتا ہے اور انسان بڑی آسانی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاتا ہے، چنانچہ اس نے یہ سوچ کر اپنی وفادار بیوی اور ننھے منے بچوں کو والدین کے ہاں اللہ کے سپرد کیا اور ہتھیار زیب تن کر کے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور معسکر میں پہنچ گیا اور وہاں سے محاذ جنگ پر جانے والے جہادی قافلے میں شریک ہو گیا۔

یہ جہادی قافلہ شام کے سرسبز کھیتوں اور ہرے بھرے باغوں، طویل نہروں اور

وسیع و عریض مرغزاروں، فلک بوس پہاڑوں اور ان کے دامن میں بہتی ہوئی آبشاروں سے گذرتا ہوا فارس وخراسان کے محاذوں پر پہنچ گیا اور جنگوں میں مصروف ہوگیا۔

اس نوجوان نے محاذ جنگ پر شجاعت کے جوہر دکھائے اور اللہ کی نصرت و تائید اور کفار کی ہزیمت اور شکست کے چشم دید مظاہرے دیکھے، اسے وہاں ایک عجیب سماں نظر آیا کہ مجاہدین اسلام دشمن پر حملہ آور ہونے سے قبل ان الفاظ میں دعا کرتے ہیں کہ: اے یونس بن عبید جیسے نیکوکاروں کے ربّ! ہمیں دشمن پر فتح نصیب فرما، پھر وہ دشمن پر یلغار کرتے ہیں تو اللہ ان کی نصرت فرماتا اور انھیں فتح سے ہمکنار کردیتا ہے۔

اس کے دل میں آیا کہ یونس بن عبید ایسا کون سا بزرگ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے نام کی لاج رکھ لیتا ہے اور مسلمانوں کو فتح عطا فرماتا ہے، اچھا اگر اللہ نے شہادت عطا فرمائی تو فبھا، ورنہ اس کی زیارت کی تگ ودو ضرور کروں گا۔

اس دور کے مجاہدین اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ جنگوں میں فتح ونصرت سے ہمکنار ہونے کے ضروری ہے کہ کوئی مجاہد اللہ تعالیٰ سے شرک نہ کرے، نہ تو اللہ کے سوا کسی کے نام کا نعرہ لگائے اور نہ ہی اس کے سوا کسی سے فتح ونصرت طلب کرے، کیونکہ اللہ کے سوا کوئی ہستی فتح نہیں دے سکتی اور جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ ہاں بہت سی ہستیاں فتح دے سکتی ہیں تو وہ مشرک ہے اور مشرک راہِ خدا میں قتل بھی ہوجائے تو وہ جہنمی ہے، اس لیے وہ اپنی یلغاروں کے وقت یاعلی، یا خالد بن ولید کے نعرے نہیں لگایا کرتے تھے، بلکہ صرف یااللہ مدد کہتے یا پھر اللہ کو ان نیکوکاروں کا رب کہہ کر اس سے فتح ونصرت مانگتے۔

اس شامی نوجوان کے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آتا کہ آخر وجہ کیا ہے کہ مجاہدین

خصوصی طور پر: اَللّٰھُمَّ رَبَّ یُوْنُسَ بْنِ عُبَیْدٍ اُنْصُرْنَا عَلیٰ عَدُوِّنَا. کہہ کر فتح کی دعا مانگتے ہیں پتہ نہیں اس بزرگ کے کس عمل کی بنا پر یہ اللہ سے فتح کی امید رکھتے ہیں۔ کاش! اللہ شہادت سے پہلے پہلے اس کی زیارت کروادے خیر اس عرصہ میں لشکر اسلام مختلف محاذوں پر دادِ شجاعت دیتا رہا اور صداقت اسلام کے جھنڈے گاڑتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور مفتوحین ان کے عدل وانصاف اور حسن کردار سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوتے رہے اور اسے مختلف لڑائیوں میں چار چھ ماہ گذر گئے تو ایک دن اس کے دل میں ننھے منے بچوں، وفادار بیوی، بوڑھے والدین اور جوان بہن بھائیوں سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا تو اس نے امیر لشکر سے واپسی کی رخصت مانگی جو اسے آسانی سے مل گئی اور یہ محاذ جنگ سے واپس ہوتا ہوا، عراق کے شہر بصرہ میں پہنچ گیا تاکہ وہاں مالِ غنیمت سے ملنے والے طلائی سکوں سے گھر والوں کے لیے اچھا سا تحفہ خرید سکے، اس نے سوچا کہ عورتیں پھولدار ریشمی ملبوسات کی دلدادہ اور شائق ہوتی ہیں، اس لئے بصرہ کے بازار سے ریشمی تھان خرید لینا چاہیے۔

چنانچہ یہ تحفہ خریدنے کے ارادے سے بصرہ کے بازاروں میں گھومنے لگا، بازاروں میں بڑی چہل پہل اور رونق تھی یہ گھومتا پھرتا ہوا، ایک دکان کے سامنے جا کھڑا ہوا، اس دکان کا مالک اپنے بھتیجے کو دکان پر بٹھا کر نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ یہ اس دکان میں داخل ہو گیا اور رنگا رنگ کے تھان دیکھنے لگا، ان تھانوں میں سے ایک ریشمی تھان اسے بہت پسند آیا، اس نے بچے سے اس کی قیمت پوچھی تو اس نے چار صد ۴۰۰ درہم بتائی، اس نے فوراً چار صد درہم ادا کر دیئے اور تھان لے کر خوشی سے جھومتا ہوا، بازار میں چلنے لگا، تاکہ کچھ دیگر تحائف خرید کر اپنے ملک کی طرف عازم سفر ہو، اسے خوشی اس بات کی تھی کہ وہ ملک شام میں فروخت ہونے والے ریشمی تھانوں کے مقابلے میں سو ۱۰۰ درہم سستا تھان

خرید کر لے جا رہا تھا، اسی دوران اس کا گزر ایک مسجد کے دروازے پر ہوا، اس مسجد میں جماعت ہو چکی تھی اور لوگ بقیہ نوافل ادا کر کے دکانوں کی طرف واپس جا رہے تھے، ان میں سے ایک آدمی اس شامی نوجوان کے پاس آیا اور اس سے پوچھنے لگا:

نوجوان یہ ریشمی تھان کون سی دکان سے خرید کر لے جا رہے ہو؟

جی بازار کی فلاں دکان سے خرید کر لے جا رہا ہوں۔

یہ تھان کتنے میں خریدا ہے؟

چار صد ۴۰۰ درہموں میں خریدا ہے۔

آپ یہ سوٹ مہنگا خرید کر لے جا رہے ہیں، یہ تھان اتنا قیمتی تو نہیں ہے۔

نہیں جناب یہ مہنگا نہیں بلکہ پورے سو ۱۰۰ درہم سستا ہے، ہمارے بازاروں میں یہ پانچ صد ۵۰۰ درہموں سے کم میں نہیں ملتا اور میں تو چار صد درہموں میں خرید کر لے جا رہا ہوں۔

نا میرے برادر! اگر تو نے یہ تھان اسی دکان سے خریدا ہے تو یہ چار صد درہم کا نہیں ہے، میرے ساتھ چل تا کہ اس کی زائد قیمت لوٹائی جا سکے۔

نا صاحب میں واپس نہیں جاؤں گا، میں نے یہ تھان اپنی رضا مندی سے مناسب داموں میں خریدا ہے اور بیچنے والا کوئی نادان بچہ نہیں ہے کہ اس نے مجھے ۱۰۰ درہم سستا فروخت کر دیا ہو۔

میرے برادر تو میرا مسلمان بھائی ہے اور مجھے تیری خیر خواہی مطلوب ہے۔ میں تیرا بھلا چاہتا ہوں اور وہ دکان میری ہے اور جس سے تو نے تھان خریدا ہے وہ میرا بھتیجا ہے، میں کوئی بہانہ کر کے تجھ کو واپس دکان پر نہیں لے جا رہا کہ وہاں جا کر ساڑھے چار یا اس سے زائد درہم وصول کروں یا تھان واپس لے لوں، میرے ساتھ واپس دکان پر چل اور کسی قسم کا خطرہ محسوس نہ کر۔

یہ شامی نوجوان اس پر اعتبار کر کے اس کے ساتھ چل پڑا اور اس دکان پر واپس آ گیا، مالک دکان نے دکان کے اندر داخل ہو کر اپنے بھتیجے سے دریافت کیا:

یہ تھان تو نے اسے فروخت کیا ہے؟

جی ہاں! میں نے ہی فروخت کیا ہے۔

کتنے میں فروخت کیا ہے؟

چار صد درہموں میں۔

تجھے اللہ سے شرم نہ آئی جو تو نے چار صد درہم وصول کر لیے، یہ تھان چار صد درہم کا ہے؟ میں تجھے بتا کر نہیں گیا تھا کہ یہ، یہ تھان چار چار صد درہم کے ہیں اور وہ تھان دو دو صد درہم کے ہیں تو، تو نے دو صد درہم والا تھان چار صدر درہم میں کیوں فروخت کیا؟

چچا جان! اس نے تھان کے دم پوچھے، میں نے چار صد درہم بتائے، جو اس کے وارے میں تھے اور اس نے بخوشی ادا کر دیئے۔

اس نے تو بخوشی ادا کرنے ہی تھے کیونکہ اس کے شہر میں یہ تھان پانچ صدر درہموں میں فروخت ہوتا ہے اور یہاں اسے چار صد درہموں میں مل رہا تھا، لیکن تجھے تو شرم کرنی چاہیے تھی کہ ہماری دکان پر یہ چار صد درہموں کا نہیں بلکہ دو صد درہموں کا ہے۔

اے میرے مسافر بھائی! اگر تجھے یہ تھان پسند ہے تو اسے رکھ لو اور دو صد ۲۰۰ درہم بھی واپس لے لو ورنہ یہ تھان واپس کر کے کوئی ایسا تھان پسند کر لو جو واقعی چار صد درہم کا ہے۔

شامی نوجوان نے دو صد (۲۰۰) درہم واپس لے کر حیرانی کے عالم میں پوچھا:

صاحب آپ کا نام کیا ہے؟

میں مسلمانوں میں سے ایک انسان ہوں، تو نے نام پوچھ کر کیا لینا ہے۔

صاحب تمھیں اللہ کے مقدس نام کی قسم ہے، مجھے اپنا نام ضرور بتا۔

میرے بھائی! میرا نام یونس بن عبید ہے اور میں اس شہر کا عام مسلمان ہوں۔

یہ سن کر شامی نوجوان نے اسے غور سے دیکھا اور کہا اللہ اکبر! آپ ہی ہیں وہ عبد صالح جس کے نام کے حوالے سے ہم دشمن پر فتح حاصل کرنے کے لیے یوں دعا کرتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ رَبَّ يُونُسَ بْنِ عُبَيْدٍ اُنْصُرْنَا عَلٰى عَدُوِّنَا.

شامی نوجوان کے منہ سے یہ الفاظ سن کر یونس بن عبید حیرت سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کہہ کر اس کا منہ تکتے رہ گئے۔

قارئین کرام! یہ تھے یونس بن عبید بصری اللہ کے مقرب بندے جو نہ تو کسی پیر کے دست حق پرست پر بیعت تھے، نہ کسی کے خلیفہ مجاز، نہ تو کسی گدی کے سجادہ نشین تھے نہ کسی درگاہ کے مجاور، نہ اس کے سر پر سبز عمامہ ہوتا تھا، نہ گلے میں موٹے موٹے دانوں والی مالا، یہ سیدھے سادے مسلمان تھے اور تجارت پیشہ تھے اور اپنے پیشے میں سچے اور کھرے انسان تھے، یہ نہ تو نمازِ پنجگانہ کے علاوہ لمبے لمبے نوافل پڑھتے تھے اور نہ رمضان کے علاوہ پے در پے روزے رکھتے تھے۔ یہ اللہ کی مخلوق کے سچے خیر خواہ تھے اور ان کی خیر خواہی کو افضل عمل سمجھتے تھے اور اس کے ذریعے اللہ کا قرب تلاش کرتے تھے اور جب کوئی مسلمان مرد یا عورت اس کے پاس ریشمی تھان فروخت کرنے آتے تھے اور اپنی دانست میں مثلاً اس کی قیمت چار صد ۴۰۰ درہم طلب کرتے تھے، تو یہ وہ تھان دوسرے دکانداروں کو دکھا کر اس کی صحیح قیمت پوچھتے۔ اگر وہ کہہ دیتے کہ یہ ہزار درہم کا ہے تو یہ ان کو چار صد درہم ادا کرنے کی بجائے ہزار درہم ادا کر کے تھان خرید لیتے اور پھر بہت کم منافع پر اسے فروخت

کر دیتے، اللہ ان کی تجارت میں برکت فرماتا اور روزانہ سینکڑوں گاہک ان کی دکان پر بھیج دیتا۔ اور ان کی تجارت روز افزوں ترقی کرتی جاتی ہے۔

یہ تجارت کے نام پر غریب خریداروں کے کپڑے اتار کر حج اور عمرے نہیں کرتے تھے بلکہ خرید و فروخت میں نرمی اور کشادگی پرتنے کو بہت بڑا حج اور عمرہ سمجھتے تھے، ان کی ایسی ہی خیر خواہی اور سچائی اللہ کو پسند آ گئی اور وہ اُن سے محبت کرنے لگا، جب اس نے محبت کرنی شروع کی تو جبرائیل بھی اُن سے محبت کرنے لگا اور جب جبرائیل محبت کرنی شروع کی تو تمام ملائکہ کرام بھی ان سے محبت کرنے لگے اور ان کے محبت کرنے کی وجہ سے یہ مؤمنین کی آنکھوں کا تارا بن گئے اور لوگ اس کے نام کے حوالے سے اللہ سے فتح و نصرت کا سوال کرنے لگے اور وہ ان کی دعاؤں کو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے بمصداق فوراً قبول فرمانے لگا۔

......☆......

بے مثال فقاہت[1]

برادرِ حقیقی کی وراثت (چھ صد دینار) میں سے ایک دینار ملنے پر یہ خاتون خاصی ناراض ہوئی اور اس نے سمجھا کہ میرے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے لیکن اس میں وراثت تقسیم کرنے والے کا بھی کوئی قصور نہ تھا اور نہ ہی اس کی کسی کے ساتھ خونی رشتہ داری تھی جو اسے بے انصافی کرنے پر مائل کرتی، یہ خاتون اُٹھی اور اپنے دور کے فقیہ اعظم امام نعمان بن ثابت کوفی کی خدمت میں اس اُمید پر پیش ہوئی کہ شاید وہ اس بے انصافی کا مداوا کر سکیں اور مجھے میرا جائز حق دلوا سکیں، اگرچہ اس دور میں کوفہ اہل علم و فضل کا گڑھ تھا لیکن حضرت امام نعمان بن ثابت جیسے قمر منیر کی موجودگی میں نجوم کی روشنی ماند پڑ چکی تھی، امام صاحب کو اللہ تعالیٰ نے فہم و فراست، فصاحت و سماحت، جود و سخا اور بذل و عطاء، ہمدردی و غمگساری، تواضع و انکساری جیسے اخلاق جمیلہ سے متصف کر رکھا تھا آپ نہایت ہی خوش رنگ، خوش خوراک اور خوش پوشاک اور خوش اخلاق انسان تھے اور اس قدر فیاض اور کریم تھے کہ جب کبھی اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے ملبوسات و ماکولات خریدنے کا ارادہ کرتے تو اپنے ہم عصر علما کرام اور ائمہ دین کے لیے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ ملبوسات اور ماکولات خرید لیتے اور ان کی خدمت میں ہدیے پیش کرتے اور نادار طلبا دین کی کفالت بھی کرتے حتی کہ آپ نے حسبتاً للہ امام یعقوب بن ابراہیم اور ان کے کنبے کی دس سال تک کفالت کی اور انھیں علم کی دولت سے اس قدر مالا مال کر دیا کہ وہ اپنے دور کے

چیف جسٹس بن گئے۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے جس قدر فقہ و اجتہاد کا ملکہ عطا فرمایا تھا اسی قدر آپ نفسانیت اور کبر و نخوت سے پاک اور للّٰہیت سے معمور تھے، چنانچہ آپ نے اس عورت کی بات سُنی تو پوچھا کہ تیرے بھائی کا ترکہ تقسیم کرنے والا کون ہے، تو اس نے حضرت امام داؤد طائی کا نام بتایا۔

حضرت امام داؤد طائی کوئی معمولی درجہ کے عالم نہ تھے کہ ان سے بے احتیاطی کا گمان ہوتا ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے علم و عمل سے خاصا حصہ عطا فرمایا تھا جونہی حضرت نعمان بن ثابت نے ان کا نام سنا تو لحہ بھر توقف کیا تو آپ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس عورت کے حصے میں چھ صد دینار میں سے ایک دینار اسی صورت میں آ سکتا ہے کہ اس کے بھائی کی ایک بیوی اور دو بیٹیاں اور ایک بہن اور بارہ بھائی اور ایک بہن ہو اور اسکی ماں بھی زندہ ہو، چنانچہ آپ نے اس سے دریافت کیا:

کیا تیرے بھائی کے ورثا میں دو بیٹیاں نہیں ہیں؟

جی ہاں! اس کی دو بیٹیاں بھی ہیں۔

اور کیا اس کی ماں زندہ نہیں ہے؟

جی ہاں! اس کی ماں بھی زندہ ہے۔

کیا اس کی ایک بیوی بھی ہے؟

جی ہاں! اس کی ایک بیوی بھی ہے۔

کیا اس کی ایک بہن اور بارہ بھائی بھی ہیں جو ابھی زندہ ہیں؟

جی ہاں! اسکے بارہ بھائی بھی اللہ کے فضل و کرم سے زندہ ہیں اور ایک بہن ہے اور وہ میں ہی ہوں۔

تو پھر تیرا حق ایک دینار ہی ہے، تیرے ساتھ بے انصافی نہیں ہوئی کیونکہ اس

کی دو بیٹیوں کو ۶۰۰ دینار میں سے دو ثلث ملے اور وہ چار صد ۴۰۰ دینار بنتے ہیں۔
اور اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملا اور وہ ایک ۱۰۰ سو دینار بنا اس طرح پانچ صد دینار ان کو مل گئے، باقی ایک صد (۱۰۰) دینار بچے۔ ان میں سے اس کی بیوی کو آٹھواں حصہ ملا اور وہ پچھتر (۷۵) دینار بنتے ہیں اور باقی پچیس دینار بچے ان میں سے اس کے بارہ بھائیوں کو دو دو دینار ملے اس طرح چوبیس (۲۴) دینار وہ لے گئے اور باقی ایک دینار بچا سو وہ تیرا ہے۔

خاتون کا مختصر سوال سن کر ورثاء میت کی تعداد اور ان کا حصہ بتا دینا کمال درجے کی فقہ نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ کی فقہ واجتہاد کے اس طرح کے بے شمار قصوں کی وجہ سے امام ذہبی رحمہ اللہ کو لکھنا پڑا کہ:

((اَلْاِمَامَةُ فِي الْفِقْهِ وَدَقَائِقِهِ مُسَلَّمَةٌ إِلٰى هٰذَا الْاِمَامِ وَهٰذَا اَمْرٌ لَا شَكَّ فِيْهِ.))

''اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ فقہ اور اس کی باریکیاں اس امام کے سپرد کی گئی ہیں۔''

آپ کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آپ نے ہم عصر علما کی کبھی غیبت نہ کی اور نہ ان سے حسد کیا۔ نیز آپ نے اپنا دین اور ایمان بچانے کے لیے والی عراق ابن ہبیرہ اور خلیفہ بغداد منصور عباسی کی طرف سے چیف جسٹس کا عہدہ قبول نہ کیا اور اسکی پاداش میں کوڑے برداشت کر لیے اور بعد میں کوڑے مارنے والے کو بھی صدق دل سے معاف کر دیا کیونکہ اسے خواب میں رسول کریم ﷺ ملے تو آپ ﷺ نے اسے اپنے اُمتی کو بلاقصور مارنے پر اللہ کے عذاب سے ڈرایا تھا۔

---

[1] اس قصے کا اصل عقود الجمان، ص: ۲۶۱ پر ہے۔

صلہ بن اشیم کی شب بیداری

تاریک رات کا نصف حصہ گذر چکا تھا اور دن بھر کے تھکے ماندے مجاہدین سرزمین کابل (افغانستان) کے میدان میں میٹھی میٹھی نیند کے مزے لوٹ رہے تھے انہیں اپنے اردگرد کے پہاڑوں کی غاروں اور جنگل کے درختوں کے درمیان چلنے پھرنے والے شیروں کے دھاڑنے، ہاتھیوں کے چنگھاڑنے، چیتوں کے غرّانے، بھیڑیوں کے چلانے اور گیدڑوں کے واویلا کرنے کی مطلقاً خبر نہ تھی۔ پہرے دار بھی آدھی رات تک پہرہ دینے کے بعد اپنی خوابگاھوں میں سو چکے تھے تاریکی کے اس عالم میں ایک بوڑھا مجاہد جو اس انتظار میں بستر پر لیٹا ہوا تھا کہ تمام مجاہدین گہری نیند سو جائیں اور اسے تنہائی میں یکسوئی کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں راز و نیاز کا موقعہ مل سکے جب اس نے محسوس کیا کہ اب تمام مجاہدین گہری نیند میں مستغرق ہو کر خراٹے لے رہے ہیں تو وہ اپنی خوابگاہ سے اٹھا اور دبے پاؤں چل کر چھاونی سے باہر آ گیا اور قریبی جنگل کے درختوں کی جھنگی داخل ہو گیا اسی دوران ایک دوسرا مجاہد جعفر بن زید جو عرصہ سے اس بوڑھے مجاہد کی خفیہ عبادت کی ٹوہ میں تھا وہ بھی اپنے بستر سے اٹھا اور فاصلہ رکھ کر اس بوڑھے مجاہد کے پیچھے درختوں کی جھنگی میں داخل ہو گیا اور چھپ کر دیکھنے لگا کہ بھلا یہ بوڑھا مجاہد کیا کرتا ہے؟

بوڑھے مجاہد نے پہلے تو بڑے اطمینان سے وضو کیا اور پھر درختوں کی جھنگی کے درمیان کپڑا بچھا کر نماز تہجد شروع کر دی اور بڑی رقت آمیز آواز سے قرآن پڑھنا

شروع کر دیا جہاں کہیں جنت کا ذکر ہوتا وہاں اللہ سے جنت کا سوال کرتا اور جہاں کہیں دوزخ اور اس کے عذابوں کا ذکر ہوتا وہاں گڑگڑا کر اللہ کی پناہ مانگتا اسے نماز میں تلاوت قرآن سے وہ لطف وسرور حاصل ہو رہا تھا جو بیان سے باہر ہے وہ ابھی پہلی ہی رکعت میں تھا کہ اسی دوران ایک جنگلی شیر بھی ادھر آ نکلا اور اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ جب جعفر بن زید کی نظر اس شیر پر پڑی تو وہ مارے خوف کے لرزنے لگا اور جھٹ پٹ میں قریبی درخت پر چڑھ گیا اور خدشہ محسوس کرنے لگا کہ یہ ابھی اسے پھاڑ کھائے گا۔

لیکن بوڑھا مجاہد مطلقاً خوف زدہ نہ ہوا اور بدستور قرآن پڑھتا رہا ایک دفعہ اس نے معمولی سی نظر ڈال کر شیر کو یوں دیکھا کہ گویا وہ کوئی جنگلی چوہا ہو اور اسے ذرّہ برابر بھی خاطر میں نہ لایا جب اس نے قرات مکمل کر لی تو نہایت اطمینان سے رکوع میں چلا گیا اور اس میں بڑی رقت کے ساتھ تسبیحات پڑھیں اور پھر سیدھا کھڑا ہو کر بڑے ادب سے اللہ کی حمد وثنا بیان کرنے لگا اور پھر بڑے خضوع وخشوع کے ساتھ طویل سجدے کرتا رہا اور ان سجدوں میں سسکیاں لے کر روتا رہا، اور اس طریقے سے نماز پڑھی کہ گویا وہ باری تعالیٰ کو دیکھ رہا ہو جب اس نے دو رکعت پوری کرنے کے بعد سلام پھیرا تو بڑے سکون اور حوصلے کے ساتھ شیر سے کہا۔

”اے درندے اپنا رزق کسی اور جگہ سے تلاش کر مجھے اللہ نے تیری خوراک نہیں بنایا۔“

جب شیر نے یہ جواب سنا تو گرجدار آواز سے دھاڑنے لگا اس کی آواز اس قدر خوفناک تھی کہ گویا پہاڑ پھاڑ دے تاہم بوڑھے مجاہد نے مطلقاً پروانہ کی اور دوبارہ نماز میں مشغول ہو گیا اور پرسوز اور دھیمی آواز سے قرآن پڑھنے لگا جب اس نے خشوع وخضوع کے ساتھ آٹھ رکعات اور تین وتر مکمل کر لئے تو دوزانو ہو کر اللہ تعالیٰ

کی اتنی شاندار حمد وثنا بیان کی کہ کمال کر دیا اور پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر اس قدر رویا کہ درخت پر بیٹھے جعفر بن زید کے آنسو بھی ٹپکنے لگے آخر میں اس نے اپنی طویل دعا اس التجاء پر ختم کی کہ۔

اے اللہ! تو مجھے دوزخ کی آگ سے ہی بچالے اور پھر میرے جیسا سیاہ کار تجھ سے جنت کا سوال کرے تو یہ چھوٹا منہ اور بڑی بات کے مترادف ہے پھر وہ دبے پاؤں واپس چھاؤنی میں آیا اور اپنے بستر پر خاموشی سے لیٹ گیا اور اس اذان فجر کے وقت بستر سے یوں اٹھا کہ گویا وہ عشاء سے لیکر اذان تک سوتا ہی رہا ہو۔

رات کی تاریکیوں میں چوروں کی طرح چھپ چھپ کر عبادت کرنے والے اس بوڑھے مجاہد کا نام صلہ بن اشیم عدوی تھا، ایک سوتیں سال کی عمر پانے والے اس مجاہد کو بچپن سے ہی عبادت وریاضت کا شوق تھا۔ لیکن یہ اپنے نماز روزے پر قانع نہ تھا بلکہ چاہتا تھا کہ اسے اللہ کی راہ میں شہادت نصیب ہو وہ اسی آرزو میں بڑے بڑے معرکوں میں حصہ لیتا اور نامور سپہ سالاروں اور سورماؤں کو ان کی اوقات یاد کرا دیتا اس کے اسی اخلاص کی برکت تھی کہ لوگ والہانہ انداز میں اس کا احترام کرتے اور اس کے آگے بچھ بچھ جاتے تھے اور انسان تو انسان رہے درندے میں ان کا لحاظ کرتے جعفر بن زید رحمہ اللہ جو عرصہ دراز سے لوگوں کے دلوں میں اسکی محبت والفت کے بھید کی تلاش میں تھے وہ جان گئے کہ اس بوڑھے مجاہد کا یہی خفیہ عمل ہے جو اللہ کو پسند آ گیا ہے اور اس نے اسے جن وانس اور ملائکہ کرام کا محبوب بنا دیا ہے۔

......☆......

رزقِ حلال کی برکات[1]

نوجوان طالب علم ابراہیم ہلالی نے حلب کے سرسبز کھیتوں اور ہرے بھرے باغوں، شفاف چشموں اور بہتی ہوئی آبشاروں، خوشنما ندیوں اور وسیع وعریض سبزہ زاروں، پیارے ماں باپ اور عزیز بہن بھائیوں کو چھوڑا اور حصولِ علم کی غرض سے مصر کے دریاؤں اور صحراؤں کو عبور کرنا شروع کر دیا۔ یہ ۱۲۰۰ صدی ہجری کی بات ہے، اس دور میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور جامعہ اُمّ القریٰ مکہ مکرمہ جیسی یونیورسٹیاں وجود میں نہ آئی تھیں اور طلبہ کو حصولِ علم کی خاطر مصر کی جامعہ الازھر میں داخلہ لینا پڑتا تھا۔

اگر اللہ نے اس کے مقدر میں سعادت نہ لکھی ہوتی تو یہ بھی دیگر حلبیوں کی طرح من مرضی کا کھاتا اور من مرضی کا سوتا اور من مرضی کا پہنتا، لیکن اسے ڈھور ڈنگروں کی طرح زندگی بسر کرنا پسند نہ تھا۔ یہ سمجھتا تھا کہ علم زندگی ہے اور جہالت موت ہے اور نامور انسانوں کی طرح چند سال زندہ رہنا، گمنام انسانوں کی طرح صدیوں زندہ رہنے سے بہتر ہے کیونکہ علم والے مر جانے کے باوجود صدیوں سے زندہ ہیں اور بے علم زندہ ہونے کے باوجود مردوں کی طرح گمنام پھرتے ہیں۔

ان کے دل میں صرف دنیوی علم کے حصول کی خواہش نہ تھی، بلکہ اس علم کے حصول کی خواہش تھی، جو انھیں صراطِ مستقیم پر گامزن کر کے جنت میں پہنچا دے۔ اس مقصد کے لیے اسے خالصتاً دینی یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہیے تھا، لیکن اس

وقت کوئی ایسی یونیورسٹی وجود میں نہ آئی تھی جہاں یہ داخلہ لیتے، مجبوراً یہ قاہرہ چلے گئے اور حصولِ علم میں منہمک ہوگئے اور عرصہ دراز تک مختلف شیوخ سے استفادہ کرتے رہے، ایک سال ان پر ایسا گذرا کہ ان کا ہاتھ تنگ ہوگیا۔

اور ان کے پاس کھانے پینے اور نیا لباس خریدنے کے لیے پیسہ نہ بچا اور یہ ساتھیوں سے قرض لے کر گذارا کرتے رہے اور حصولِ علم میں مشغول رہے تا آنکہ ان کا حال ابتر ہوگیا اور یہ نان جویں کو ترسنے لگے بایں ہمہ ان کی غیرت مند طبیعت کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے نہ دیتی۔ ایک روز ایسا ہوا کہ آپ نا قابل برداشت بھوک کے سامنے بے بس ہوگئے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے قاہرہ کی کسی گلی میں داخل ہوگئے، تاکہ کسی خدا ترس انسان کو مل کر اس سے چند لقمے حاصل کریں اور بھوک مٹالیں۔ اسی دوران اس گلی میں ایک گھر کا دروازہ کھلا ہوا، نظر آیا۔ انہیں اس گھر سے کھانے کی خوشبو آئی تو یہ اس کے اندر داخل ہوگئے اور چاروں طرف نگاہ دوڑانے لگے کہ شاید کوئی فرد خانہ مل جائے اور وہ اس سے کھانا طلب کرسکیں، لیکن انھیں وہاں کوئی انسان نظر نہ آیا۔

یہ صحن کے ایک کونے میں واقع کچن میں داخل ہوگئے، وہاں تیار شدہ لذیذ کھانا پڑا تھا۔

انھوں نے چمچ اُٹھایا اور اس کھانے میں ڈبو دیا، جب اسے بھر کر منہ کے قریب لے آئے تو اللہ کا خوف غالب آگیا اور انھوں نے بغیر اجازت اُٹھایا ہوا لقمہ واپس رکھ دیا اور بھوکے پیاسے باہر نکل آئے اور واپس یونیورسٹی میں داخل ہوگئے اور اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ ابھی وہاں چند منٹ بیٹھے ہی تھے کہ دو آدمی اندر آئے، ان میں سے ایک شخص ان کا شیخ تھا اور دوسرا شخص کوئی اجنبی انسان تھا۔ ان کے شیخ نے آتے ہی یہ بات کہی کہ اے ابراہیم یہ تعلیم یافتہ شخص ہے اور یہ اپنی بیٹی کے لیے

رشتہ تلاش کر رہا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی بیٹی کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاؤ اور میں اسی غرض سے اسے تمہارے پاس لایا ہوں، لہٰذا اللہ کا نام لے کر اُٹھو اور ہمارے ساتھ چلو، تاکہ ایجاب وقبول کر کے عقد نکاح مکمل کریں اور تمھیں اس کے گھر کا فرد بنا دیں۔ ابراہیم ھلالی اپنے شیخ کے ارشاد کی تعمیل میں اُٹھے اور ان کے ساتھ چل دیئے اور اسی گھر میں داخل ہو گئے، جس میں وہ کھانا دیکھ کر اور اس میں چمچ ڈبو کر چھوڑ آئے تھے۔ جب عقد نکاح کا عمل مکمل ہوا تو اس لڑکی کے والد نے کچن سے کھانا لا کر سامنے رکھ دیا۔

ابراہیم ھلالی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سبحان اللہ یہ وہی کھانا ہے جس سے میں نے چمچ بھرا تھا اور پھر اس لیے واپس رکھ دیا تھا کہ کسی کا کھانا اسکی اجازت کے بغیر تناول کرنا حلال نہیں ہے اور جب میں نے اللہ کے خوف سے ناجائز لقمہ چھوڑ دیا تو اس نے اپنے فضل سے مجھے اس گھر کا محترم داماد بنا دیا اور حلال طریقے سے وہی کھانا میرے سامنے رکھوا دیا۔

چنانچہ تکمیل تعلیم کے بعد ابراہیم ھلالی اپنی اس بیوی کو حلب میں لے آئے اور وہ ان کے نیک بیٹوں کی نیک ماں ثابت ہوئی۔

......☆......

[1] اس قصے کا اصل اعلام النبلاء بتاریخ حلب الشہباء میں ہے۔

کافور اخشیدی کی بلند ہمتی

بازار مصر میں غلاموں اور کنیزوں کی منڈی لگی ہوئی تھی۔ اور اس میں مختلف نسلوں اور ملکوں سے تعلق رکھنے والے ہنر منداور غیر ہنر مند تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ، خوبصورت اور بدصورت، ذہین اور غبی، گورے اور کالے غلاموں اور لونڈیوں کی بولیاں لگ رہی تھیں جاگیر دار اور تجار، صنعت کار اور سرکاری افسران اپنی اپنی ضروریات کے مطابق انہیں خرید خرید کر لے جارہے تھے اگر کسی کو زمینوں پر کام کرنیوالوں کی ضرورت تھی تو وہ لمبے تڑنگے، حبشی غلاموں کو خرید رہا تھا اور اگر کسی کو اپنے سامان تجارت فروخت کرنے کی ضرورت تھی تو وہ تربیت یافتہ رومی غلاموں کو خرید رہا تھا اور اگر کسی کو صنعت و حرفت سے غرض تھی تو وہ ہنر مندوں کو خرید رہا تھا اور جس کسی کو اپنی مجلسیں پر رونق رکھنے کی ضرورت تھی تو وہ خوش شکل اور خوش آواز مصریوں کو خرید رہا تھا اور جس کسی کو گھریلوں کام کاج کی ضرورت تھی تو وہ غبی اور بدصورت غلاموں کو خرید رہا تھا۔ اسی عالم میں سوڈان کا کوئی تاجر اپنے ملک سے دو غلام فروخت کرنے کی غرض سے بازار مصر میں داخل ہوتو اس کے دونوں غلاموں کی نگاہیں شہر کے پر رونق کے بازاروں پر پڑیں ان میں سے ایک نے اپنے دل میں یہ خواہش کی کہ کاش میں اس شہر کا مالک بن جاؤں اور ٹھاٹھ کے ساتھ زندگی بسر کروں دوسرے نے خواہش کی کہ کاش مجھے یہ ہوٹل والا ہی خرید لے اور میں آٹا گوندھ کر تنور پر روٹیاں لگاؤں اور سالن تیار کروں خود بھی پیٹ بھر کر کھاؤں اور لوگوں کو بھی

چنانچہ یہ دونوں اپنے اپنے دلوں میں اپنی اپنی آرزو لے کر غلاموں اور کنیزوں کی منڈی میں داخل ہوئے اور ان کی بولی لگنے لگی اور یہ دونوں بھی فروخت ہو گئے ایک کو کسی ہوٹل والے نے خرید لیا اور اسے اپنے ہوٹل پر کھانا پکانے پر لگا دیا اور دوسرے کو کسی فوجی سپہ سالار نے خرید لیا اور اسے فوجی امور سرانجام دینے پر لگا دیا چنانچہ اس غلام نے اپنی صلاحیتوں سے کام لینا شروع کر دیا اور وہ ترقی کرتا شاہ مصر اخشید کا منظور نظر بن گیا اور اس نے مسلمانوں کے سینوں سے اسلامیت کو ملیا میٹ کرنے اور بیت اللہ سے حجر اسود اکھاڑنے والے فاطمیوں کی یلغاروں کو روکنے کے لیے بے مثال خدمات سرانجام دیں اور بیس سال تک دولت اخشید یہ کو ان کی یلغاروں سے محفوظ رکھا۔ شاہ مصر اخشید نے اس کی ایسی خدمات سے متاثر ہو کر اسے اپنا وزیر اعظم بنا لیا اور بعد ازاں یہی سیاہ فام حبشی ملک مصر اور شام کا بادشاہ بن گیا ایک دن یہ اپنے وزراء اور اعیان سلطنت کے ہمراہ بازار مصر سے گذر رہا تھا تو اس کی نظر اپنے اس حبشی ساتھی پر پڑی جو کسی ہوٹل پر بیٹھا روٹیاں پکا رہا تھا اور اس کی حالت نہایت ہی قابل رحم نظر آ رہی تھی تو کافور نے کہا: افسوس صد افسوس

اس شخص کو اس کی پست خواہش نے ہی اس تنور پر بٹھا رکھا ہے اگر اس کی خواہش بلند ہوتی تو شاید یہ بلند درجے پر فائز ہو جاتا۔

پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ میں اور یہ شخص دونوں ایک شریف آقا کے غلام تھے اور جب ہمارا وہ آقا ہمیں فروخت کرنے کے لیے بازار مصر میں لایا تو اس کی نگاہ اسی ہوٹل پر پڑی تو اس نے خواہش کی کہ کاش مجھے اس ہوٹل والا ہی خرید لے اور میں یہاں روٹیاں پکاؤں: اور پیٹ بھر کر خود بھی کھاؤں اور لوگوں کو بھی کھلاؤں اور میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش میں اس شہر کا حاکم بن جاؤں۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اسے ہوٹل والے نے خرید لیا اور یہ اس وقت سے لیکر آج تک یہاں روٹیاں پکار رہا ہے اور مجھے ایک فوجی افسر نے خرید لیا اور میں اپنے بلند عزم وارادہ اور خواہش کے مطابق اس مقام پر ہوں جو آپ دیکھ رہے ہیں

قارئین کرام آپ کو علم ہے کہ اس حبشی غلام کو شاہ مصر بننے کے بعد خوشامدی کس نام سے پکارتے تھے وہ نام تھا کافور اخشیدی (یعنی سفید رنگ کی ٹیکیا)

اللہ تعالی عمرو بن العاص قریشی سہمی پر رحمتیں برسائے انہوں نے کیا خوب فرمایا:

اَلْمرء حَیْثُ یجعَلُ نَفْسَه فاِنْ رَفَعَهاارْتَفعَتْ وَاِنْ وَضعهَا اِتَّضَعَتْ

کہ آدمی وہاں ہوتا ہے جہاں اپنے آپ کو رکھے اگر وہ اپنی شخصیت کو بلند رکھنا چاہے تو وہ بلند ہو جائے گی اور اگر پست رکھنا چاہے تو وہ پست ہو جائیگی

تحریک آزادی ھند کے سرخیل مولانا ابوالکلام آزاد کے تذکروں میں لکھا ہے کہ یہ بچپن میں ماچس کی خالی ڈبیاں آگے پیچھے جوڑ کر کھلونا نما ریل گاڑی بناتے اور اپنی بہنوں سے کہتے کہ تم گھر کے فلاں کونے پر کھڑی ہو جاؤ اور جب میں ان ماچسوں سے بنی ریل گاڑی لیکر علامتی اسٹیشن پر آؤں تو تم نے کھڑی ہو کر تالیاں بجانا اور کہنا: مولانا آ گئے مولانا آ گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی بڑی بہن ان سے کہتی کہ بھائی صاحب اس گاڑی میں تو کوئی مولانا نام کی کوئی شئی نہیں تو ہم کس کے لیے تالیاں بجائیں؟ وہ کہتے یہ کھیل ہی تو ہے اس لیے تم نے اس کی آمد پر فلاں کونے میں تالیاں بجانا چنانچہ اللہ کا ایسا ہوا کہ محی الدین (احمد) واقعی مولانا ابوالکلام بن گئے اور وہ دن بھی آئے کہ جب مولانا عوامی جلسوں کے جم غفیر سے خطاب کرنے جاتے تو جونہی ریل گاڑی اسٹیشن پر آتی تو عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر انہیں ہتھیلیوں پر اٹھا کر جلسہ گاہوں طرف لے آتا اور اسٹیج پر اتار دیتا اور اس قدر خاموشی سے ان کا خطاب سنتا کہ گویا

ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔

اگرچہ انسانوں کو ان کے مقدر کا لکھا ہوا ہی ملتا ہے لیکن ان کے عزائم تو بلند ہونے چاہیں دنیا میں آپکو سیاست وامارت، علم وفضل، سائنس وٹیکنالوجی، فلسفہ وطب، حدیث وفقہ میں جتنے بھی نامی گرامی نظر آئیں گے وہ بلند ہمت نظر آئیں گے ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہوگا جسے محض اپنے پیٹ یا اپنے ہی بال بچوں اور خاندان کی فکر ہو۔

......☆......

ڈرپوک فاتح

کردار!

(روح بن حاتم، بغدادی لشکر کا سپہ سالار ہے ابودُلامہ، فوج میں سپاہی اور عباسی دربار کا ظریف شاعر ہے۔ ثمامہ، رُوح بن حاتم کا ندیم اور مصاحب خاص ہے

(خراسان میں خارجیوں کے ساتھ جنگ زوروں پر ہے

سرکاری لشکر اور باغی لشکر آمنے سامنے الرٹ کھڑے ہیں

سرکاری لشکر کا سپہ سالار رُوح بن حاتم مھلبی اپنے لشکر کے

ظریف شاعر اور بزدل سپاہی ابودلامہ کو خارجی جنگجو سے دو

دو ہاتھ کرنے کے لئے میدان جنگ میں اترنے کا حکم دیتا

ہے جبکہ ابودُلامہ اپنی فطری بزدلی کی بنا پر میدان میں اترنے

سے ڈرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی کو میری بزدلی کا بھی پتہ نہ

چلے اور میری جان بھی بچ جائے اور عزت بھی رہ جائے اس

لئے وہ لڑائی سے بھاگنے کے لئے بڑے بہانے کرتا ہے

لیکن سپہ سالار اسے میدان میں اتارنے پر بضد ہے کیونکہ

یہ عرصہ دراز سے مفت میں فوج سے تنخواہ لے رہا تھا اور

جنگ کے موقع پر کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے کھسک جاتا تھا)

رُوح بن حاتم: ابودلامہ۔ آج میدان میں نکلو اور اس جنگجو سے دو دو ہاتھ کرو۔ دیکھو وہ کس طرح میدان جنگ میں اِترا رہا ہے۔

ابودلامۃ: میں ہی کیوں نکلوں؟ کیا فوج میں اور کوئی نہیں رہ گیا جو اس کا مقابلہ کرے؟

روح بن حاتم: سارے فوجی عرصہ دراز سے میدان جنگ میں داد شجاعت دے رہے ہیں، لیکن تو نے آج تک کوئی لڑائی نہیں لڑی اور مفت میں تنخواہ کھا رہا ہے۔

ابودلامۃ: جناب میں فوج کے ساتھ مل کر لڑنے کی تنخواہ لے رہا ہوں۔ دشمن کے مقابلے آ کر مرنے کی تنخواہ نہیں لے رہا۔

روح بن حاتم: لڑنے کے لئے تنخواہ لینے والے کو مرنا بھی پڑتا ہے دیکھو ہم لڑتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔

ابودلامۃ: آل مھلب، دشمنوں سے لڑنا اور مرنا تو تمھاری وراثت ہے اس لئے تمہیں موت سے خوف نہیں آتا جبکہ میرا قبیلہ بزدل اور ڈرپوک ہونے میں اپنی مثال آپ ہے اور میدان جنگ سے بھاگنے والوں میں اول نمبر پر ہے۔ لہٰذا مجھے اس دیو کے مقابلے میں آنے سے معافی دی جائے۔

روح بن حاتم: آج کسی طرح کی معافی نہیں مل سکتی، تجھے اس کے مقابلے میں اُترنا پڑے گا، لہٰذا مقابلے کے لئے نکلو اور اسے خاک وخون میں تڑپا کر اس کا غرور خاک میں ملا دو دیر نہ کرو، ورنہ وہ سمجھے گا کہ سرکاری فوج کے سپاہی بزدل ہیں۔

ابودلامۃ: اچھا اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو مجھے اپنا گھوڑا اور تلوار دیں تاکہ میں اس سے پنجہ آزمائی کروں۔

روح بن حاتم: لو یہ میرا گھوڑا اور میری تلوار، اور میدان میں اترو۔

(پتھریلی زمین پر گھوڑے کی ٹاپوں اور اس کے ہنہنانے کی آواز سنائی دیتی ہے)

ثمامہ: دیکھئے: وہ ابودلامۃ آپ کے گھوڑے سمیت میدان میں کود پڑا ہے۔

روح: (قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے) کیا وہ اپنے ہاتھ میں تلوار تھامے ہوئے ہے؟

ثمامہ: ہاں وہ اسے دائیں اور بائیں لہرا رہا ہے۔

(دونوں لشکروں کے سپاہی اس کی دلاوری پر ہوٹنگ کرتے ہوئے)

آج شیر جوان مقابلے کے لئے نکلا تو ہے خدا خیر کرے۔

روح بن حاتم: وائے رسوائی، ابودلامۃ تو میدان میں یکا یک رُک گیا ہے!

ثمامہ: اسے کیا ہوا: یہ اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر کیا سوچ رہا ہے؟

روح بن حاتم: شاید یہ دشمن کو ہنسانے کے لئے کوئی لطیفہ سوچ رہا ہو!

ابودلامۃ: (دشمنوں کو للکار مارتے ہوئے) او، اپنی جان کے دشمنوں، تم میں سے کوئی جانباز، مجھ سے لڑنے کے لئے تیار ہے؟

ثمامہ: (امیر لشکر کا مصاحب خاص) جناب امیر ابودلامۃ کچھ بولا تو ہے۔

ابودلامۃ: تم میں سے جو کوئی چاہتا ہے کہ اس کی ماں اسے گم پائے، وہ میرے مقابلے پر آ جائے۔

(دھیمی سی آواز سنائی دیتی ہے) ثمامہ

ثمامہ: وہ اسے کچھ کہہ رہے ہیں۔

روح بن حاتم: آپ کو کچھ سنائی دے رہا ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

ثمامہ: اللہ کی قسم کچھ سنائی نہیں دے رہا۔

ابودلامۃ: (آواز سنائی دیتی ہے) تمھاری مائیں تم پر روئیں وقفے کا وقت مقابلے میں حائل نہ ہونے پائے۔ تم میں سے کوئی دلیر ہے تو سامنے آئے:

میں وہ مرد ہوں کہ میری ماں میرا نام رکھا ہے زند

میرے مقابلے میں تنہا آئے جو ہے موت کا خواہش مند
میں ڈال دونگا اسکی گردن میں موت کی کمند

روح بن حاتم: اللہ کی قسم اس نے کیا خوب جنگی رجز پڑھا ہے۔

ثمامہ: دیکھو، دشمن کا جنگ باز اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

روح بن حاتم: وائے بربادی، کیا یہ وہی جنگباز تو نہیں جس نے کل دو تلواروں سے جنگ کی؟

ثمامہ: بخدا! یہ تو وہی ہے۔

روح: وائے بہر حال ابودلامہ۔ یہ تو ابودلامہ کو موت کے گھاٹ پر اتار کر چھوڑے گا۔

ابودلامہ: (دشمن جانباز سے) تیرا ناس ہو، تو رجز (جنگی شعر) کیوں نہیں پڑھتا۔

جانباز: تجھ پر رونے والی روئیں۔ میری تلوار ہی جنگی رجز کا عملی مظاہرہ کرے گی۔

ابودلامہ: (دیوہیکل مدمقابل کی ننگی تلوار کے خوف سے گوز خارج کرتے ہوئے) دراصل میں کوئی چیز بھول آیا ہوں، میں اسے لے کر ابھی واپس آیا۔ لہٰذا میرے یہاں آنے تک کھڑا رہنا، اگر تو یہاں سے چلا گیا تو میں سمجھوں گا کہ تو میرا سامنا کرنے سے ڈر گیا ہے۔

ثمامہ: وائے بدنامی، وہ تو اپنے مدمقابل سے کنی کترا کر واپس آ رہا ہے۔

روح بن حاتم: إنا لله وإنا إليه راجعون۔ اس کتے نے ہمیں رسوا کر دیا۔

جانباز: (بلند آواز سے) بزدلو تمھارا ناس ہو، تم مقابلے کی دعوت دے کر بھاگ جاتے ہو؟

ثمامہ: امیر لشکر مجھے مقابلے کے لئے جانے دیجئے۔

روح بن حاتم: ذرا ٹھہرو ہم دیکھیں تو سہی کہ ابودلامۃ کے دل میں کیا خیال آیا ہے۔

دیکھو وہ ہماری طرف ہی آ رہا ہے۔(ابودلامۃ خالد کے ہمراہ خیمے میں داخل ہوتا ہے)

روح بن حاتم: تجھ پر اللہ کی پھٹکار، تو نے ہمیں رسوا کر دیا بخدا میں تجھے مقابلے پر اتار کر چھوڑوں گا۔

ابودلامہ: اللہ آپ کو ہدایت کرے ذرا میری بات تو سن لیں۔

روح بن حاتم: سوائے رسوائی اور بدنامی کے اور کیا سنیں؟

جانباز: (بلند آواز سے) اے عراقی بزدلو کیا تمھارا جنگ باز واپس نہیں آنا چاہتا۔

ابودلامۃ: (خیمے سے سر نکال کر) میں ابھی تیری طرف آ رہا ہوں۔ اگر تو مرد میدان ہے تو میرے آنے تک یہیں کھڑا رہ۔

(روح کی طرف متوجہ ہوکر) میرے مدمقابل کو جانتے ہو؟ یہ وہی سورما ہے جسے دیکھ کر کل بڑے بڑے جرنیلوں کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔

روح بن حاتم: تجھ پر افسوس، اس کو دیکھ کر تیری بھی باد شکم خارج ہوگئی ہے۔

ابودلامۃ: بخدا! ایسا ہرگز نہیں، میں تو اسے دیکھ کر خوش ہوا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ میرا بہترین حریف ثابت ہوگا، لیکن مجھے خطرہ ہے کہ وہ مجھے قتل کر دے گا اور یہ دن میری دنیوی زندگی کا آخری اور اخروی زندگی کا پہلا ثابت ہوگا اور بخدا فی الحال میرا ہر ہر عضو بدن، بھوک سے نڈھال ہو رہا ہے اور مجھے جنت میں داخل ہونے اور وہاں کھانا ملنے کی بھی کوئی امید نہیں، کیونکہ آپ مجھے اپنے جیسے کلمہ گو بھائی سے لڑنے کے لئے بھیج رہے ہیں جبکہ میری اس کے ساتھ کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے کھانا دیجئے جسے کھا کر میں دشمن کے مقابلے میں نکلوں گا۔

روح بن حاتم: اللہ تیرا ناس کرے تو اپنے مد مقابل کو میدان میں چھوڑ کر ہمارے ہاں پیٹ بھرنے آ گیا ہے؟

ابودلامۃ: جناب امیر، میں اپنے حریف کا سامنا کرنے میں دیر نہیں کروں گا بلکہ اپنا کھانا راستے میں کھاتا جاؤں گا۔

ثمامہ: جناب مجھے اجازت دیجئے میں اس کے مقابلے میں نکلتا ہوں۔

ابودلامہ: تجھ پر افسوس وہ تو میرا حریف ہے تو اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا، کل اس نے تجھ سے بہادر سپاہی کو قتل کر دیا تھا۔

ثمامہ: خاموش رہ تیرا ناس ہو۔

روح بن حاتم: اسے اس کی چاہت کے مطابق کھانا دو۔

ابودلامہ: کیا یہ بہتر نہیں کہ میں کھانا خود ہی نکال لوں تاکہ دیر نہ ہو۔

روح بن حاتم: چل خود ہی نکال لے اور جلدی کر۔

ابودلامہ: (خیمے کے ایک کونے میں پڑی دیگ پر اوندھا ہو کر دو عدد روسٹ مرغیاں نکال کر دو روٹیوں میں لپیٹ لیتا ہے اور انھیں چادر کے ایک پلو میں باندھ کر مقابلہ کرنے کے لئے دروازے کی طرف چل پڑتا ہے)

روح بن حاتم: خالد، اس کے پیچھے رہنا (خالد نکل جاتا ہے)

جانباز: بغداد کے سپوتو تم پر تُف ہے، تمھارا بھگوڑا سورما کہاں گم ہو گیا ہے؟ وہ خوف سے کہیں مر تو نہیں گیا؟ اگر تم اس کی جگہ کسی اور کو سامنے نہیں لاتے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔

ابودلامہ: (زور سے پکارتے ہوئے) ٹھہرا رہ، میں ابھی تیری طرف آیا چاہتا ہوں۔

(پردہ گرتا ہے تاکہ دوسرا منظر میدان جنگ پیش کیا جا سکے)

ابودلامہ:

میں وہ مرد ہوں کہ میری ماں نے میرا نام رکھا ہے زند
دیکھی نہ ہو کسی تلوار نے جو ڈھال، سو وہ میری ڈھال ہے
سونت کے شمشیر آبدار جب ہوتا ہوں میں اسپ تازی پہ سوار
میں تنہا ہی بھگا دیتا ہوں اس لشکر کو، جو کالڑ مال ہے

جانباز: (بائیں جانب سے) ڈینگیں مارنا بند کر دے اور اسی طرح آگے بڑھتا رہ، میری صورت میں تجھے ایسا ملک الموت ملے گا جو تجھے عالم آخرت میں پہنچا دے گا۔

ابودلامہ: (مزید فخریہ رجز پڑھتے ہوئے)

تو کیا حال ہوگا اس کا جو تنہا میرے مقابلے میں آئے گا
اللہ کی قسم وہ کٹھن مصیبت میں پھنس جائے گا
طول و عرض میں کتنا اسے پسند ہو، تو کٹ جائے گا
وہ موت سے بچنے کا کوئی راستہ نہ پائے گا

جانباز: (بلند آواز سے) اگر تو مجھ پر قابو پالے تو مجھے جس طریقے سے چاہے اپنی تلوار سے مار دے مجھے اس بات کی کچھ پروانہیں۔ بتا تو مجھ پر وار کرنا چاہتا ہے یا کہ میں تجھ پر وار کروں؟

ابودلامہ: (بلند آواز سے) کیا تو پہلے میری طرح رجزیہ اشعار پڑھنا پسند نہیں کرتا؟

جانباز: میں ابھی تجھے بتا چکا ہوں کہ میری تلوار ہی تجھے رجز پڑھ کر سنائے گی۔

ابودلامہ: (تلوار کے خوف سے پادتے ہوئے) کیا تو گھوڑے سے اتر نہیں سکتا تا کہ ہم دونوں پیدل ہو کر برسر پیکار ہوں؟

جانباز: تجھ پر افسوس، کیا تو گھوڑے پر سوار ہو کر جنگ نہیں لڑسکتا؟

ابودلامہ: (بلند آواز سے) ہاں لڑسکتا ہوں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہم میں سے کسی کو میدان جنگ سے فرار ہونے کا موقع نہ ملے، اگر تو دلیر ہے اور میرے سامنے سے بھاگنے کی نیت نہیں رکھتا تو اپنے گھوڑے سے اتر، اور اسے چھوڑ دے تا کہ وہ واپس اپنی چھاؤنی میں چلا جائے اور میں بھی اپنے گھوڑے سے اتر پڑتا ہوں اور اسے اپنی چھاؤنی کی طرف بھیج دیتا ہوں کیا خیال ہے؟

جانباز: (بلند آواز سے) مجھے منظور ہے۔

(دونوں کے گھوڑے ہنہناتے ہوئے واپس چلے جاتے ہیں اور دائیں طرف سے ابودلامہ اپنی تلوار سے کھیلتا ہوا سست رفتار سے چلا آرہا ہے اور بائیں طرف سے خارجی جانباز اسی انداز سے آرہا ہے اور دونوں تھوڑے سے فاصلے پر کھڑے ہو جاتے ہیں

خارجی جانباز: کیا تو نے پہل کرنی ہے یا میں پہل کروں؟

ابودلامہ: اگر تو چاہے تو میں پہل کرتا ہوں۔

جانباز: چلو تم ہی پہل کرلو!

ابودلامہ: اے میرے حریف تجھے قتل کر دینا مجھ پر کچھ مشکل نہیں، لیکن میں تجھ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں کیا تو اپنا کان میری طرف کر کے بات سنے گا؟

خارجی جانباز: (شک اور احتیاط کے ساتھ) تو کیا کہنا چاہتا ہے؟

ابودلامہ: میں وہ انسان ہوں جو غصے کے بغیر لڑ نہیں سکتا، لہٰذا مجھے کچھ پوچھنے کا موقعہ دے۔ شاید کہ تو میرے اور اپنے درمیان کسی پرانی دشمنی کا انکشاف کردے، جسے یاد کر کے میں غضب ناک ہو جاؤں اور تجھ سے لڑوں؟

خارجی جانباز: تیرا ناس ہو، میں تیرا مقصد سمجھ نہیں پا رہا۔

ابودلامہ: مجھے بتا کیا تو اپنے دشمنوں میں کسی زند بن جون نامی شخص کو جانتا ہے؟ (زند بن جون، ابودلامہ کا اصل نام ہے)

خارجی جانباز: بخدا میں نے تو یہ نام ہی اب سنا ہے۔

ابودلامہ: افسوس صد افسوس، یہ تو میرا نام ہے۔ تیرا نام کیا ہے؟

خارجی جانباز: لیث بن اسامۃ

ابودلامہ: لیث بن اسامۃ۔ میرے دشمنوں میں اس نام کا کوئی آدمی بھی نہیں ہے۔ خیر مجھے یہ بتا کہ تو کون سے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے؟ شاید مجھے اپنی اور تیری قوم کے درمیان کوئی پرانا بیر یا دشمنی یاد آ جائے۔

خارجی جانباز: بنو تمیم سے۔

ابودلامہ: (لمبا اور ٹھنڈا سانس بھر کر) ہائے افسوس!

خارجی جانباز: تیرا ناس ہو، تو کس بات پر افسوس کر رہا ہے؟

ابودلامہ: اس بات پر کر رہا ہوں کہ میں تیری قوم کے حلیفوں میں سے ہوں اور حلیف اپنے حلیف سے کس طرح لڑ سکتا ہے؟ لیکن مجھے یہ بتا کہ تیرا دین کون سا ہے؟

خارجی جانباز: میرا دین اسلام ہے، تیرا ناس ہو۔

ابودلامہ: اگر تو سچا ہے تو کہہ "أشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله"

خارجی جانباز: تیرا ناس ہو، کیا میں تجھے مسلمان نظر نہیں آ رہا؟

ابودلامہ: جب تک میں اپنے کانوں سے شہادتین کا اقرار نہ سن لوں تو میں تیرے مسلمان ہونے کی تصدیق کیسے کر سکتا ہوں، ذرا شہادتین کی گواہی تو دے

تاکہ میں مسلمان ہونے کا یقین حاصل کرلوں۔

خارجی جانباز: أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمداً رسول الله

ابودلامہ: (لمبا اور ٹھنڈا سانس بھرتے اور رنج و اَلم کا اظہار کرتے ہوئے) وائے ہماری خرابی۔ ہم ایک ہی دین سے تعلق رکھتے ہیں اور مجھے حضرت رسول مقبول ﷺ کی حدیث پہنچی ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ جب دو مسلمان تلوار لے کر آمنے سامنے آ جائیں تو قاتل اور مقتول دونوں آگ میں جائیں گے۔ کیا تو میرے ساتھ نیکی کرسکتا ہے کہ مجھے اس حیرت سے نکال لے جس میں، میں ڈوب گیا ہوں۔

خارجی جانباز: تو کیا چاہتا ہے؟

ابودلامہ: کیا تو میرے سامنے دین اسلام کو بُرا کہہ سکتا ہے۔

خارجی جانباز: اللہ تیرا بُرا کرے۔ کیا کہہ رہا ہے؟

ابودلامہ: یار، معمولی سا بُرا کہہ دے اسلام کو؟

خارجی جانباز: تیرا ناس ہو، میں اپنے دین کو کس طرح بُرا کہہ سکتا ہوں؟

ابودلامہ: وائے افسوس، میرے غضب ناک ہونے کی کوئی صورت نہیں بن رہی، کیونکہ میرا اور تیرا دین بھی ایک ہے اور میری اور تیری قوم بھی آپس میں حلیف ہے اور میرے اور تیرے درمیان عداوت بھی نہیں ہے، میں سمجھ نہیں پارہا کہ میں تجھ سے کس بنا پر لڑوں؟

خارجی جانباز: تیرا ناس ہو، اگر یہی بات ہے تو پھر میرے مقابلے پر کیوں نکلا ہے؟

ابودلامہ: میں نے سمجھا تھا کہ شاید میرے اور تیرے درمیان لڑائی کا کوئی سبب نکل آئے، لیکن میرا گمان غلط ثابت ہوا۔ خیر، کیا ہمارے اور تمھارے حق میں اس

لڑائی سے بہتر اور افضل پروگرام نہیں بن سکتا؟

خارجی جانباز: وہ کیا ہے، تیرا ناس ہو!

ابودلامہ: وہ یہ کہ ہم تم دوست بن جائیں، کیونکہ مجھے تیرے چہرے سے دلیری اور شرافت نظر آ رہی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان دوستی اور مودّت ہو جائے۔

خارجی جانباز: بخدا یہ کوئی بُری بات نہیں ہے۔

ابودلامہ: (تلوار میان میں داخل کر کے جانب پشت لٹکاتے ہوئے) اے ناروا خون بہانے اور روحوں کو تڑپانے والی تلوار، دفع ہو جا! تو رشتے ناتے توڑنے والی اور بغیر حق کے بھی جانوں کو ختم کرنے والی ہے۔

خارجی جانباز: (تلوار میان میں داخل کرتے ہوئے) تو بھی اپنی پیشکش میں سچا معلوم ہوتا ہے۔

ابودلامہ: (اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے) افسوس تجھ پر، میں تیری دوستی کا خواہش مند ہو کر تجھے کس طرح فریب دے سکتا ہوں، ہاتھ بڑھا اور مصافحہ کر (دونوں مصافحہ کرتے ہیں)

ابودلامہ: میں اپنے ساتھ مزے دار کھانا بھی لایا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتے تاکہ ہماری دوستی اور اخوت کی رسی مضبوط ہو جائے، آؤ ہم نورا کشتی لڑتے ہوئے میدان سے پہاڑ کی اوٹ طرف چلے جائیں اور آرام سے بیٹھ کر کھانا کھائیں، ہم نے عراق اور خراسان کی باہمی جنگ سے کیا لینا ہے۔

خارجی جانباز: ٹھیک ہے میں تجھ سے اتفاق کرتا ہوں۔

(دونوں مدمقابل میدان جنگ میں نورا کشتی کرتے ہوئے پہاڑ کی اوٹ میں چلے

جاتے ہیں اور ابودلامہ چادر کے کونے سے کھانا کھول کر سامنے رکھ دیتا ہے اور مدمقابل کو کھانے کی دعوت دیتا ہے)

خارجی جانباز: میرے جگر، یہ کیا ہے؟

ابودلامہ: دو عدد روغنی اور موٹی تازی روٹیاں اور دو روسٹ کی ہوئی مرغیاں جنہیں کھائیں گے دو گہرے دوست۔ کیا یہ عراق اور خراسان کی لڑائی لڑنے سے بہتر نہیں ہے؟

خارجی جانباز: ہاں ہاں میرے جگری یار! (دونوں کھانا تناول کرنے لگتے ہیں، اسی دوران ابودلامہ گویا ہوتا ہے)

ابودلامہ: سن میرے دوست جنگ جیتنے کی صورت میں نہ تو خراسان والے تجھے تخت پر بٹھائیں گے اور نہ عراق والے مجھے تخت پر بٹھائیں گے اس لئے ہمیں مفت میں جانیں ضائع کرنے کا کوئی فائدہ؟

جانباز: میں تجھ سے اتفاق کرتا ہوں۔

ابودلامہ: اگر تو مناسب سمجھے تو تجھے میں سرکاری فوج کے امیر سے امان کا پروانہ اور مناسب عہدہ دلوا سکتا ہوں۔

جانباز: تیری پیش کش کی کیا ضمانت؟

ابودلامہ: اگر میں ایسا نہ کرسکا تو میری بیوی کو طلاق مغلظہ

جانباز: میں تجھ سے اتفاق کرتا ہوں (ابودلامہ اسے بٹھا کر امیر لشکر روح بن حاتم کے پاس چلا جاتا ہے اور کہتا ہے)

ابودلامہ: امیر لشکر تم نے تو مجھے آج مروا ہی ڈالا تھا، لیکن زندگی کے سانس باقی تھے اس لئے میں بغیر لڑے ہی فتح یاب ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں اور

حریف کو دشمنوں سے پھوڑ کر لے آیا ہوں۔

روح بن حاتم: اور شاطر اور چرب زبان، تو نے مد مقابل کو کس طرح رام کر لیا۔

ابودلامہ: یہ کہانی تو میں بعد میں بتاؤں گا پہلے میری بیوی کو طلاق سے بچائیے، کیونکہ میں اس شرط پر اس سے امان کے پروانے اور مناسب عہدے کا وعدہ کر آیا ہوں۔ اگر یہ وعدہ پورا نہ ہوا تو بیچاری مسکینہ کو طلاق ہو جائے گی۔

روح بن حاتم: ہم تیری اس فتح پر اس مسکینہ کو طلاق سے بچاتے ہیں اور تیرے کئے ہوئے قراروں کو پورا کرتے ہیں۔

......☆......

قابلِ رشک لمحہ مسرت

امیر المومنین عبدالملک بن مروان قریشی اموی نے شعراء وادبا کے اعزاز میں پر تکلف ظہرانے کا اہتمام کیا اور اس میں سرد وشیریں مشروبات، لذیذ ترین ماکولات اور رس بھرے تازہ ثمرات اتنی وافر مقدار میں مہیا کیے کہ دربار خلافت کے مہمانوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان مہمانوں میں علماء بھی تھے اور امرا بھی، شعراء بھی تھے اور ادبا بھی، مہذب شہری بھی تھے اور گنوار دیہاتی بھی۔ جب انہوں نے جی بھر کر من پسند مشروبات نوش جان کر لیے اور مرغوب کھانے تناول کر لیے تو ادھر ادھر کی باتوں سے دل بہلانے لگے۔ کچھ مہمان تو خوش ذائقہ مشروبات کی تعریف میں مصروف تھے اور کچھ مہمان رس بھرے تازہ پھلوں کی توصیف میں رطب اللسان تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ ہم نے اتنا وافر کھانا کسی کی دعوت میں نہ دیکھا ہوگا اور کوئی کہہ رہا تھا کہ ہم نے اتنا مزیدار کھانا کسی کی دعوت میں کھایا نہ ہوگا۔ اس مجلس میں ایک گنوار اعرابی بھی موجود تھا اس سے نہ رہا گیا اور وہ بول پڑا:

لوگو! جہاں تک کھانے کی مقدار کا تعلق ہے اس بارے میں بھی میں تم سے متفق ہوں کہ واقعی ہم نے اتنا وافر کھانا کسی دعوت میں نہیں دیکھا، لیکن جہاں تک اس کھانے کے سب سے زیادہ لذیذ اور مزیدار ہونے کی بات کرتے ہو تو میں تم سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کی یہ بات سن کر تمام شرکائے محفل کھل کھلا کر ہنس دیئے اور

اس کا مذاق اڑانے لگے، لیکن امیر المومنین ہنسے نہ مسکرائے، بلکہ سنجیدگی سے اعرابی کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ تو نے یہ بات کس بنا پر کی؟

اس نے کہا: اے امیر المومنین! بات یہ ہے کہ آپ کا کھانا واقعی وافر مقدار میں تھا، لیکن اتنا مزیدار نہیں تھا، جتنا مزیدا کھانا میں خود کھا چکا ہوں۔ امیر المومنین نے کہا: ہم تیرے دعوے کو اس وقت تک تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں جب تک تو اپنے دعوے کو پوری وضاحت سے بیان نہ کرے۔ اس نے کہا:

اے امیر المومنین! ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میں کسی دور میں وادی حجر کی آخری سرحد پر واقع ہجر نامی بستی میں رہائش پذیر تھا، جہاں میرا باپ فوت ہو گیا اور ورثے میں بھاری قرض اور بہت سی مشکلات چھوڑ گیا جن سے نبرد آزما ہونے کی ذمہ داری میرے کمزور کندھوں پر آن پڑی۔ اس علاقے میں ہمارا ایک نخلستان بھی تھا اور اس میں کھجور کا ایک ایسا پیڑ تھا جس کی نظیر ملنی محال ہے، اس کی کھجوریں نو مولود شتر بچے کے گوشت کی طرح نرم اور اس قدر شیریں تھیں، گویا وہ عسل مصفی کی بیضوی شکل کی ڈلیاں ہوں اور ان کی گٹھلیاں اس قدر باریک گویا وہ جو کے دانے ہوں۔

اس پیڑ کی ان خوبیوں کی وجہ سے ایک جنگلی زیبری روزانہ رات کے پچھلے پہر اس کے نیچے آجاتی اور اپنے اگلے پاؤں اٹھا کر پچھلے پاؤں پر کھڑی ہو جاتی اور پیڑ کے سر کی جانب سے نیچے لٹکی ہوئی کھجوریں کھا لیتی اور تھوڑی دیر اس کے نیچے آرام کر کے طلوع سحر سے قبل ہی چلی جاتی۔

امیر المومنین! سچی بات یہ ہے کہ اس کا روزانہ اس طرح فصل اُجاڑنا مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس لیے ایک رات میں نے اپنا تیر کمان لیا اور اسے شکار کرنے نکل کھڑا ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ رات کے اگلے پہر آتی ہو گی اور میں فوراً ہی اسے شکار کر کے واپس آجاؤں گا۔ لیکن میرا گمان غلط ثابت ہوا اور مجھے رات کے دس

گھنٹے اس کی تاک میں رہنا پڑا۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس نے مجھے تاک لیا ہو اور عمداً لیٹ گئی ہو۔ خیر جب رات کا پچھلا پہر ہوا تو وہ آئی اپنے اگلے پاؤں اٹھا کر لٹکی ہوئی کھجوریں کھانے لگی میں نے اسے فوراً نشانے پر لے لیا اور تیر مار کر اسے خاک وخون میں تڑپا دیا ۔پھر میں نے اسے ذبح کر کے اس کی ناف والے حصے کا گوشت نکال لیا بعد از اں میں نے آتش دان میں لکڑی کے موٹے موٹے ڈچوں کو دہکایا جب وہ سرخ انگارے بن گئے تو ان کے اندر گوشت رکھ دیا اور اسے اوپر سے ڈھانک کر نیند پوری کرنے کے لیے سوگیا۔ جب پہر چڑھے میں بیدار ہوا تو اتنے عرصے میں گوشت پک چکا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے اردگرد سے راکھ صاف کی اور اس کے اندر تر و تازہ نیم پختہ کھجوروں کا توڑا الٹا دیا جب مجھے اس آتش دان سے عامر اور غطفان کے لہجوں کی مانند سنسناھٹ سنائی دی تو میں نے کھجوروں کو گوشت کی بوٹیوں میں ڈال کر کھانا شروع کر دیا یہاں تک کہ میں سیر ہو گیا۔ اے امیر المومنین! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اس جیسا لذیذ کھانا آج تک نہیں کھایا۔

اعرابی کی بات درست تھی، کیونکہ وہ بڑا صحت مند اور بھوکا تھا اور صحت اور بھوک ہی دراصل کھانے کو پر لطف اور مزے دار بناتی ہے۔ اگر انسان بیمار ہو یا پہلے سے ہی شکم سیر ہو تو اسے دنیا کا کوئی کھانا اچھا نہیں لگتا، اگرچہ وہ کتنا ہی مزیدار ہو۔ موسم گرما کے تندرست روزے دار کو افطار کے وقت سادہ ٹھنڈا پانی کس قدر پیارا اور خوش گوار لگتا ہے اور روٹی کا خشک ٹکڑا کس قدر لذیز لگتا ہے! شاید اس کے مقابلے میں دنیا بھر کے شکم سیروں اور بیماروں کو کبھی اتنی خوشی نصیب نہ ہوئی ہو، اگرچہ وہ کتنے ہی مزیدار کھانے کیوں نہ کھالیں اور پھر آدمی بیمار کو تو ویسے ہی روغنی پراٹھا بے ذائقہ اور جام شیریں، زہر محسوس ہوتا ہے۔ اس بنا پر امیر المومنین نے اعرابی کی بات

سے اتفاق کیا اور کہا: واقع تو نے لذیذ ترین کھانا کھایا بعدازاں اس نے اعرابی سے پوچھا ''ذرا یہ تو بتا کون ہے؟''

اعرابی: اے امیر المومنین ! میں وہ انسان ہوں جس کی ایک طرف بنوتمیم اور بنو اسد کا عنعنہ ہے اور دوسری طرف بنو ربیعہ کا کسکسہ اور یمنیوں کی غرابت ہے۔

امیر المومنین: اچھا، اگر تو ان میں سے ہے تو ان کے کون سے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔؟

اعرابی: جی میں آپ کے ننھیالی خاندان بنوعذرہ سے تعلق رکھتا ہوں۔

امیر المومنین: وہ از تو بڑا فصیح اللسان خاندان ہے، بھلا تجھے بھی شعر وادب سے شغف ہے؟

اعرابی: امیر المومنین آپ کچھ پوچھ کر ہی اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں؟

امیر المومنین: بتاؤ، عربوں میں سب سے مدحیہ شعر کس نے کہا ہے؟

اعرابی: جریر بن عطیہ نے اور وہ یہ ہے:

اَلَسْتُمْ خَیْرَ مَنْ رَکِبَ الْمَطَایَا؟

وَاَنْدیٰ اُلْعَالَمِیْنَ بُطُوْنَ رَاحٍ ؟

''کیا تم سواریوں پر سوار ہونے والوں میں سے افضل و اعلیٰ سوار نہیں ہو اور کیا تم کشادہ ہاتھ والے سخیوں میں سے فیاض ترین سردار نہیں ہو؟''

دربار خلافت کی اس مجلس عام میں اس شعر کا شاعر جریر بن عطیہ بھی موجود تھا، وہ یکدم سنجیدہ ہو کر بیٹھ گیا اور سر اونچا کر کے شرکائے مجلس پر نظریں گھمانے لگا تا کہ ان کے تاثرات کا جائزہ لے سکے۔ امیر المومنین نے اعرابی سے دوسرا سوال کیا: کہ اب بتاؤ عربوں میں سب سے زیادہ فخریہ شعر کس نے کہا؟

اعرابی: جریر بن عطیہ نے اور وہ یہ ہے:

إِذَا غَضِبَتْ عَلَيْکَ بَنُوْ تَمِيْمٍ
حَسِبْتَ النَّاسَ كُلُّهُمْ غِضَاباً

”جب تجھ پر بنو تمیم غضبناک ہو جاتے ہیں تو تو سب لوگوں کو اپنے غضبناک سمجھنے لگتا ہے۔ یہ سن کر اس شعر کے شاعر جریر کے دل میں مسرت کی لہریں موجزن ہوگئیں اور وہ بے خود ہو کر جھومنے لگا۔“

امیر المومنین: اچھا بتاؤ عربوں میں سے سب بڑھ کر ہجو یہ شعر کس نے کہا ہے؟

اعرابی: جریر بن عطیہ نے، اور وہ یہ ہے:

غُضِّ الطَّرْفَ اِنَّکَ مِنْ نُمَيْرٍ
فَلَا كَعْبًا بَلَغْتَ وَلَا كِلَاباً

”آنکھیں پست کر لے کیونکہ تو نمیر قبیلے سے ہے۔ نہ تو، تو کعب کے مقام کو پا سکتا ہے اور نہ کلاب کے مرتبے تک پہنچ سکتا ہے“

یہ سن کر جریر کا دل اس کے سینے میں رقص کرنے لگا اور وہ بے تابانہ اٹھ کھڑا ہوا تا کہ انسانوں سے بھرا ہوا دربار اسے دیکھ سکے۔ یقین جانئے کہ جریر کو اس موقع پر جو مسرت حاصل ہو رہی تھی، اس کے مقابلے میں شاہوں کے شاہی پروٹوکول لذت ہیچ تھی اور پھر پر لطف کھانوں کی لذت اور مسرت کا تو ذکر ہی کیا۔

امیر المومنین نے اعرابی سے پوچھا کہ اب بتاؤ تشبیہ کے اعتبار سے سب اچھا شعر کس کا ہے؟

اعرابی: جریر بن عطیہ کا، اور وہ یہ ہے:

سَرٰی نَحْوَ هُمْ لَیْلٌ کَاَنَّ نُجُوْمَه
قَنَادِیْلٌ فِیْهِنَّ الذَّبَّالُ الْمُفتَلِ

''اور ان کی طرف رات کی تاریکی جیسا لشکر جہاد چل پڑا اور اس کے ستاروں جیسے نیزے گویا مضبوط بٹی ہوئی بتیوں والی قندیلیں ہیں۔''

یہ سن کر جریر بول پڑا کہ امیر المومنین میرا آج کا انعام اس عذری اعرابی کو دے دیا جائے۔ امیر المومنین نے فرمایا: نہیں اے جریر! اسے آپ کے انعام جتنا انعام سرکاری خزانے سے ملے گا اور ہم آپ کے انعام کو بھی کم نہیں کریں گے۔ چنانچہ اعرابی اس دربار سے اس حال میں نکلا کہ اس کے دائیں ہاتھ میں آٹھ ہزار درہم اور بائیں ہاتھ میں نفیس کپڑوں کا گٹھا تھا۔ یہ تو خیر جریر کے سامنے کی بات تھی جس سے اس کے اشعر الشعراء ہونے کا ثبوت مل رہا تھا لیکن صدیوں بعد والے عرب نقاد بھی یہ بات ماننے پر مجبور ہو گئے کہ جریر سے بڑھ کر غزلیہ شعر بھی کسی نے نہ کہا ہوگا، اور وہ یہ ہے:

اِنَّ الْعُیُوْنَ الَّتِیْ فِیْ طَرْفِهَا حَوَرٌ
قَتَلْنَنَاثُمَّ لَمْ یُحْیِیْنَ قَتْلَانَا
یَصْرِعْنَ ذَاللُّبِّ حَتّٰی لَاحِرَاکَ بِهِ
وَهُنَّ اَضْعَفُ خَلْقِ اللّٰهِ اِنْسَانَاً

''بیشک وہ آنکھیں جن کے دونوں اطراف میں شفاف اولوں جیسی سفیدی ہے وہ ہمیں قتل کر ڈالتی ہیں اور پھر ہمیں زندہ بھی نہیں کرتیں۔ وہ عقل مند کو اس طرح زیر کرتی ہیں کہ وہ بے حس و حرکت پڑا رہتا ہے، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی سب سے نازک مخلوق ہیں۔''

کتاب پر ایک نظر

ممتاز ادیب جناب محمد صدیق ثاقب صاحب لکھتے ہیں:

ابو مسعود عبدالجبار صاحب نے اس کتاب میں اسلامی تاریخ کے چند خوبصورت واقعات کو خداداد صلاحیت سے اردو کی سہل اور پرکار عبارتوں کا نگارستان بنا دیا ہے۔ ان کا یہ مجموعۂ واقعات محض الفاظ کا نگارستان ہی نہیں بلکہ مغموم دلوں کو فرحت و سرور بخشنے والا نورستان بھی ہے۔

فاضل مؤلف نے عمدہ تراکیب، بلیغ تشبیہات اور خوبصورت استعاروں کے ذریعے ان واقعات کو حقیقی انشاء پردازی کے جواہر سے جگمگا دیا ہے۔ زبان کی قدرت یہ ہے کہ ہر حالت اور موقعہ کے لیے نہایت متانت کے ساتھ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ وہ الفاظ کے ایسے پارکھ ہیں کہ حفظ مراتب کا پاس کرتے ہوئے منظر اور مکالمہ کے درمیان ایسی زبان استعمال کرتے ہیں کہ کہیں حشو و زائد یا تکلف اور آورد نظر نہیں آتے۔

باتیں ایسی دل کو لگتی ہیں، جی چاہتا ہے کہ آدمی سنے تو سنتا چلا جائے اور پڑھے تو پڑھتا چلا جائے۔ سادگی ایسی کہ بے کیف نہیں، روانیِ بیان ایسی کہ ذرا عجلت نہیں، تاثیر ایسی کہ مفرح اور محاکات ایسے کہ جان فزا۔ قصوں کا انداز اس قدر دلنشین ہے کہ ''سبحان اللہ'' کہنے کو جی چاہتا ہے۔ مصنف ایک استاد ہیں، ابلاغ کے فن پر بولنے کی حد تک تو ان کی گرفت کے ہم مداح تھے لیکن ان کی نگارش نے ثابت کر دیا کہ

"Style in the man himself"

ان قصوں کو پڑھ کر فیض کا یہ شعر بے اختیار یاد آ جاتا ہے:

جیسے صحرا میں چلے ہولے سے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

ایم ایس ثاقب

الھادی
للنشر والتوزیع
۳۸۔ غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور
Phone: 0423 7361473, 0300-6609226